گُلّی کملی کے دیس میں

کچھ ایسے بے بہا لمحے ابد جن کا ٹھکانہ ہو

کچھ ایسی ہستیاں جن کے تصرف میں زمانہ ہو

(طاہر شیرازی)

گُلّیِ کملی کے دیس میں

غلام عباس سیال

اُفق پبلی کیشنز

دفتر ماہنامہ ''اکناف''، چھوٹا بازار ڈیرہ اسماعیل خان

ہمارا معیار ادب

اور صرف ادب

تزئین واہتمام اشاعت

کاشف رحمٰن کاشف

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

کتاب	:	گلی کملی کے دیس میں
مصنف	:	غلام عباس سیال
		abbas.sial@hotmail.com
سرورق پینٹنگ	:	عجب خان
گرافکس	:	شاہد رضا
اشاعت	:	جون 2012ء
قیمت	:	300 روپے
مطبع	:	بی ٹی ایچ پرنٹرز لاہور
پبلشر	:	ق پبلی کیشنز ڈیرہ اسماعیل خان
		0333-9965535

چوگلے کے نیچے سے گزرنے والے

ہرڈیرے وال

کے نام!

کوچہ کوچہ قہوہ خانے میکدے شیراز کے
افتخارِ اصفہاں ہے ڈیرہ اسماعیل خاں
مرد و زَن کے زینتِ دست و گلو پھولوں کے ہار
ایک شہرِ گل فشاں ہے ڈیرہ اسماعیل خاں
رنگ و نغمہ دھاونی کے رنگ میں دیکھے کوئی
گویا شہرِ عاشقاں ہے ڈیرہ اسماعیل خاں

(نصرت زیدی)

احوال

1	گلی کملی کے دیس میں	(خورشید ربانی)	9
2	یادوں کے کھرنڈ	(عباس سیال)	12
3	جانے کہاں گئے وہ دن		17
4	طاہر شیرازی کی بیٹھک		41
5	ڈیرے کی گرمیاں اور ڈولتی پتنگیں		49
6	اُف ڈیرے کی سردی		56
7	ڈیرہ کی برسات		61
8	ڈیرہ کے بھائی لوگ		65
9	اختر طوفان سے چاچے ریڈو تک		70
10	گلی کملی کے دیس میں		78
11	ماسی سرداراں		88
12	گولے آلا گولا وَجا		92
13	میں تھال مہندی دا چئی کھڑی ھاں		98
14	ثوبت		111
15	ڈاکٹر بگو اور اس کے مریض		116
16	پانی کا ڈبہ		120
17	ڈیرہ میں آنے والے عفریت کا قصہ		125

18	چھوڑ آئے ہم وہ گلیاں		129
19	آ پڑا آپ اُسار ہندیرا		145
20	نواب اللہ نواز خان سدوزئی		157
21	ناصر خان تاریخ کا روشن باب		168
22	وَل کول وِسری اجرک پا		172
23	اسیکوں اسلم نال ملاڈیوو		177
24	لوہے دا دروازہ، کھیری دی دکان		186
25	رنگوں سے کھیلنے والا عجب آرٹسٹ		192
26	سئیں ظہور دمانی		197
27	یہ داغ داغ اجالا		201
28	دھرتی کا لعل، عقیل چکڑیال		205
29	تسلیم فیروز، ایک عہد ساز شخصیت		210
30	ہماری وسیب کا فنکار		214
31	ایک شام سمیع اللہ کے نام		223
32	مونجھا نہ تھی اور کملا		227
33	ھِک بندہ سونہڑے دل والا		232
34	آخری صفحہ	(راشد کنڈی)	238
35	کتابیات		239

گُلی کملی کے دیس میں

کوئی بھی ادیب یا فنکار جمال پسندی کی صفت سے خالی نہیں ہوتا، اس کے ذوق کی رہنمائی کوئی منافع، سود و زیاں یا لالچ نہیں کرتا بلکہ جس طرح گلشن پرست زمین کا کوئی گوشہ بنجر نہیں دیکھ سکتا اسی طرح فنکار بھی معاشرے کو مہکتا چمن زار دیکھنا چاہتا ہے، اسے جہاں جہاں برائی، خرابی اور تکلیف دہ چیز نظر آتی ہے اس کے خاتمے کے لئے کوشاں رہتا ہے۔ ادیب اور فنکار امن، انصاف اور خیر کا پیام بر ہوتا ہے، وہ نفرتیں ختم کرنے اور محبتیں بانٹنے پر یقین رکھتا ہے۔ ادب وہ فنِ دل پذیر ہے جو زندگی اور کائنات کے مظاہر سے نمو پاتا ہے، ادب اپنے عہد کا ترجمان بھی ہوتا ہے اور اس کا ناقد بھی۔ دنیا میں رائج تمام اہم زبانوں کے ادب نے مختلف اصناف میں ظہور کیا ہے۔ اردو ادب کی تاریخ بھی اس حوالے سے خوش نصیب ثابت ہوئی کہ اسے نامور شعراء بھی ملے اور نثر نگار بھی، غالب، میر، سودا، آتش، حسرت، اقبال، فانی، فراق، فیض، مجید امجد اور احمد فراز سمیت کئی نامور لوگوں نے اردو شاعری کو ثروت مند کیا ہے تو منٹو، بیدی، پریم چند، غلام عباس، احمد ندیم قاسمی، امرتا پریتم، قدرت اللہ شہاب، ممتاز مفتی، اشفاق احمد، بانو قدسیہ، مختار مسعود، مستنصر حسین تارڑ، انتظار حسین اور دیگر متعدد نثر نگاروں نے جاندار اسلوب اور تخلیقی کمال سے ایک عالم کو اپنا گرویدہ بنالیا ہے۔ ڈیرہ اسماعیل خان سے بھی محمد سعید، خدا بخش نازش، سعید احمد اختر، عبداللہ یزدانی، ڈاکٹر طالب حسین اشرف، غلام محمد قاصر، بہرام ساحل، نذیر اشک، جمشید نایاب، خاور احمد، طارق احد نواز، طارق ہاشمی، سعید اختر سیال، عجب خان، طاہر شیرازی، شہاب صفدر، ابرار عقیل، حمزہ حسن شیخ، منیر احمد فردوس، کاشف رحمٰن کاشف اور دیگر کئی خوش کلام ایسے اٹھے ہیں جنہوں نے اردو ادب کی آبیاری میں قابل قدر کام کیا ہے۔ سفر نامہ حجاز پر مبنی ''خوشبو کا سفر'' کے ذریعے ادبی محفلوں میں وارد ہونے کے بعد اپنے اخباری کالموں کے ذریعے قارئین کی توجہ حاصل کرنے والے میرے دوست غلام عباس سیال کا تعلق بھی اسی قبیل سے ہے، وہ جدید تر ادب کے نمائندہ قلم کار ہیں۔ اُن کی دوسری تصنیف ''دیرہ مکھ

سرائیکستان‘‘ نے جہاں ڈیرہ اسماعیل خان کے پوشیدہ تاریخی گوشوں کی نقاب کشائی کی وہیں مصنف کے جرأت مندانہ اندازِ تحریراور تحقیق نے سرائیکی خطے میں نئی تاریخ رقم کی ہے۔غلام عباس نے اب ایک اور معرکہ سر کیا ہے اور ’’گلی کملی کے دیس میں‘‘ جیسی خوبصورت کتاب قارئین ادب کی خدمت میں پیش کر دی ہے۔اس کتاب میں اگرچہ مختلف النوع مضامین شامل ہیں لیکن یہ بیک وقت افسانوی مجموعہ بھی ہے اور ناول بھی، آپ بیتی بھی ہے اور سفر نامہ بھی، خاکہ نگاری بھی ہے اور اَسّی، نوے کی دہائی کی تاریخی دستاویز بھی۔

غلام عباس سیال ایک لبرل اور ترقی پسند سوچ کے حامل کالم نگار کی حیثیت سے بڑی تیزی سے ابھر کر سامنے آئے ہیں۔ان کی تحریریں سرائیکی عوام کو اُن کے غصب شدہ حقوق جائز اور اصولی طریقوں سے حاصل کرنے کا درس دیتی ہیں۔زیرِ تذکرہ کتاب اُن کی اپنی جنم بھومی سے محبت کی آئینہ دار بھی ہے۔ اپنی مٹی اور پیدائشی علاقے سے محبت انسان کی فطرت کا لازمی حصہ ہوتی ہے، انسان جہاں کہیں بھی رہے اس کا دل اپنے وطن، اپنی مٹی اور اپنی سرزمین سے لاتعلق نہیں رہ سکتا، اپنا دیس انسان کو کس قدر محبوب ہوتا ہے اس کا احساس پرائے دیسوں کی خاک چھاننے والوں سے زیادہ کس کو ہوسکتا ہے بقول حفیظ جونپوری

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے
ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

’’گلی کملی کے دیس میں‘‘ بنیادی طور پر اِسی محبت کا پرتو ہے لیکن گزشتہ کچھ عرصہ سے دہشت گردی اور انتہا پسندی کی بھینٹ چڑھتے ’’پھلاں دے سہرے‘‘ میرے ڈیرے کو اپنے بیٹوں اور باسیوں کی محبت اور توجہ کی جس قدر ضرورت آج ہے شائد ہی کبھی رہی ہو۔یہ شہر دامن دریدہ پکار پکار کر اپنے چاہنے والوں سے کہہ رہا ہے کہ وہ جو انسانوں کی فطرتوں اور ان کے دلوں میں زہر گھول رہے ہیں ان کا سدِ باب کر لو، ہوش میں آجاؤ، جاگو کہ وقت ریت کی مانند مٹھی سے پھسلتا چلا جارہا ہے۔اس شہر کے سارے اصحابِ علم وادب شہر کا امن وسکون بحال کرنے کی مقدور بھر کوشش کر رہے ہیں، اس سلسلہ میں عباس سیال کی کاوشیں بلاشبہ لائق تحسین ہیں (اللہ سائیں میرے شہر بے مثال کی رونقیں بحال کرے، اسے پھر سے امن وامان

اورخوشحالی کا گہوارہ بنائے۔آمین ثمہ آمین)۔

غلام عباس سیال نے اپنی کتاب میں جہاں ڈیرہ شہر کے سہانے ماضی کوتاریخ کا حصہ بنایا ہے وہیں ڈیرے کی خدمت کرنے اوراس کی ترقی کے لئے قربانیاں دینے والوں بالخصوص محسن ڈیرہ نواب اللہ نواز خان سدوزئی کوبھی خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔غلام عباس کا اندازتحریرنہایت سادہ،دلکش اوردل رُبا ہے ۔ان کا قلم روانی اور تاثیر میں بے مثال ہے،اردو کے ساتھ سرائیکی الفاظ کی آمیزش سے کتاب کا حسن دوبالا ہوگیا ہے۔یہ کتاب صفحہ بہ صفحہ قاری کے قدم روکتی،اسے شادکام کرتی،فکر کے درو بام سجاتی،خیالوں کو مہکاتی،یادوں کے پھول کھلاتی اورمحبتوں کے الاؤ روشن کرتی چلی جاتی ہے۔یہ کتاب اپنی مٹی اوراپنے لوگوں سے محبتوں کی آئینہ دار ہے،زندگی کی پیامبر ہے اور بقول رحیم گل زندگی مواقع بہم پہچانے میں بخل سے کام نہیں لیتی۔

میرے اسلامیہ ہائی سکول کے ہم جماعت نے نہایت مہارت کے ساتھ اپنے مقصداورشوق کی منزل حاصل کی ہے۔میں اس کامیابی پراپنے بھائی کوتہہ دل سے مبارکباد پیش کرتا ہوں اورشکر گذار ہوں کہ اس کتاب کو پڑھنے سے نہ صرف سکول کے زمانے کی یادیں تازہ ہوئیں بلکہ یہ مجھے اپنے دیگر ہم جماعتوں زاہد جمال،اختر طوفان،عبدالرؤف اور ماجد اقبال سے بھی ملوانے کا وسیلہ بنی۔اللہ کرے مرحلہء شوق نہ ہو طے۔

دعا گو

خورشید ربانی

اسلام آباد

یادوں کے کھرنڈ

''زندگی کا سفر، ہے یہ کیسا سفر، کوئی سمجھا نہیں، کوئی جانا نہیں''۔ برسوں پہلے کشور کمار نے اپنی مدھر آواز میں کومل سروں کے ساتھ زندگی کی حقیقت کچھ اسی طرح بیان کرنے کی کوشش کی تھی۔ واقعی کبھی کبھار ایسے لگتا ہے کہ جیسے زندگی کشور کے گائے گیت کی طرح ایک ایسے سفر کا نام ہو کہ جس کا بھید آج تک نہ کوئی جان پایا ہے اور نہ ہی جان پائے گا۔

زندگی کیا ہے؟۔ ہمیں پیدا کیوں کیا جاتا ہے؟۔ بچپن، لڑکپن، جوانی اور بڑھاپے کے مراحل طے کرنے کے بعد جب ہم اپنے منطقی انجام تک پہنچتے ہیں تو اس کے بعد کہاں جاتے ہیں؟۔ زندگی کی دلچسپ پہیلی کا راز آخر فنا میں کیوں مضمر ہے؟۔ بچپن فنا ہوتا ہے، لڑکپن آتا ہے، جوانی نمو پاتی ہے اور آخر کار ہانپتا، کانپتا اور کھانستا بڑھاپا جسم کو خاک میں ملانے کے ارادے سے سر پر تلوار لیے آن کھڑا ہوتا ہے۔ جسم کیوں اور کیسے خاک ہوتے ہیں؟۔ یادیں کیوں رہ جاتی ہیں اور یادیں بھی ایسی کہ جو آہستہ آہستہ وقت کی دھول میں اٹ کر اپنے ہم عصروں سمیت کسی انجانی بستی کا رخ کر جاتی ہیں۔ زندگی کی پہیلی میں چھپے اس راز کو آج تک نہ کوئی جان پایا ہے اور نہ ہی کوئی اس معمے کو بوجھ پائے گا۔

کچھ عرصہ قبل میں اپنے بیٹے کے ساتھ اولمپک پارک میں ''اُچی جگی جھاء، میکوں پکڑ ڈِکھا'' کھیل رہا تھا کہ کنکریٹ کے فرش پر گرنے سے اسے گھٹنے پر ہلکا سا زخم آیا۔ زخم کی جلن سے جب وہ بے اختیار رونے لگا تو اس کا حوصلہ بڑھانے کی خاطر مجھے وہی الفاظ دہرانے پڑے جو بچپن میں ایسے موقعوں پر سننے کو ملا کرتے تھے، ''اوہ ڈیکھ تاں سئی شودی پیلی دا اَٹا وِیٹا گے''۔ مگر میری تسلی کے باوجود بھی وہ چپ نہ ہوا آنسو قطرہ در قطرہ اس کے رخساروں سے یوں بہہ رہے تھے جیسے تھل میں اونٹوں کی لمبی قطار کسی ڈھلوان سے نیچے اتر رہی ہو۔ منہ سے گرم پھونکے مارنے اور ٹشو سے اس کے زخم صاف کرتے ہی وقت کے

گزرتے لمحوں نے اس کی جلن کو کم کرنا شروع کر دیا، آخر کار اس کا رِستا خون جم کر کھرنڈ بن گیا۔ دو تین دنوں کے بعد ایسے ہی بیٹھے بٹھائے نہ جانے اسے کیا سوجھی کہ کھرنڈ کو پھر سے کھرچ ڈالا اور جلن کے مارے بیٹھ کر رونے لگا۔ اس کی اس معصوم حرکت نے مجھے اپنا بچپن یاد دلا دیا، جب میں بھی اسی طرح کسی مانوس گلی میں دوستوں کے ہمراہ کھیلتے ہوئے گر کر اپنا گھٹنا زخمی کروا بیٹھا تھا۔ اس وقت میرے دوستوں میں سے ایک نے اپنے منہ سے گرم پھونکیں مار کر جلن کے احساس کو کم کرنے کی کوشش کی تھی، دوسرا بھاگم بھاگ گلی کے کسی کونے کھدرے میں خشک مٹی کی ڈھیری سے ایک چٹکی بھر لایا تھا اور پھر اس مٹی سے میرے زخموں کو ڈھانپ دیا گیا تھا۔ بلاشبہ یہ اس مٹی کی تاثیر تھی کہ اگلے ہی لمحے میرا زخم بھر گیا تھا لیکن دوسرے دن کسی انجانے لمحے میں جب کھرنڈ کو وقت سے پہلے کھرچنے کی کوشش کی تھی تو جما خون پھر سے رِسنے لگا تھا ۔نہ جانے ایک مدت بعد ایسے لگا جیسے یادوں کے کھرنڈ آج پھر سے تازہ ہو گئے ہوں اور ماضی کا جما خون ان سے بہہ نکلا ہو۔ آنگن کی سنہری مٹی میں اُگی یادیں پھر سے آنکھوں کی پتلیوں پر پرندوں کے پروں کی مانند پھڑ پھڑانے لگی ہوں جن کے آگے روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ڈال کر ''آؤ چڑیاں، آؤ لالیاں، آؤ کاں وُ'' کی صدائیں گونج اٹھی ہوں۔ یادوں کی منڈیر پر قطاریں بنائے بیٹھی قوسِ قزح کے خوبصورت رنگ بکھیرتی لالیاں اور معصوم چڑیاں، شہر کے ناہموار گلی کوچوں میں پڑے گند کو تیزی سے پھلانگتا، بھاگتا دوڑتا بچپن، رنگ برنگے غبارے، پلاسٹک کے باجے، کھٹی گولیاں، چُسکیاں، برف کے گولے، پٹھو گرم، گلی ڈنڈا، لٹو نیوں، کانچ کی گولیوں والے ساوے، نسواری اور شفاف اینٹی چِدوں کے ہنگامے۔ شام کو سرکاری کھمبے کی روشنی میں ''کوکلے چھپک'' اور تھپ کیس ماری ھِ، چونڈی کیس پاتی ھِ جیسے بے ضرر کھیل۔ باپ کی دی ہوئی چوّنی کو مضبوطی سے تھام کر ترنم سے گائی گئی اَدھی چھٹی ساری، ملا مچھی ماری۔ اَسی ہک اِکانسی، بلی تیڈی ماسی، چوہا تیڈا نانا۔ آلیاں بوالیاں دائی دے کنے والیاں، دائی گئی پیکے، کالا پیا لیٹے اور اکڑ بکڑ بمبا بو، اسّی نوے پورا سو، سوکلھوٹا تتر موٹا، چل مداری پیسہ کھوٹا، پیسے دی لڑائی، اُتوں آ گیا سپاہی، سپاہی نے میرا ڈنڈا، تساں کھیڈو گلی ڈنڈا کی گردانیں۔ تپتی دوپہروں میں دوستوں کے ساتھ مل کر مانجھا لگانا اور چھتوں پر چڑھ کر سوٹی ہاتھ میں لیے پتنگیں لوٹنا۔

کائنات کے خوبصورت ترین خطے کے چاروں جانب بکھرا قدرتی حسن، شام اودھ کو شرماتی شامیں کہ جہاں دھرتی کے حسن پر کالی رِدا چڑھتے ہی مامے چن کی حکمرانی کا آغاز ہو جایا کرتا تھا۔ مہربان آنچل کی ٹھنڈی چھاؤں میں لیٹے لیٹے ٹکٹکی باندھ کر ایک طرف مامے چن کو تکنا، دوسری طرف کانوں میں وسیب کی میٹھی رس گھولتی کہانیاں سننا: ''کاں وے کاں پُھلا ڈیندیں کہ نئیں۔ ناں ڈیندا۔ آکھاں میں دِرکھان کوں تیڈی ٹالی کپے؟۔ بِک ہئی بادشاہ، اُوندے ڈِھڈ تے جما گھا، اُوندی ہئی نُوں، اُوں کِیتا ٹُوں۔ اُوں کھادی دال، اوگئی ہسپتال۔ کھاؤں پکاؤں، کتھوں کھاؤں، اُدھار سُدھار، کون لہیسی۔ جیساں تاں میں لہیساں''۔ پھِدّی تے پھدّا، نانا گنجڑو، مرچو خان، وسلو، گٹھ مُٹھڑا اور ٹِنن ماما جیسی کہانیوں کے مشہور کردار۔

میرا تعلق اُسی نسل سے ہے جو 70 اور 75 کے درمیانی عرصے میں پیدا ہوئی، گویا میں اپنے عہد کی اس آخری نسل کا نمائندہ ہوں کہ جب فضا میں فکر و خیال کی رمک اور خوشبو کی مہک ابھی باقی تھی اور معاشرے میں بارود کی باس ابھی پوری طرح پھیلی نہ تھی۔ میں مانتا ہوں کہ اس عہد کی نسل سے کتاب کا رشتہ کمزور ضرور ہوا تھا مگر ابھی پوری طرح ٹوٹا نہ تھا۔ اُن دنوں ڈیرہ کی مشہور پانچ رنگ لائبریری نوجوانوں کی امیدوں کا مرکز ہوا کرتی تھی جہاں سے ایک ڈیڑھ روپے میں جیسے تیسے کوئی نہ کوئی معلوماتی کتاب یا عمران سیریز پر مبنی کوئی فکشن ناول کرائے پر پڑھنے کو مل جایا کرتا تھا۔ اُس وقت کے والدین بھی کتنے بھولے اور سادہ ہوا کرتے تھے کہ بچے کے ہاتھ میں عمران سیریز کی کتاب دیکھ کر اماں کہتیں: ''میں صدقے تھیواں، میڈا بچڑا پڑھ پڑھ کے تھک گیا ہوسی، آتیڈے سر وچ چار مغزاں دا تیل گھتاں چا''۔

مدت ہوئی وہ گلیاں، وہ چوبارے، وہ مقامات پیچھے چھوڑ آئے۔ ہم نہیں جانتے کہ اب وہاں ہمیں کوئی یاد بھی کرتا ہوگا کہ نہیں، مگر اس مٹی میں کچھ ایسی تاثیر ہے کہ جس کے درد کو ہم آج بھی محسوس کر رہے ہیں، پتہ نہیں یہ سب کیا ہے؟۔ میرے خیال میں ایسا انمول جذبہ جسے صرف محسوس کیا جا سکے مگر ماپا تولا نہ جا سکے محبت کے سوا کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا، کیونکہ چاہتوں کی سرزمین میں محبتیں قدم قدم پر گھلی ہوئی تھیں۔ نفرتوں کو فنا کر دینے والی یہ محبتیں آج بھی اس سرزمین کے گوشے گوشے میں گندم کی بالیوں کی طرح

سر اٹھائے جھوم جھوم کر لہرا رہی ہیں۔محبتوں کی اسی لہلہاتی فصل نے اس سرزمین کے باسیوں کو اپنا ہر رنگ، ہر روپ سونپا تھا اور اس کے گلی کوچوں، کھیت کھلیانوں میں چہار سو اپنی معطر خوشبو پھیلا دی تھی۔شبنمی چاہتوں کے بہتے سندھو دھارے کے لمس سے فیض یاب ہونے والی نم دار ہوائیں کسی زمانے میں اتنی طاقتور اور جاندار ہوا کرتی تھیں کہ اس نے نفرتوں کے کڑ کڑ کرتے کانگیرام چاقو کے زہریلے پھل کو زنگ آلود اور تعصب کے بارود سے بھری بندوق کی شعلہ اگلتی نالیوں کو ناکارہ بنا کر رکھ دیا تھا۔واقعی شربتی دریا کی مٹھاس بھری لہروں اور ہرسوں پھیلی ہریالیوں نے بہت سوں کو فنا کر دیا تھا۔

خیر یہ گئی رُتوں کی باتیں ہیں، اَسّی کی دھائی میں پیدا ہونے والی نسل اب پینتیس سے چالیس سالوں کے درمیان کی مسافتیں طے کر کے وقت کی اٹھک پٹخ کو خوب دیکھ رہی ہے۔اب بہت کچھ بدل گیا ہے نظریات بھی، جذبات بھی اور ترجیحات بھی۔جہاں ایک طرف نظریات اتنے اہم نہیں رہے وہیں جذبات پر بھی بے حسی چھا گئی ہے۔میری بستی اب واقعی وہ بستی نہیں رہی جہاں ستارے، پھول، جگنو اور پرندے اپنی دنیا سجایا کرتے تھے۔جہاں ایک کھلونا ٹوٹنا بھی سانحہ تصور ہوتا تھا۔گھروں کے در و دیوار میں رچے بسے مکین بھی اب وہ مکین نہیں رہے۔اجالوں میں بسے آنگن، آنگن میں برتن مانجھتیں، جھاڑو دیتی اور گھروں کا کونا کھدرا سنوارتی مائیں اور بہنیں کہ جن کی بدولت کبھی وہاں سے روشنیاں آیا کرتی تھیں، جہاں کبھی کھانوں کی مہک اٹھا کرتی تھی، وہ روشن چہرہ مائیں، چاندسی پیشانیاں لیے بہنیں، دمکتی سہاگنیں ،روشنی کے یہ سب ہالے کہیں کھو سے گئے ہیں۔جامد سناٹے کے گہرے ہوتے تاریک سائے میں اندھیری اور سیلن زدہ بو میں بسی ویران و سنسان گلیاں، گلی میں آدم بو کی دھمک کے خوف سے آپس میں سمٹے خزاں رسیدہ خشک پتوں کے سوا اب باقی کچھ نہیں بچا، بہت کچھ کھو سا گیا ہے۔جہاں پکارنے والی آنکھ میں موتیا اتر آیا ہے وہیں باپ کی دی ہوئی چوّنی بھی کہیں نالے میں گر کر کھو گئی ہے۔

رُت بدلتے واقعی دیر نہیں لگتی۔یہ اکیسویں صدی کی ٹچ اسکرین ڈیجیٹل دنیا ہے، نانے گنجڑو اور ٹنن مامے کی کہانیوں کا دور نہیں۔آج کا انسان دوسرے انسان کو متوجہ کرنے اور اسے حیرت میں رکھنے کے لیے وائیلنس کا سہارا لیتا ہے۔دنیا بہت فاسٹ ہو چکی، انفارمیشن ٹیکنالوجی کا سیلاب ہمیں بہائے کسی

نامعلوم مقام کی طرف سرپٹ دوڑے چلا جا رہا ہے۔ڈی وی ڈی پلیئرز،انٹرنیٹ،آئی فون،آئی پیڈ،آئی پاڈ کے ساتھ ساتھ صرف ایک کلک پر گوگل نے معلومات کے سارے خزانے کمپیوٹر کی سکرین پر انڈیل دیئے ہیں۔ وقت سارے کا سارا مادے میں ڈھل گیا اور مادہ اقتصادیات کی نذر ہو چکا ہے۔اس بے وفا صدی نے لوگوں سے محبتوں کا اعتبار،رشتوں کا اعتماد، چاہت اور خلوص تک چھین لیا ہے۔ وہ سکون جو اندھیری راتوں میں کھلے آسمان تلے سونے اور ماؤں سے قصے کہانیاں سننے میں ملتا تھا، اب کہیں نہیں ملتا۔جن سوراخوں سے کبھی ہوائیں اور خوشبوئیں آیا کرتی تھیں اب وہاں سے اژدھا بدن سکیڑے باہر آ نکلتا ہے۔

بے شک ہماری نئی نسل سائنس کے ترقی یافتہ دور کی ایک ایسی نسل ہے کہ جسے ہم اپنے بنائے گئے کسی فارمولے،کسی بریکٹ میں زبردستی فٹ نہیں کر سکتے،لیکن موجودہ دور کی گلوبلائزیشن،کمرشل ازم اور میڈیا امپیریل ازم کے ہاتھوں یرغمال بنی اپنی جیسی نسل کے لوگوں سے ہم پوچھنا چاہیں گے کہ کیا ہم نے صحیح سمت میں اڑان بھری ہے یا کہیں ہم پرندوں کی طرح اپنے غول سے بچھڑ کر راستہ تو نہیں بھٹک گئے؟۔

غلام عباس سیال

سڈنی۔آسٹریلیا

جانے کہاں گئے وہ دن

انسانی زندگی کے تین ادوار بچپن، جوانی اور بڑھاپا ہیں۔بچپن وہ سنہری دور ہے کہ جس کے لوٹ آنے کی تمنا ہر کوئی کرتا ہے۔عید میلے مناتا، بے فکری سے کھیلتا، اچھل کود کرتا شرارتوں اور ہنگاموں سے پُر آزادی کا انمول ترین دور کہ جس میں کوئی فکر لاحق نہیں ہوتی بلکہ وقت گرزنے کا احساس ہی نہیں ہو پاتا۔کب سو کر اٹھے، کب سکول گئے، کب گھر آئے، کب تختی بستہ دور کونے میں پھینکا، باپ کے ڈر سے مسجد گئے، جھوم جھوم کر سیپارہ پڑھا اور پھر استاد کی گرج دار آواز۔اوئے چھورو! سیپارے ٹھپو تے بھجو۔ سیپارے کو سینے سے چپکائے مسجد سے دوڑ لگائی، گھر پہنچے، ٹوپی، سپارہ الماری میں رکھا اور آسمان کی نیلاہٹ پر ڈوبتے سورج کی شفق رنگ شعاعوں کی تلچھٹ پھیلنے سے پہلے گلی محلے میں کھیلنے کودنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔کھیلتے کھیلتے جسم تھک کر چور ہوا، پسینے کا لمس سر کے بالوں سے ہوتا ہوا پاؤں کے چپلوں تک آ پہنچا، گہری ہوتی شام اپنے وجود میں سربستہ راز چھپائے نمودار ہوئی، شام کی گود میں سویا چاند انگڑائی لے کر بیدار ہوا، رات سر پر آئی تو ماؤں کی گود میں لیٹ کر نانے گنجڑو کی کہانیاں سنتے اور بجھارتیں بوجھتے بوجھتے میٹھی نیند سو گئے۔

بچپن کے یادگار دور کو انگریزی کے بے مثل شاعر جان ملٹن نے گمشدہ جنت کہا ہے۔واقعی ہر بوڑھے اور جوان کی ذات کے کسی نہ کسی کونے کھدرے میں اس کی گمشدہ جنت ضرور چھپی رہتی ہے۔ہم اپنی عمر کے کسی بھی حصے میں کیوں نہ ہوں، کبھی نہ کبھی کوئی واقعہ، کوئی قصہ ہمیں ماضی کی طرف لوٹنے پر مجبور کر دیتا ہے۔نہ جانے کیوں بیٹھے بٹھائے دل کرتا ہے کہ زمین پر رینگنا شروع کر دیں۔پھر سے ''بال بلوڑے

مِٹّی دے روڑے‘‘ بن جائیں اور گھر گھر ٹافیاں، پُھلے چنے، کھیر بھت اور دال روٹی کھاتے پھریں۔ جب میں اپنی یاداشتوں کے منجمد ذخیرے کی طرف نظر دوڑاتا ہوں تو یادوں کا ایک گلیشئر ذہن کے تصوراتی پردے پر سرکتا محسوس ہوتا ہے۔ میں یادوں کے اس پگھلتے اور سرکتے گلیشیر میں بہتی کسی ایک دھارا کو چھوتا ہوں اور اس کے ٹھنڈے لمس کو تحریر کے روپ میں ڈھالنے کی کوشش کرتا ہوں۔

میں اپنی بہشتی اماں سے اکثر پوچھا کرتا تھا۔ اماں تم نے میرا نام عباس کیوں رکھا؟۔ وہ کہتیں کہ لاہور میں بی بی پاک دامن کے مزار پر جا کر خصوصی منت مانی تھی اور ابھی تم پیدا بھی نہیں ہوئے تھے کہ ایک دن خواب میں ایک گھڑسوار دکھائی دیا، جس نے قریب آ کر گھوڑا روکا، بیٹے کی بشارت دی اور واپس چلا گیا اسی مناسبت سے تمہارا نام رکھا گیا۔ میرے خیال میں وہ سردیوں کے دن تھے جب میں نے ’’اَغُوں بَغُوں‘‘ کیا تھا۔ اماں کے بقول وہ پوہ کا ٹھنڈا یخ مہینہ تھا اور اس دن گھر میں گوبھی کا سالن پکا ہوا تھا۔ اماں اپنے لحاظ سے بالکل ٹھیک کہتی تھیں کیونکہ ایک تو میں آدھ درجن بہن بھائیوں کے بعد دنیا میں جلوہ افروز ہوا تھا دوسرا ڈیرہ شہر میں ان دنوں رجسٹریشن آفس جا کر اندراج کروانے کا کوئی باقاعدہ رواج نہ تھا، اسی لیے بڑے بوڑھے عموماً موسموں کے ہیر پھیر، ملکی اور غیر ملکی حالات وواقعات سے ہی عمرِ رفتہ کا اندازہ لگایا کرتے تھے۔ اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں کہ میں بھی عام بچوں کی طرح نہ صرف ننگ دھڑنگ پیدا ہوا تھا بلکہ اُس وقت کے رواج کے مطابق وُڈ ورڈ گرائپ واٹر کی خالی بوتل میں کبھی دودھ اور کبھی پانی ملا کر پینے، الاسٹک والی نیکر اور ٹِچ بٹنوں سے مزین گُلاس والا چولا پہن کر ہی بڑا ہوا ہوں گا۔ وقت رواں ندی کی مانند بہتا چلا گیا اور میں کسی بڑے بوڑھے کا سہارا لے کر پاؤں اٹھا کر چلنے لگا۔ اسی دوران ایک دن بغل میں مٹی کا ’’پَت رَوٹا‘‘ دبائے ابراہیم نائی آن دھمکے۔ انہوں نے مجھے اُلٹے پت روٹے پر لٹا کر آسمان کی جانب جھوٹ موٹ کی ’’ساوِی چڑی‘‘ دیکھنے کو کہا۔ مجھے کوئی ساوی چڑی تو نہ دکھائی دی مگر اُس ظالم نے اسی بہانے میرے پر کاٹ دیئے۔ چنانچہ روتے دھوتے، چیختے چلاتے اور ’’وائی اماں‘‘ کا ورد کرتے یہ اذیت ناک عرصہ زخم مندمل ہوتے ہی تمام ہوا۔ اس خون ریز تجربے نے میرے اعتماد میں کافی حد تک اضافہ کر دیا اور میں آہستہ آہستہ اپنے اردگرد کے ماحول اور لوگوں کو شناخت کرنے کے بہانے گھر سے باہر

جھانکنے لگا۔ جب میں بیک فلیش میں جاتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا گھر ان دنوں مسلم بازار میں واقع تھا۔اس وقت کے گلی محلوں کی تہذیب و ثقافت کا ایک اپنا نرالہ انداز ہوا کرتا تھا، جہاں کریانہ، دودھ دہی، گوشت، سبزی اور منیاری کی دکانوں کا وجود لازمی سمجھا جاتا تھا۔گھر کے عین سامنے جہاں اب چاچے سعید کی فروٹ اور سبزی کی دکان ہے وہاں پر اُن دنوں چاچے سَدُّو کی دودھ دہی کی دکان ہوا کرتی تھی۔ چوتا پہنے، بڑے بڑے گرز اٹھائے پہلوانوں کے دنگل والی دیو قامت تصویر نے دکان کی خوبصورتی میں اضافہ کر رکھا تھا۔دودھ کے ختم ہوتے ہی چاچا سَدُّو تازہ کھوئے اور سوہن حلوے سمیت ہر قسم کے لڑاکا اور کوسی بٹیرے بھی اپنی دکان کے پھٹے پر سجا کر رکھ دیا کرتے اور پھر تیتروں اور بٹیروں کی مختلف اقسام پر سیرِ حاصل تبصرے ہوا کرتے تھے۔شہر بھر کے بٹیرے باز چاچے سَدُّو کی دکان پر حصولِ علم کی خاطر اُمڈے چلے آتے تھے۔علم کے شیدائی جب کوسی اور نسلی بٹیروں کے بارے میں چاچے سدُو سے دریافت کرتے کرتے پیاس سے نڈھال ہونے لگتے تو دکان کے اندر مہ وسال سے پڑے پھپھوندی لگے مٹکے سے پانی نکال کر پی لیا کرتے جو خالصتاً اسی مقصد کے لیے برائے تبرک رکھ چھوڑا گیا تھا۔چاچے کی دکان محلے بھر کے بزرگوں، دانشوروں اور سیاستدانوں کی بیٹھک کے ساتھ ساتھ گاہے بگاہے انفارمیشن آفس کے طور پر بھی استعمال میں لائی جاتی تھی جہاں پر بیٹھا کوئی نہ کوئی خدائی خدمت گار بازار میں وارد ہونے والے کسی اجنبی شخص کو شناخت کر کے اس کی رہنمائی کر دیا کرتا تھا۔چاچے سَدُّو کی دکان کے ساتھ ہی مامے مٹھو کی سبزی کی دکان ہوا کرتی تھی۔سرد راتوں میں جب ماما مٹھو دکان کے اندر چارپائی ڈال کر سو جاتا تو دن بھر کی بچی کھچی مولیوں، گاجروں اور کچریوں کا ستیاناس کرنا ہم سب بچوں کا فرضِ اوّل ہوا کرتا تھا۔

جب میں اپنے بچپن میں جھانکتا ہوں تو مجھے یاد پڑتا ہے کہ وہ چونّی اور اٹھنّی کا دور تھا۔وسائل اور آمدنی کے ذرائع انتہائی محدود تھے۔اوسط طبقے کی تنخواہیں ہزار سے پندرہ سو روپے تک تھیں جبکہ زندگی نہایت سادہ، تصنع سے پاک غربت اور قناعت کا لبادہ اوڑھے ہوئے تھی۔لوگ مٹی کے گھڑوں میں پانی پیا کرتے تھے۔گھروں میں لکڑی کے چولہوں پر اور مٹی کی ہانڈیوں میں کھانا پکتا، جلانے کی لکڑی کبھی ٹال والے سے تو کبھی کسی دیہاتی سے منوں کے حساب سے خرید کر اسٹور کر لی جاتی تھی۔شیمپوز، فیس واش،

باڈی واش، باڈی اسپرے، آفٹر شیو اور ڈیوڈرینٹ کا نام ونشان تک نہ تھا۔ کپڑے دھونے کے لیے سبزی مائل صابن کی چکی جبکہ ہاتھ منہ دھونے اور نہانے کے لیے لائف بوائے ہی پہلا اور آخری آپشن ہوا کرتا تھا۔ ہلکے تربوزی رنگ کے لائف بوائے سے پورا گھرانہ نہایا کرتا تھا۔ گھر کی عورتوں کے لیے مساگ، سُرمہ، سگی اور سر دھونے کے لیے پہاڑی مٹی جبکہ سکول اور کالج کی فیشن ایبل لڑکیاں اپنی جلد میں نکھار اور گوراپن لانے کے لیے ماؤں سے چھپ کر تبت سنو کا استعمال کیا کرتی تھیں۔ اس وقت کے لوگ اتنے سادہ تھے کہ جس نے جو کہہ دیا اسی پر اعتبار کر لیا۔ محلے کے بیشتر مکانوں کی مشترکہ دیواریں اور پیوستہ چھتیں ایک دوسرے کے غم خوار، بھولے بھالے مکینوں کو سماجی اور روایتی بندھنوں میں مضبوطی سے جکڑے ہوئے تھیں۔ جنوب مغرب میں ماسی بختو کا گھر واقع تھا جن کا شمار چند گنے چنے پڑھے لکھے گھرانوں میں ہوتا تھا۔ محلے کا سب سے پہلا بلیک اینڈ وائٹ ہٹاچی ٹی وی جیسے ہی اُن کے گھر آیا تو ہم سب بچے مسکین صورت بنائے ان کے ہاں ٹی وی دیکھنے جانے لگے۔ وہاں پر بچوں کے لیے خصوصی طور پر ترپال بچھائی جاتی جبکہ بزرگ اور خواتین چارپائیوں پر بیٹھ کر بڑی شدت سے ڈرامہ شروع ہونے کا انتظار کیا کرتے تھے۔ خدا کی بستی، جھوک سیال، انکل عرفی، شہ زوری، افشاں، ان کہی، تنہائیاں وغیرہ، اُن دنوں کیا کیا شاہکار اور بلاک بسٹر ڈرامے نشر ہوا کرتے تھے۔ جب یہ ڈرامے آن ایئر آتے تو سڑکیں سنسان ہو جایا کرتی تھیں۔ شادی بیاہ کی تقریبات کے اوقات کار رکھتے وقت بھی اس چیز کا خصوصی خیال رکھا جاتا کہ کہیں یہ وقت ٹی وی ڈراموں کا نہ ہو۔ اس کے علاوہ جمعہ اور بدھ کی رات سکس ملین ڈالر مین، چپس، نائٹ رائیڈر اور ایئر ولف جیسی مقبول عام انگلش سیریز پیش کی جاتی تھیں۔ ڈراموں کے درمیان چند منٹوں کا وقفہ، اسی وقفے کے اندر عشاء کی اذان اور پھر گنے چنے اشتہارات مثلاً بنا کا ٹوتھ پیسٹ، نازپان مصالحہ، نورس شربت، ایم بی ہونڈا، بروک بانڈ، لپٹن چائے، کیوی شو پالش جبکہ اسٹیٹ لائف انشورنس کا مشہور اشتہار۔ اے خدا میرے ابو سلامت رہیں وغیرہ چلا کرتے تھے۔ اکثر آندھی سے ٹی وی انٹینا خراب ہو جایا کرتا تو کہا جاتا: ٹی وی تے مکھیاں آون لگ گے ہن، ایکوں ٹھیک کرو۔ انٹینا کی سمت درست کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی چھت پر جاتا اور وہیں سے ہی آوازیں لگاتا: یار ڈساؤ ٹھیک تھئے کہ نئیں؟۔ بس اتھیئں

ٹھیک ھ، ایکوں کیں شے نال بدھ چا۔ اکثر چھت سے اترنے تک ٹی وی پھر سے خراب ہو جایا کرتا اور چھت سے آنے والا کہتا۔ ہن تاں میڈا پیو وِی نہ ونجے، کوئی بیا ونجے۔ اُس وقت پبلک سکولوں کا بھی دور دور تک کوئی وجود نہ تھا، امیر اور غریب کے بچے سرکاری سکولوں میں ایک ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ ایک دن گلی میں کھیلتے ہوئے مجھے والد صاحب دال ٹانگری کا لالچ دے کر داخلے کی نیت سے سکول لے گئے۔ اندراج کے وقت جب یومِ پیدائش کا مسئلہ پیش آیا تو ماسٹر صاحب نے انگوٹھے اور انگلیوں کی پوروں سے مینول کالکولیشن کر کے میرا جنم دن نکالا اور ایگل پن کی سیاہی کو ہلکا سا جھٹکتے ہوئے اپنے رجسٹر میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے درج کر دیا۔ ''صیب! اِیندا گوشت تُساں داتے ہڈیاں ساڈیاں'' ۔۔۔ میرا گوشت استاد شیرو کے سپرد کرنے کے بعد والد صاحب خوشی خوشی گھر لوٹ آئے، انہوں نے اپنی دانست میں مجھے ایک مثالی تعلیمی ادارے میں داخل کروا دیا تھا۔

گورنمنٹ پرائمری سکول نمبر 3 کی یادیں: ہمارا سکول مسلم بازار میں چونگلہ کے نزدیک پنسار کی دکان کے قریب کرائے کے ایک کچے مکان میں واقع تھا۔ سکول کی سب سے نمایاں چیز کھگل کا ایک گھنا درخت تھا، شاید اسی لیے سکول کا نام ''کھگل کریٹہ'' مشہور ہو گیا تھا۔ میرے داخلے کے چند ماہ بعد سکول عارضی طور پر محلّہ خٹک اور پھر وہاں سے مسلم بازار میں گلی قریشیاں کے قریب بنے ایک خستہ حال کھنڈر میں منتقل ہو گیا۔ سکول کی کوئی بھی کل سیدھی نہ تھی۔ عمارت کا یہ عالم تھا کہ چار دیواری تو تھی مگر بجلی ناپید۔ ٹوٹی پھوٹی دیواریں، جھولتی کھڑکیاں، میز کرسیاں غائب، کلاسوں میں بے ترتیبی سے بچھے ٹاٹ۔ عمارت کی شکل و شباہت سے ایسا لگتا تھا کہ جیسے ہالی وڈ والوں نے اسے کسی ہارر فلم کی شوٹنگ کے لیے خصوصی طور پر کرائے پر لے رکھا ہو۔ سکول بھر میں رفع حاجت کے لیے اکلوتا بیت الخلا تھا جو پورا دن یا تو مویشیوں کی طرح بے تحاشا چرنے والے کسی طالب علم کے سبب بند رہتا یا پھر اس کے اندر کوئی نہ کوئی لڑکا استاد کی مار کے خوف سے چھپا بیٹھا رہتا، مجبوراً بہت سے طالب علم اوپن ائیر تھیٹر سے ہی اپنا کام چلا لیا کرتے تھے۔ سکول کی عمارت میں سات یا آٹھ کمرے تھے مگر سارے ایک سے بڑھ کر ایک ڈراؤنے، خوفناک، تاریک اور وحشت بھرے تھے۔ ان کمروں میں بیٹھنا گویا کسی کمرہ امتحان میں بیٹھنے کے مترادف تھا۔ کمرے میں پڑی

دیمک زدہ کرسی پر استاد سعید صاحب بیٹھنے سے پہلے ہر بار احتیاطاً آیت الکرسی، استغفار اور دوسری حفاظتی قرآنی آیات کا ورد ضرور کر لیا کرتے تھے۔ سکول کے صرف ایک ہی کمرے میں قدرتی ایئر کنڈیشنر کی سہولت میسر تھی۔ ایک لمبے سے بانس کو دونوں سروں سے رسی کے ساتھ جوڑ کر رسی کو چھت کے شہتیر کے ساتھ مضبوطی سے کس دیا گیا تھا اور پھر جھولتے بانس پر بشیر چپڑاسی کی میلی کچیلی رضائی ڈال کر ایک جھالرسی بنا دی گئی تھی۔ بانس کے عین درمیان میں ایک لمبی ڈوری باندھ کر اس کا دوسرا سرا کلاس مانیٹر کے ہاتھوں میں تھما دیا جاتا جو وقتاً فوقتاً اسے حرکت دے کر پوری کلاس کو دیسی ایئر کنڈیشنڈ ماحول فراہم کرتا رہتا، مگر یہ راحت افروز ماحول صرف استاد شیرو کی مخصوص وی آئی پی کلاس تک ہی محدود تھا جبکہ بقیہ کلاسوں کے طلباء نیوٹن کے اس قانونِ حرکت کا صرف دور ہی سے مشاہدہ کر سکتے تھے۔

سکول کُھلتے ہی ماسی میراں اور چاچا مینو اپنے اپنے چھبّے سجائے ٹام اینڈ جیری کی طرح ایک دوسرے کو گھورنے بیٹھ جایا کرتے تھے۔ دِلبر جمعدار ان دونوں کا مشترکہ دشمن تھا جو جان بوجھ کر ساری دُھول اور گردان کے چھبّوں کی طرف اڑاتا رہتا۔ ہر کوئی ماسی میراں اور چاچے مینو کے کرارے آلو موٹھوں، چھولوں، ہاضمے دار چورن، دال ٹانگری، شکر قندی، گڑ دھانی، گڑ والا پتیسہ، پاپڑی، سونف سپاری، ٹافیوں اور دو دو آنے والی لاٹری کی پرچیوں پر ٹوٹ پڑتا۔ ہر بچہ اپنی قمیض کی سائیڈ والی جیب میں چنے، ریوڑیاں اور ٹافیاں ڈالے خوشی خوشی گھوم پھر رہا ہوتا تھا، اسی دوران ہیڈ ماسٹر صاحب کی طوفانی آمد ہوتی، بشیر چپڑاسی پیتل کی فولادی گھنٹی پر لکڑی کا ہتھوڑا برساتا اور ٹن ٹن کے بیک گراؤنڈ میں کسی نہ کسی مظلوم طالب علم کی دھواں دھار پٹائی کا شور سنائی دیا کرتا تھا۔ ''استاد صیب اللہ داناں ہیوے، میں ول شطانیاں نہ کریساں''۔ گھنٹہ بجتے ہی سب بچوں کو اسمبلی کے لیے قطاروں میں کھڑا کر دیا جاتا۔ تلاوت کلام پاک، اقبال کی نظم لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری اور اس کے بعد کوئی نہ کوئی ضروری اعلان۔ اسمبلی کے دوران بچوں کے ناخن، بال، ٹوپی اور یونیفارم باقاعدگی سے چیک کئے جاتے اور کوتاہی برتنے والوں کو لائن حاضر کر کے سب کے سامنے سزا سنائی جاتی تھی۔ آخر میں سب طلباء قطاریں بنائے اپنی اپنی کلاسوں میں واپس چلے جاتے تھے۔ کلاس میں پہنچتے ہی استاد صاحب رجسٹر کھول کر سب کا نام پکارتے چلے جاتے

اور ہر کوئی اپنی باری پر ہاتھ اٹھا کر کہتا: ''حاضر صیب''۔ حاضری کا عمل مکمل ہونے کے بعد کلاسوں کا باقاعدہ آغاز ہو جایا کرتا تھا۔ ہمارا گھر، ہماری گائے، شیر کی خالہ، ثریا کی گڑیا، منی کا گھوڑا، آؤ بنائیں بلبلے، دو بکریاں، چڑیا گھر کی سیر، شیر اور چوہا، کام چور گدھا، پرندے کی فریاد، چیَن کا طوطا، تاجر کی دانائی اور چوہوں کی مجلس وغیرہ کچی اور پکی کلاسوں کے مشہور سبق تھے۔ ہمارے ہیڈ ماسٹر شیر زمان عرف اُستاد شیرو بڑے بارعب، محنتی مگر انتہائی جلالی قسم کے انسان تھے۔ شرارتی اور نالائق لڑکوں کی کھالیں اُدھیڑنا، انہیں اپنی ٹانگوں میں اڑنگی دے کر پھنسانا اور پھر ناکوں میں چاک ڈالنا، غیر حاضری کرنے والے طالب علموں کی قمیصیں اتار کر انہیں کسی لڑکے کے ہمراہ سکول بھر میں پھروا کر شناخت پریڈ کروانا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ اس وقت سزا کے طور پر کان پکڑوانے کا طریقہ نہایت ہی سفاکانہ ہوا کرتا تھا۔ طالب علم جب دونوں ہاتھ ٹانگوں کے بیچ میں سے نکال کر کانوں کی لوؤں کو پکڑ کر مرغا بنتا تو اوپر سے حکم صادر ہوتا کہ پشت میں ذرا برابر خم نہ آنے پائے، یعنی سر اور پچھلا دھڑ بالکل سیدھ میں ہوں، اب ایسی حالت میں نہ تو وہ بیٹھ سکتا تھا اور نہ ہی کانوں کو چھوڑ سکتا تھا۔ چار پانچ منٹ گزرنے کے بعد اس کی حالت ایسی ہو جاتی کہ کان سرخ، چہرہ ہلدی کی طرح پیلا اور ہاتھ پاؤں کپکپانے لگتے تھے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ استاد رزاق کی کلاس میں دو تابوت سائز کے صندوق پڑے ہوتے تھے۔ عادی مجرموں کے لیے ہیڈ ماسٹر کی طرف سے خصوصی حکم تھا کہ انہیں صندوقوں میں بند رکھا جائے، چنانچہ شرارتی لڑکوں کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے صندوق میں سزا کے طور پر لٹا کر اوپر سے طاقچہ بند کر دیا جاتا تھا۔ کچھ دیر بعد صندوق کے اندر سے گھٹی گھٹی آوازیں سنائی دیتیں: ''صیب میکوں کڈھو، میڈا ساہ نکلدے، میں ول سکول کول نہ بھجساں''۔ طالب علم کی اپیل کو نہ صرف سختی سے رد کر دیا جاتا بلکہ اس کے سرپرست کو بلوا کر سخت الفاظ میں صورتِ حال سے باخبر رکھا جاتا تھا۔ جب بچہ روتا دھوتا گھر آتا اور استاد کی شکایت لگاتا تو شکایت لگانے پر از سرِ نو مار کھاتا تھا۔ اس وقت کے والدین بڑے سخت گیر ہوا کرتے تھے، جب بچے کی پھینٹی ہونے لگتی تو درد بھری چیخ و پکار اور آہ و فریاد سن کر ہمسائے دیواریں پھلانگتے ہوئے آتے اور معاملے کو رفع دفع کرواتے ورنہ ماؤں بہنوں میں اتنی جرأت نہ ہوتی کہ وہ باپ بیٹے کے بیچ میں پڑیں۔ پتہ نہیں اُس دور میں بیوی اور بچوں کو شوقیہ پیٹنے کا رواج

کیوں عام تھا؟۔ جہاں بیوی اپنا فرض سمجھ کر شوہر سے خوب مار کھاتی وہیں بچوں کے لیے یہ فرض استادوں کو سونپ دیا جاتا، جو جب چاہتے بغیر کوئی وجہ بتائے دُھن کر رکھ دیا کرتے تھے۔ بہر حال یہ اس وقت کے سکولوں کا المیہ تھا کہ وہاں پٹائی اللہ واسطے کی جاتی تھی اور ہمارے سکول میں یہ اللہ والے کچھ زیادہ ہی تھے۔ شاید اسی لیے جو کوئی ہم سے پوچھتا: ''کا کا کتھاں پڑھدیں؟''۔ ہم سینہ تان کر کہتے، پریمری سکول نمبر ترے وِچ۔ پوچھنے والا وہاں کے پرتشدد ماحول اور ہیڈ ماسٹر صاحب کی پُر جلال شخصیت سے پہلے ہی واقف ہوتا اسی لیے سکول کا نام سنتے ہی فوراً کہتا: ''اچھا اچھا ایویں آکھ جو شیر وکھل کھلڑ آلے سکول وِچ پڑھداں''۔ ڈیرہ بھر میں یہ اعزازی نام صرف ہمارے سکول کو ودیعت ہوا تھا کیونکہ وہاں لڑکوں کی کھالیں اتاری جاتی تھیں۔

ہیڈ ماسٹر صاحب کے علاوہ ہمارے اساتذہ بھی ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ استاد غلام سرور چاک سے تختہ سیاہ کو ''ا۔ب۔پ'' پر مشتمل حروف تہجی سے بھرتے جاتے اور ساتھ ہی اپنی سریلی آواز میں ''الف خالی ب دے تلے اِک نقطہ'' والا سبق ترنم کے ساتھ رٹواتے چلے جاتے۔ استاد اسماعیل سبق پڑھاتے پڑھاتے اچانک اڑتی ہوئی کسی مکھی یا بھڑ سے ہم کلامی شروع کر دیا کرتے تھے۔ استاد صادق، استاد سعید، استاد خورشید، استاد مجید اور استاد عبدالرزاق کا شمار انتہائی محنتی اساتذہ میں ہوتا تھا۔ ہمارے سکول میں اسلامی تعلیمات کے لیے بھی ایک پیریڈ مخصوص ہوتا تھا۔ استاد گلو (گل محمد) دینیات کے ٹیچر تھے جو روزانہ ہم سب سے چھ کلمے بمعائے دعائے قنوت سنا کرتے تھے۔ اگر کہیں بھول چوک ہو جاتی تو تختی ٹخنے پر اتنی زور سے مارتے کہ طالب علم نیند میں بھی دعائے قنوت پڑھ رہے ہوتے تھے۔ جو قرآنی سورتیں مجھے ابھی تک یاد ہیں یہ اسی دور کی عنایت ہیں۔ ہمارے سکول میں جتنی خامیاں تھیں اتنی خوبیاں بھی تھیں۔ آج کل پہلی جماعت سے ہی بچوں کو سستے قسم کے بال پوائنٹ پکڑا دیئے جاتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی لکھائی خوشخط نہیں ہو پاتی لیکن ہمارے دور کی خصوصیت یہ تھی کہ سکولوں میں خوش خطی پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی اور لکڑی کی تختی پر کانہے کے قلم سے اردو رسم الخط لکھنا سکھایا جاتا تھا۔ مثلاً قلم کیسے پکڑنی ہے، کس زاویے سے اور کس طرح خوش خط لکھنا ہے؟۔ اکثر اساتذہ کی جیبوں کے اندر ہر وقت ایک تیز دھار چاقو

چھپا رہتا تھا جس کے ذریعے وہ طلباء کو نوکدار قلمیں گھڑ کر دیا کرتے تھے۔حساب کتاب کے لیے سلیٹ کا استعمال عام تھا جبکہ انگریزی کے لئے چار لائنوں والی کاپی پر ایگل اور ڈالر کے فاؤنٹین پنوں سے پریکٹس کروائی جاتی تھی۔اردو خوش خطی میں ہمارا کلاس فیلو قیصر زیب ہمیشہ اول آیا کرتا تھا۔قیصر زیب کی خوش خط تختی رول ماڈل کے طور پر ساری کلاسوں میں پھروائی جاتی تھی۔ہمارے سکول میں صرف دو دن ایسے آتے تھے کہ جب اساتذہ اپنے چہروں پر مسکان سجائے گھوم پھر رہے ہوتے تھے۔ایک نتیجے کا دن اور دوسرا ایجوکیشنل انسپکٹر کی سالانہ چیکنگ والا دن۔نتیجے والے دن سارے بچے مٹھائیوں کے ڈبے اور پھولوں کے ہار ہاتھوں میں لیے سکول کے صحن میں اپنے اپنے استاد کے سامنے بیٹھ جایا کرتے تھے۔ہر ایک کا دل دھک دھک کر رہا ہوتا تھا۔اسی اثناء میں بشیر چپڑاسی فیل شدگان کی لسٹیں اٹھائے اعلان کیا کرتا، استاد خورشید دی کلاس چوتھی ب وِچ خالد تے عنایت اللہ فیل باقی سارے پاس۔نتیجے کا اعلان سنتے ہی بچے استاد کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالتے اور اسے مٹھائی گفٹ کرتے جبکہ فیل شدگان بشیر چپڑاسی کے پیچھے لگ کر اپنے اپنے ناموں کی رول نمبر کے حساب سے دوبارہ چیکنگ کرواتے۔بشیر چپڑاسی انہیں کسی پائیڈ پائپر کی طرح اپنے پیچھے لگائے پھرتا تھا۔سکول میں جب کبھی کسی ایجوکیشنل انسپکٹر نے سالانہ چیکنگ کے لیے آنا ہوتا تو اس کی متوقع آمد کی خبر سن کر ہیڈ ماسٹر سمیت سب اساتذہ کے چہروں پر ہوائیاں اڑتی نظر آتی تھیں۔معائنے سے ایک دن پہلے دلبر جمعدار سے کلاس رومز کی صفائی کروائی جاتی، چھتوں، دیواروں اور کونوں کھدروں میں لگے جالے اتروائے جاتے، کلاسوں کو خیراتی چارٹوں سے مزین کیا جاتا، ٹاٹوں کو خوب جھاڑا جاتا اور کچے صحن میں چھڑکاؤ کروانے کے بعد اچھی طرح جھاڑو پھروائی جاتی تھی۔معائنے والے دن علی الصبح سب طلباء کے گھروں سے گملے اٹھوا کر سکول کے صحن میں ترتیب سے لگا دیئے جاتے، اسکول کا سارا اسٹاف حاضر پایا جاتا خصوصاً بشیر چپڑاسی کو نہا دھو کر سکول آنے کی سختی سے تاکید کی جاتی تھی۔اس دن سکول اتنا نکھرا نکھرا اور چم چم کرتا نظر آتا کہ سب ایک دوسرے کو حیرانی سے تک رہے ہوتے تھے۔مگر یہ سارا سلسلہ عارضی ہوتا اور انسپکٹر کے قدم باہر رکھتے ہی سب کچھ اپنی اصل حالت میں واپس آ جاتا۔کسی کو اپنے ٹلسی (نیاز بو) اور گلاب کے پھولوں والے گملوں کی فکر پڑ جاتی تو کوئی اپنے

چارٹ واپس اتار رہا ہوتا تھا۔ استاد صاحبان بھی تہذیب وتمدن کا گھٹن زدہ لبادہ اتار کر اپنے اپنے ڈنڈوں سمیت واپس اپنے اصل رنگوں میں رنگ جایا کرتے تھے۔

پرائمری سکول کے زمانے میں وہ دن ہم سب کے لیے خوشی کا پیام لے کر آتا جب کالج کے لڑکوں کا کوئی احتجاجی جلوس سکول کے سامنے سے گزرنے لگتا۔ ہم سب کی جان میں جان آجاتی اور ہر کلاس سے نعرے بلند ہو رہے ہوتے۔ ''ہالیڈے چھٹی ڈے، ہالیڈے چھٹی ڈے''۔ ہمارا شور وغوغا سن کر احتجاجی جلوس سیدھا سکول کا رخ کرتا اور بشیر چپڑاسی سے گھنٹہ بجانے والا ڈنڈا چھین کر ہمیں اس قید سے وقتی خلاصی دلواتا۔ تواتر سے بجتی اس گھنٹی کا ایک خاص مزہ ہوتا تھا کہ جسے سنتے ہی کلاسوں سے لڑکے ایسے دوڑ پڑتے جیسے پنجروں سے قیدی پرندے آزاد کر دیئے گئے ہوں۔

گرمیوں کی چھٹیاں: جون کے مہینے میں گرمیوں کی چھٹیاں ہوتے ہی دستور کے مطابق بچوں کو محلے کی قریبی مسجد میں پڑھنے کی خاطر بھیج دیا جاتا تھا۔ یہاں پر بھی بدقسمتی ہمارا پیچھا نہ چھوڑتی کیونکہ موچیاں والی مسیت کے معلم استاد کامل صاحب کو سبق پڑھانے سے زیادہ پیٹنے کا شوق تھا اور وہ اپنے بھاری بھرکم ہاتھوں سے اکثر یہ شوق پورا کر لیا کرتے تھے۔ سارے لڑکے صفوں پر ترتیب سے بیٹھ جایا کرتے اور طوطے کی طرح سبق رٹنے لگتے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بغدادی قاعدہ الف۔ با۔ پا کا سبق دہراتے وقت اگر کوئی لڑکا سر کو جنبش دینے یا پنڈولم کی طرح آگے پیچھے سر ہلانے کی کوشش نہ کرتا تو استاد کامل کسی ماہر نیزہ باز کی طرح دور سے ہی اپنی قمچی مطلوبہ طالب کی طرف زُوں کر کے پھینکتے جو اکثر اس بے چارے کی کُتی پر لگ کر دور جا گرتی تھی۔ اس پر بالائے ستم یہ کہ قمچی کو اٹھا کر واپس کرنا بھی متاثرہ طالب کی ذمہ داری ہوا کرتی تھی۔ کوئی لڑکا سر نہ ہلاتا تو بھی پٹتا اور اگر خوف کی وجہ سے کوئی زیادہ سر ہلا دیتا تب بھی اس کی پٹائی لازمی ہوتی تھی۔ استاد صاحب نے ہمیں یہ کلیہ کبھی نہ بتایا کہ کس قدر جھومنا ہے اور کتنا سر ہلانا ہے۔

موسم گرما اور لیمن سوڈا: گرما کی مشہور سوغاتوں میں کلاچی اور منکیرہ کے خربوزے، لیہ کے تربوز، لنگڑی آم، فالودہ، برف کے گولے، چسکیاں، گڈ گڈ کی آئس کریم اور لیمن سوڈے والی بوتلیں نمایاں تھیں۔ گرما رت چھاتے ہی ہر طرف لیمن سوڈے کی بوتلیں چھن چھنا اٹھا کرتی تھیں۔ دکاندار اس سیزن کا بڑے شوق

سے انتظار کیا کرتے تھے،عموماً بوتلیں مارکیٹ میں آنے سے ہفتہ بھر پہلے جست کی پیٹی کو خوب صاف کیا جاتا پھر اس میں برف کوٹ کر ڈالی جاتی اور برف کے بیچ میں رنگ برنگی بوتلیں رکھ دی جاتی تھیں۔ٹھنڈی ٹھار یخ بستہ بوتلیں بیچنے والے دکانداروں کے حساب کتاب کا طریقہ بھی انتہائی دلچسپ ہوا کرتا تھا۔بوتلیں ادھار پر دینے سے پہلے لکڑی کی تختی پر پنسل سے گاہک کا نام لکھا جاتا اور دوسرے دن کپڑے کا تھیلا ہاتھ میں لیے گھر گھر جا کر خالی بوتلیں اکھٹی کی جاتی تھیں۔بوتلیں وصول کرنے کے بعد تختی سے مطلوبہ گاہک کے نام پر پنسل سے کراس لگا دیا جاتا تھا۔جب تختی بھر جاتی تو اسے پہاڑی مٹی سے صاف کر کے سکھایا جاتا اور اس پر پھر سے نیا حساب چڑھا دیا جاتا تھا۔وصول شدہ خالی بوتلوں کو الگ کریٹوں میں رکھا جاتا اور پھرا نہیں ریڑھے رکشے پر لاد کر بھرائی کی خاطر سوڈا واٹر فیکٹری بھیج دیا جاتا تھا۔اگر کسی گھر سے دکاندار کو خالی بوتل واپس نہ ملتی تو وہ مطلوبہ گاہک کو گلی بازار میں دیکھتے ہی یاد دہانی کرواتا: لالہ تیڈے گھر میڈیاں چار بوتلاں ہوسن۔مہربانی کر کے پچا چا۔ٹھیک ہے، لالہ میں پتہ کریساں۔اگر کسی گھر میں بوتل ٹوٹ جاتی تو پردے کے پیچھے سے خاتون خانہ دکاندار کو کہتیں: گھر وچ بوتل کوئنی،اساں تیکوں ڈے ڈتی ہوسی۔نیئں امڑی میڈے حساب اچ بوتل تہاڈے گھر اچ ہوسی۔جب تکرار بڑھنے لگتی تو دکاندار واپس چلا جاتا اور مطلوبہ گھر کے سارے افراد کو بلیک لسٹ کر دیا کرتا تھا۔پھر جب کوئی اُس گھر سے ادھار پر بوتل لینے آتا اور کہتا: چاچا اماں آدھی پئی ہے ہک رتی، ہک ساوی تے ہک مرچاں آلی بوتل تاں ڈے، بابا گھر آسی تاں تیکوں پیسے ڈے ڈیسوں۔دکاندار جل کر کہتا: چل اوئے بھجے ونج،کوئنی بوتل،تساں میڈیاں بوتلاں بھن ڈیندے وے تے وت الٹا کوڑ وی مریندے وے۔بچہ واپس جا کر اماں کو ساری کہانی خوب نمک مرچ لگا کر سناتا تو وہ آگے سے کہتی۔میکوں پتہ ہئی اوتر انبھایا بوتلاں نہ ڈیسی۔یہ کہتے ہوئے وہ اپنے بوچھن کے پلو میں لگی گانٹھیں کھول کر اس میں سے پیسے نکالتی اور بچے کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہتی: اے گھن پیسے،بھنی اوئی بوتل دے پیسے وی ڈے آوِس،ترے بے بوتلاں وی گدی آ، تے نالے اٹھ آنے دی ورف وی گھن آ،میں تو یکوں ٹھڈا کھیر بناڈیواں۔بچہ خوشی خوشی پیسے لیتا اور ماں سے کہتا۔اماں میں ایندے وچوں اٹھ آنے دیاں چوپڑیاں گھناں چا ؟۔ہاں دی چونڈی لگی شالا ،ہک تاں تیڈے چوسے نیں پے

مکدے۔ چوپڑیاں کھا کھا دندھاں دا تختہ کڈھ سٹاوی۔ دندھاں مُتوں ڈین لگدا ودیں۔ سیزن کے اختتام پر بوتلیں بیچنے والے دکانداروں کے لبوں پر یہی شکوہ ہوتا: یار سیزن اچ الٹا نقصان تھی گے۔ کجھ وی نیں بچا۔ اگلی دفعہ صرف ورف وِچیسوں۔ گرمیوں کی چھٹیوں کے اختتام پذیر ہوتے ہی سب بچوں کو دوبارہ سکول کا راستہ دکھا دیا جاتا تھا۔

پرائمری سکول کا پرخطر عرصہ کان پکڑنے، تختیاں لڑوانے، توڑنے اور اس پر پہاڑی مٹی مل کر سُکھانے کی خاطر مشہور ترانہ ''سُکی اے سُکا ڈے چالی بٹہ لا ڈے، چالی بٹہ لوئے دا پانی پیساں ٹوئے دا'' گانے، دوات میں گُڑ اور تھوک ڈال کر اُسے گاڑھا کرنے، گرد آلود ٹاٹ جھاڑنے اور پہاڑے پکانے میں گزار دیا۔ میری اماں مجھے ملیشیا کے کپڑے میں سکول کی اشیاء لپیٹ دیا کرتی تھیں جس کے اندر ایک پرانی سلیٹ، اردو، دینیات، جغرافیہ اور حساب کے قاعدے، مٹھو بک سٹال سے لی گئی کچھ رف کاپیاں، ایک ٹن کا بوسیدہ جیومٹری باکس جس کے اندر چھپی ایک عدد سلیٹی، ایگل پن، ایک فٹ اور دو قلمیں نمایاں ہوتی تھیں۔ کڑاکے کی سردی اور شدید گرمیوں کی تپش سے بے خبر بغل میں بستہ دبائے، ہاتھوں میں تختی اٹھائے وقت کے محور پر گردش کرتے کرتے میں بھی باقی دوستوں کے ہمراہ پانچویں کلاس تک آ پہنچا۔ اسی دوران وظیفے کی خاطر لگائی گئی لیلا منڈی میں استاد سعید نے ہم پانچ چھ کلاس فیلوز کو استاد شیرو کے حوالے کر دیا۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں ہر کلاس سے چھانٹی کئے گئے تیس کے قریب لڑکے اُستاد شیرو کی سربراہی میں اپنے وقت کو کھیل کود کی بجائے وظیفے کے امتحان میں صرف کرنے لگے۔ اللہ اللہ کر کے ہائی سکول نمبر 4 سے سب دوستوں نے وظیفے کا امتحان دیا اور جب وظیفے کی پہلی قسط ہاتھوں میں آئی تب کہیں جا کر احساس ہوا کہ اس میں ہمارا کوئی خاص کمال نہیں بلکہ یہ سب استاد سعید اور استاد شیرو کی انتھک محنت، توجہ اور کوششوں کا ثمر تھا۔ ہیڈ ماسٹر شیر زمان لاکھ سخت گیر سہی لیکن مخلص، محنتی اور سادہ لوح انسان تھے۔ بلاشبہ ان کا وجود ہی سکول کی کامیابی کی علامت سمجھا جاتا تھا، اسی لیے والدین کی خواہش ہوتی کہ ان کا بیٹا استاد شیرو کے زیرِ سایہ تعلیم حاصل کرے۔ پانچویں جماعت کا نتیجہ نکلتے ہی پرائمری سکول کا یادگار دور اختتام پزیر ہوا اور اسلامیہ ہائی سکول نمبر 2 میں کلاسوں کا باقاعدہ آغاز ہوا۔

گورنمنٹ اسلامیہ ہائی سکول نمبر 2: پرائمری نمبر 3 جیسے عوامی سکول سے نکلنے کے بعد اسلامیہ سکول جاتے ہی ایک دم نیا ماحول دیکھنے کوملا۔ پنجم کے بعد دوسرے سکولوں سے طلباء جب ہمارے سکول میں داخل کئے گئے تو ایک جماعت کوکئی سیکشنوں میں بانٹ دیا گیا۔ اپنی کلاس کے دروازے پر جب ششم ڈی لکھا دیکھا تو ایک عجیب قسم کی سرشاری کا احساس ہوا اورسب دوست خودکو بڑا بڑا محسوس کرنے لگے۔ کلاس روم میں ترتیب سے لگائے گئے ڈیسک اور کرسیاں۔ عمارت کے درمیان میں سرسبز پارک اوراس میں ترتیب سے لگے انار کے درخت اورسکول کی چار دیواری کے باہر دور تک پھیلا کھیل کا میدان۔ لکڑی کے مخصوص ڈیسکوں پر نئے یونیفارم، جوتوں اور بستوں سمیت بیٹھے ابھی تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ ایک ہنس مکھ قسم کا شخص ہاتھ میں رجسٹر تھامے کلاس روم کے اندر تشریف لے آیا۔ تعظیماً ساری کلاس اسٹینڈ اپ ہوگئی۔ انہوں نے بیٹھنے کا اشارہ کیا، رجسٹر کھولا، حاضری لی، باری باری پوری کلاس کے نام پوچھے اور آخر میں ہنستے مسکراتے اپنا تعارف کروایا۔ ہمارے اس ہنس مکھ استاد کا نام قاضی ابراہیم تھا۔ ان کے جانے کے بعد نئے مضامین کے ٹیچرز آتے گئے اور اپنا تعارف کرواتے چلے گئے۔ اسلامیہ سکول کے سارے ٹیچر اچھے تھے لیکن انگریزی مضمون کے استاد سلیم فاروقی صاحب کی کیا بات تھی۔ خصوصاً ان کا لہک لہک کر الہ دین اینڈ میجک لیمپ اور علی بابا چالیس چور والا سبق رٹوانا اور ڈنڈے کے زور پر ہمیں فرنگی بنانا ابھی تک یاد ہے۔ سلیم فاروقی پڑھاتے وڑھاتے جو تھے سو تھے البتہ مولا بخش کا استعمال بڑی فراخدلی سے کیا کرتے تھے، جو لڑکے انگریزی میں کمزور تھے ان کی تو خوب مرمت ہوتی تھی۔ بستی گھائیانوالی کے قریبی کھوہ سے آنے والا ہمارا معصوم کلاس فیلو امان اللہ اکثر استاد کے قہر وغضب کا نشانہ بنتا۔ *immediately* کو ''اِمی دِی جیٹلی'' اور *knowledge* کو ''نالے اِچ'' پڑھنے والوں کی بھی خوب دھنائی ہوا کرتی تھی۔ ہائی سکول کے باقی قابل ذکر اساتذہ کرام میں جناب اللہ وسایا، خالد صدیقی، قاری نور محمد، قاری عبدالمنان، صادق تبسم، استاد شاکر، استاد حنیف، حبیب الرحمان، عبدالحق، حق نواز، پی ٹی اسلم، پی ٹی افضل اور قیوم نواز صاحب نمایاں تھے جبکہ استاد امجد، استاد ڈُوڈی اور اقبال یوسف زئی کا شمار انٹرٹینمنٹ پرووائیڈرز میں ہوتا تھا۔ پی ٹی اسلم سب سے زیادہ ڈسپلن والے تھے۔ وہ سکول کے اردگرد چکر لگا کر کلاسوں سے بھاگے طلباء کو پکڑتے اور

ادھر ہی ان سے تفتیش شروع کر دیا کرتے تھے۔ ہائی سکول کے پرنسپل یوسف بھٹی انتہائی سخت مزاج تھے۔موصوف کو دور ہی سے دیکھ کر اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ تارا مسیح کے عہدے سے ریٹائرڈ ہو کر ہمارے سکول میں طالب علموں کو ڈرانے کے لیے بطور پرنسپل تعینات کئے گئے ہیں۔''میرا ڈونا'' صفت پرنسپل صبح سویرے سب طلباء کو جبراً کلاسوں سے باہر لے جا کر اپنی نگرانی میں سکول کے چمن صاف کرواتے۔کوتاہی برتنے والے سٹوڈنٹ کو دیکھ کر ان کے کانوں سے دھواں نکلنے لگتا، غصے میں ان کی ناک پھول کر کپا ہو جایا کرتی اور پھر کلھ چنتے سٹوڈنٹ کو اپنی پشاوری چپلی کی نوک پر رکھ کر ککوں کی خوب بارش برساتے۔ بدقسمتی سے اگر سکول کا کوئی طالب علم لیٹ آتا تو موصوف گیٹ بند کروا دیتے تھے۔تقریباً کوئی آدھ گھنٹے بعد لیٹ کمرز کے لیے گیٹ کھولا جاتا اور گیٹ پر بیٹھے استاد چیف کے موٹے ہاتھوں سے منہ پر دو چار تھپڑ کھانے کے بعد کلاسوں میں روانہ کر دیا جاتا تھا۔آٹھویں کلاس تک پہنچنے سے پہلے ہی پرائمری سکول سے چلے آ رہے چند دوستوں نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا۔ہنس مکھ اور یار باش محمد ندیم کو لڑکپن میں ہی شوگر کے عارضے نے جکڑ لیا جو جان لیوا ثابت ہوا جبکہ ہمارے بہت ہی پیارے دوست آصف قصوریہ جو بزم ادب میں انڈین فلم مشعل کا گانا'' مجھے تم یاد رکھنا اور مجھ کو یاد آنا تم'' سنایا کرتے تھے بدقسمتی سے گرمیوں کی چھٹیوں میں دھاونی کے دوران سندھو کی طوفانی موجوں کی نذر ہو گئے۔قیصر زیب کچھ ایسے غائب ہوئے کہ پھر کچھ پتہ نہ چل سکا۔محمد اسد جان، امان اللہ، غلام محمد، عبداللہ جان، اللہ بخش، خدا بخش، جاوید، وقاص، حکیم ثناءاللہ اور عنایت اللہ جیسے پرانے دوستوں کا گروپ کلیکشن آرٹ مضامین جوائن کرنے سے بکھر سا گیا۔عمیر، ماجد اقبال، زاہد جمال، ماجد سلیم، محمد طارق، محمد اسلم، غلام سرور، اقبال حسین اور عامر وسیم ہی باقی بچے، مگر سائنس کی نئی کلاس میں نئے دوست خوشبو کے جھونکوں کی طرح وارد ہوئے جن میں خورشید ربانی، خوبصورت قد و قامت کے مالک محمد اختر عرف اختر طوفان، انتظار حسین اور عبدالرؤف نمایاں تھے۔یہ سارے دوست بھی میٹرک کرنے کے بعد ایسے غائب ہوئے کہ آج تک مجھے ان سب سے ملنے کا ارمان ہی رہا ہے۔اسلامیہ سکول میں کافی محنت سے پڑھائی کی۔پانچ سال کا عرصہ مستقل مزاجی سے گزار کر میٹرک فرسٹ ڈویژن سے پاس کیا اور گورنمنٹ کالج میں داخلے کے لئے صلاح مشوروں کے بعد ایف ایس سی میں داخلہ لے لیا

سکول اور کالج کے لائف اسٹائل میں واضح فرق دیکھنے کو ملا۔ سکول میں ہر پیریڈ کے بعد اساتذہ خود کلاس رومز میں آتے تھے مگر یہاں طلباء کو لیکچرر کے کمروں میں جانا پڑتا اور ہر ایک کے پاس اپنا ٹائم ٹیبل ہوتا تھا۔ کلاس رومز میں سکول کی طرح کوئی ڈیسک وغیرہ بھی نہ تھا بلکہ فائیل رکھنے کے لیے کرسی کے ساتھ جڑی ایک چوڑی سی جگہ بنا دی گئی تھی، اس کے علاوہ کوئی مخصوص ڈریس کوڈ نہ تھا، جو مرضی پہن کر چلے جائیں۔ اردو میڈیم سے میٹرک کرنے کے سبب میری انگریزی شروع میں کافی کمزور تھی۔ اسی لیے چند ماہ فزکس اور کیمسٹری کی فرنگی زبان میں لکھی کتابوں کو سمجھنے میں صرف کر دیئے۔ دن پر لگا کر اڑتے چلے گئے، سال پورا ہونے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے، دیکھتے ہی دیکھتے امتحانات سر پر آ گئے اور بڑی مشکل سے ایف ایس سی جیسے موذی مرض سے نجات ملی۔ ایف ایس سی کے عبرتناک تجربے، یار دوستوں اور رشتہ داروں کے طنزیہ و بے رحم طعنوں سے تنگ آ کر جب کوئی اور راہ سجھائی نہ دی تو مجبوراً بی ایس سی میں کودنا پڑا۔ اُن دنوں بی ایس سی کمپیوٹر سائنس کا وائرس نیا نیا وارد ہوا تھا چنانچہ ہم بھی اُس کے اثراتِ بد کی لپیٹ میں آ گئے۔ کمپیوٹر سائنس ذرا نئی اور پر تجسس چیز لگی۔ تھوڑا سا رُجحان اُس جانب ہوا تو نتیجہ تسلی بخش نکلا۔ گومل یونیورسٹی ''گول مول یونس دی وستی'' سے کمپیوٹر سائنس میں ماسٹرز کیا۔ کچھ معیارِ تعلیم کی پستی، کچھ پیپرز بنانے والوں کی علمی ہستی اور کچھ ہماری مستی، اِن سب نے مل کر گل کھلایا اور باقی یار دوستوں کے ہمراہ ہم بھی کامیابیاں سمیٹتے ہوئے ایک قدم اور آگے بڑھ آئے اور باعزت طریقے سے تعلیمی دور اختتام پزیر ہوتے ہی سب اپنے اپنے مقدر کے اہداف پر پہنچ گئے۔ موجودہ صورتحال یہ ہے کہ بچپن کا دوست اور ہمسایہ فضل الرحمان اپنے والد محمد رمضان کا پیشہ سنبھال چکا ہے اور وہ ایک کامیاب عرائض نویس ہونے کے ساتھ ساتھ ماشاءاللہ تین چار بچوں کا باپ بن چکا ہے۔ باقی دوستوں میں کوئی کراچی، فیصل آباد اور اسلام آباد جا بیٹھا ہے تو کوئی اس سے بھی ہزاروں میلوں کی مسافتوں پر۔ مگر ان دوریوں اور فاصلوں نے محبتیں، چاہتیں اور بھی بڑھا دی ہیں۔ ہم سرائیکی بھی کیسے نرم دل اور بھولے لوگ ہوتے ہیں کہ اپنے شہر کے لاری اڈے تک پہنچتے ہی پردیسی بن جایا کرتے ہیں۔ بلاشبہ پردیس پردیس ہوتا ہے، چاہے ہم کراچی، پشور، لہور چلے جائیں، اسلام آباد جا بسیں یا پھر سمندر پار ہجرت کر جائیں۔

ہمارے وقتوں کے کھیل: اُس وقت لڑکے اور لڑکیوں کے کھیل زیادہ تر آؤٹ ڈور ہوا کرتے تھے لڑکیوں میں زیادہ تر ڈبلی، رسہ کشی، گیٹیاں کھیلنا یعنی ٹینس کی بال کو ہوا میں اچھال کر لکڑی کے چھوٹے چھوٹے چوکور بلاکس کو زمین سے اٹھا کر انگلیوں میں پھنسانا اور کپڑے کی بنی گڑیا کے ساتھ کھیلنے کا رواج عام تھا۔ کیوی اور چیری بلاسم کی خالی ڈبیہ میں مٹھی بھر کر فرش پر لکیریں کھینچ کر ڈبلی کھیلی جاتی، رسہ کشی کی جاتی اور سفید کپڑے کو گڑیا کی شکل میں سی کر اُس کے اندر کپاس ٹھونس کر اس سے کھیلا جاتا تھا۔ اکثر گڈی گڈے کی آپس میں شادیاں بھی کی جاتی تھیں۔ جب بارشیں روٹھ جاتیں تو بچیاں اپنی گڑیاؤں کو آگ لگاتیں اور اسے چھت کے پرنالے سے نیچے پھینک کر اوپر سے پانی بہادیا کرتیں۔ وہ سمجھتی تھیں کہ شاید اس طرح کرنے سے بارش برسنے لگے گی اور خشک سالی کا خاتمہ ہو جائے گا۔

لڑکوں کے بہت سے کھیل موسموں کے تابع تھے جیسا کہ گرمیوں میں پتنگ بازی جبکہ سردیوں میں لٹوئیوں، چدوں اور گلی ڈنڈوں کے کھیل وغیرہ۔ گرمیوں کا سیزن آتے ہی تپتی دوپہروں میں بڑے اہتمام سے ڈوروں پر مانجھے لگائے جاتے، پتنگیں اڑائی جاتیں اور آم کی گٹھلیوں سے کمندیں بنا کر خوب گڈیاں لوٹی جاتیں۔ ہر کوئی اپنی فرفری گڈی لے کر چھتوں پر چڑھ جاتا اور گڈیوں کے رنگین پیراہنوں سے آسمان سج سا جاتا تھا۔ کانچ کی گولیوں کا سیزن آتا تو رنگا رنگ قسم کے چدوں سے بھری جیبیں ایسی کھنکتیں جیسے کسی دوشیزہ کا پاؤں متحرک ہوتے ہی پازیبیں چھنک اٹھتی ہیں۔ ہاکی کا سیزن آتے ہی جسے دیکھو لکڑی کا ہکوڑ پکڑے مخالف کے گٹے توڑنے پر تلا ہوا نظر آتا تھا۔ پہاڑے نہ پکانے اور مولوی صاحب کو سبق نہ سنانے کی پاداش میں مار کھانے کیساتھ ساتھ پٹھو گرم، گلی ڈنڈا، لُک چھپ، اُچی جکی جھاہ، کانچ کی گولیاں، پتنگ بازی اور کوکلے چھپاکے کا مستانہ طواف بھی جاری رہتا۔ پٹھو گرم سب کا پسندیدہ کھیل تھا جو گلی محلوں میں کھیلا جاتا۔ گھڑوں کے ٹوٹے ٹھیکرے جمع کر کے ایک دوسرے پر رکھ کر ایک خاص فاصلے سے ٹینس کی گیند ماری جاتی۔ گیند کی ضرب سے جب ٹھیکرے بکھر جاتے تو پٹھو توڑنے والی ٹولی کا کام اُنہیں پھر سے جوڑنا ہوتا تھا جبکہ مخالف ٹولی کا کام انہیں اس کام سے باز رکھنا ہوتا تھا۔ اس کھیل کے دوران جس لڑکے کو گیند لگ جاتی وہ آؤٹ ہو جاتا تھا۔ اسی طرح لُک چھپ کا کھیل بھی نرالہ تھا جو اکثر راتوں کو گلی محلوں میں کھیلا جاتا تھا

۔ بہت سے کھیلوں کی طرح اس کھیل کو بھی شروع کرنے سے پہلے بچوں کو ایک قطار میں کھڑا کر دیا جاتا اور ایک لڑکا منصف بن کر کچھ اس طرح سے گنتی کرتا: ''اکڑ بکڑ بمبے بو، اسی نوے پورا سو، سو کا ہوٹا تتر موٹا'' اس طرح سارے لڑکے پُگ جاتے اور آخری بچ جانے والے کو سب کو ڈھونڈنا پڑتا۔ کھیل شروع ہوتے ہی ڈھونڈنے والا بچہ کہا کرتا: ''لُکن آلے لک ونجو، چھپن آلے چھپ ونجو''۔ بچے گلیوں کے کونوں کھدروں اور بعض اوقات کسی گھر میں بھی گھس جایا کرتے تھے۔ اسی طرح کو کلے چھپک بھی ایک مشہور کھیل تھا جو اکثر شام کو گروپ کی شکل میں کھیلا جاتا تھا۔ سارے بچے ایک دائرہ بنا کر اور سر گھٹنوں میں رکھ کر بیٹھ جایا کرتے۔ ایک لڑکا مفلر کو خوب بل دے کر دائرے کے گرد گھومتا اور پکارتا ''کو کلے چھپک جمعرات آئی اے، جیڑا آگے پیچھے ڈیکھے اُوندی شامت آئی اے''۔ اسی دوران وہ مفلر بیٹھے ہوئے لڑکوں میں سے کسی ایک کے پیچھے پھینک دیتا۔ اگر بیٹھا ہوا لڑکا اپنے پیچھے پڑا مفلر اٹھا نہ لیتا تو پھر واقعی اس کی شامت آجاتی تھی۔ اُن دنوں سائیکلوں کی دکانوں سے پنکچر ٹائر یا اسٹیل کا کوئی رِم لے کر اسے گلی محلوں میں گھمانا، پھرانا اور اس کے ساتھ بھاگنا بھی ایک کھیل تصور ہوتا تھا۔ ہمارے بازار میں ایک بوڑھا آدمی لکڑی کی ہتھ ریڑی پر ایک بڑا سا ڈبہ رکھ کر آتا تھا۔ لیٹر بکس سائز کے اس ڈبے میں ایک دوربین فکس تھی۔ وہ بچوں سے چار چار آنے لے کر مکہ و مدینہ کی رنگین تصاویر دکھاتا اور ساتھ میں کمنٹری بھی کرتا چلا جاتا۔ سارے بچے شوق سے وہ تصاویر دیکھا کرتے تھے۔

سردیوں کا موسم لٹونیوں کے لیے مختص ہوتا تھا۔ ہر محلے اور بازار کی بند دکان کے پھٹے پر لٹونیوں کے مقابلے ہوا کرتے تھے۔ ڈاکٹر امان اللہ کے ساتھ والی گلی جمنداں میں ایک بڑھئی کے ہاتھوں کی بنی لٹونیاں، پکھ اور لٹو کافی مشہور تھے۔ جمعہ کے دن گلی محلے کی کسی نہ کسی بند دکان کے پھٹے پر لٹونیوں کا مقابلہ دیکھنے میں آیا کرتا۔ اکثر علاقوں میں تو باقاعدہ ٹورنامنٹ کا انعقاد کیا جاتا اور جھولیاں بھر بھر کر لٹونیاں لائی جاتیں۔ دوران مقابلہ چلتی لٹونی کو ناخن دینا یا پھونک مار کر اس کی الائمنٹ درست کرنا فاؤل تصور ہوتا تھا۔ گھومتی لٹونی کو ناخن کے ہلکے سے جھٹکے سے ہتھیلی پر اچھال کر چلانے کا منظر کافی دلچسپ ہوا کرتا تھا۔ ہمارے دور میں کھانے پینے کی اشیاء بھی کافی ارزاں تھیں اسی لیے صدقہ و خیرات عام تھا۔ کبھی کبھار

جمعرات کو مسجد میں صدقے کا گوشت بانٹا جاتا۔ ہاڑ کی دسویں کو محلے بھر میں شربت پلایا جاتا اسی طرح پتنگیں اڑاتے یا کوئی سا بھی کھیل کھیلتے ہوئے اگر کوئی بچہ زخمی ہو جاتا یا موسمی بخار میں مبتلا ہو کر بیمار پڑتا تو متاثرہ گھروں میں کبھی کھیر بھت، کبھی بوڑ روٹی تو کبھی پھلے چنے بانٹے جاتے تھے۔ اس موقع پر ایک بچہ گھر کے سامنے کھڑے ہو کر صدا لگاتا: ''بالی بلوڑے کھیر بھت کھاونجو، بالی بلوڑے بوڑ روٹی کھاونجو، بالی بلوڑے چنے گھن ونجو''۔ اس طرح محلے کے بچوں میں کبھی دال ٹانگری، کبھی تلاں والی پاپڑی، کبھی چُو پڑیاں تو کبھی کبھار ان میں پیسے بھی بانٹے جاتے تھے۔ یہ شروعات کا زمانہ تھا لیکن یکا یک وقت نے کروٹ بدلی اور اَسّی کی دھائی سر پر آ پہنچی۔ سائیکل کے پرانے ٹائروں کو گلی محلوں میں بھگانے والی نسل نے باپ کی کتے چھوڑ سائیکل چرا کر قینچی سے اپنے ٹیڑھے میڑھے سفر کا آغاز کر دیا جو ڈنڈے اور مسیں بھیگتے ہی گدی تک آ پہنچا۔ یہ غالباً چھیاسی ستاسی کا دور تھا جب سارے کھیل آہستہ آہستہ آؤٹ آف فیشن ہونے لگے اور چاروں طرف وی سی آر کی سرانڈ پھیلنے لگی۔

سینما بینی اور انڈین فلمیں: اَسّی، نوے کی دھائی میں جہاں انڈین فلم انڈسٹری اپنے عروج پر تھی وہیں پاکستانی فلموں کا زوال شروع ہو چکا تھا، مگر پھر بھی سال بھر میں ایک آدھ پاکستانی فلم ضرور ہٹ ہو جایا کرتی تھی۔ تو پانوالہ گیٹ کے باہر ٹیٹلر اور پلازہ سینماؤں میں سات سے دس روپے کے حساب سے کوئی نہ کوئی اردو یا پنجابی فلم دکھائی جاتی تھی۔ جب کوئی نئی فلم شہر میں آتی تو شام کے وقت ٹانگے پر اس کے اشتہارات کو چاروں بازاروں میں پھرا کر خوب تشہیر کی جاتی تھی۔ میرے والد سینما کو بائی اسکوپ کہا کرتے تھے اور میری عمر کے لڑکوں کا بائی اسکوپ میں جا کر فلمیں دیکھنا انتہائی معیوب سمجھتے تھے لیکن میرے ماموں زاد کو سینما بینی کا بہت شوق تھا۔ ایک روز وہ مجھے بھی چوری چھپے اپنے ہمراہ سینما گھر لے گیا۔ وہاں پر ہم دونوں نے منور ظریف کی فلم ''بنارسی ٹھگ'' دیکھی۔ پہلی بار پردے پر اتنی بڑی متحرک تصویریں دیکھ کر میں حیران و ششدر رہ گیا۔ اُن دنوں کی یادوں میں مولا جٹ، چن وریام، شیر خان، چڑھدا سورج، آئینہ، دامن اور چنگاری، ہانگ کانگ کے شعلے وغیرہ شامل ہیں۔ سب سے دلچسپ امر یہ ہے کہ ان دنوں سینما پر جا کر فلمیں دیکھنے والوں کو لوفر لفنگا سمجھا جاتا تھا جبکہ گھروں میں وی سی آر لانے اور فلمیں دیکھنے پر کوئی پابندی عائد نہ تھی،

چونکہ یہ انڈین فلموں کے عروج کا دور تھا، اس لیے شہر بھر میں جا بجا ویڈیو سنٹرز کھلے ہوئے تھے جن میں سرکلر روڈ پر کروڑی اور طوبیٰ ویڈیو سنٹرز جبکہ مسلم بازار میں فخر ویڈیو سنٹر اپنی ماسٹر پرنٹ کوالٹی کی بدولت سرفہرست تھے، جہاں سے ڈیڑھ دو سو روپے میں سونی کلر ٹی وی اور جی ٹین ماڈل کے بھاری بھرکم وی سی آر سمیت تین چار عدد فلمیں کرایہ پر با آسانی مل جایا کرتی تھیں۔ کوئی امیتابھ بچن، امجد خان، امریش پوری اور راجیش کھنہ کے ڈائیلاگ تو کوئی ڈسکو ڈانسر ہیرو متھن چکروتی کے بریک ڈانس کا دیوانہ۔ ہر طرف اوئے اوئے، سکے گوئے، موگیمبو خوش ہوا کی صدائیں سنائی دیتی تھیں ۔ جسے دیکھو وی سی آر بک کروا رہا ہے۔ کوئی ریڑھے پر لادے تو کوئی سائیکل رکشے پر رنگین ٹی وی گود میں اٹھائے، پچھلی سیٹ پر وی سی آر رکھے، خاکی لفافے میں فلمیں لپیٹے اپنی منزل کی طرف رواں دواں دکھائی دیتا تھا۔ پانچ پانچ روپوں کا چندہ جمع کر کے کسی نہ کسی دوست کی بیٹھک میں خفیہ پروگرام ترتیب دیا جاتا تھا۔ اس موقع پر کوئی نہ کوئی جی دار دوست اپنی خدمات پیش کیا کرتا، چنانچہ پیسے اس کے ہاتھوں میں تھمائے جاتے اور وی سی آر ملنے کے بعد وقت مقررہ پر سارے لڑکے بیٹھک میں اکھٹے ہو جایا کرتے تھے۔ پانچ یا دس روپے کے نئے نکور نوٹ پر تھوڑا سا پرفیوم چھڑک کر سب سے پہلے وی سی آر کا ہیڈ صاف کیا جاتا، ٹریکنگ کر کے جھریاں ہٹائی جاتیں اور فلم اسٹارٹ ہوتے ہی لڑکوں میں کھسر پھسر شروع ہو جایا کرتی تھی ''اوئے اوآلی فلم گھن اے ہوے؟''۔ 'اوآلی فلم' میں نہ کوئی گیت ہوتا، نہ اسکرپٹ اور نہ ہی لڑائی مار کٹائی مگر اس کے باوجود ساؤنڈ میوٹ کر کے اسے بڑی عقیدت و احترام سے دیکھا جاتا تھا۔ ایک ہی رات میں چار پانچ فلموں سے مستفید ہونے کے بعد صبح وی سی آر کا مالک دروازہ کھٹکھٹا کر آگاہ کیا کرتا۔ براہ کرم سیٹ واپس لوٹا دیں، دوسری پارٹی کو بھی دینا ہے۔ اکثر اوقات دوسری پارٹی بھی وی سی آر کے مالک کے ہمراہ دروازے کے باہر کھڑی وی سی آر کا بے تابی سے انتظار کرتی دکھائی دیتی تھی۔

نوے کی دھائی میں ندیم سیفی اور شرون راٹھور جیسے میوزک ڈائریکٹرز کے کمبی نیشن سے سنگیت کاری، سمیر کی باکمال شاعری، گلوکار کمار سانو، ایلکا یاگنک اور اُدت نارائن کی مدھر بھری آوازوں نے فلم ہم آپ کے ہیں کون، قیامت سے قیامت تک، خوددار، یہ دل دلگی، آرزو، دھڑکن، دیوانہ، راز، قصور، اِک

رشتہ، راجہ ہندوستانی، دل ہے کہ مانتا نہیں، ہم ہیں راہی پیار کے، عاشقی، ساجن، برسات، پھول اور کانٹے، میرے جیون ساتھی، جیت، دل، دل والے دلہنیا لے جائیں گے، دل کا کیا قصور جیسی شاہکار فلموں نے تہلکا مچا دیا تھا۔ سلطان راہی کی مولا جٹ سے امیتابھ کی ایکشن فلموں تک، ایکشن فلموں سے مادھوری، عامر خان، سلمان اور شاہ رخ خان کی رومانس بھری فلموں تک اور پھر رومانس سے سنجیو کمار، شبانہ اعظمی، نصیرالدین شاہ کی آرٹ موویز تک کا سفر۔ واقعی عمر کے ساتھ ساتھ انسان اپنے جمالیاتی ذوق کو تبدیل کر کے اپنے میچور ہونے کا واضح ثبوت دیتا ہے۔ خیر یہ وہ چاہتوں بھرا زمانہ تھا کہ جس میں کچھ آرٹ فیکٹس، زندگی کی کچھ رونقیں اور علامتیں باقی تھیں، مگر سب رفتہ رفتہ ناپید ہوتی چلی گئیں اور یہ اس دور کی آخری ہچکی تھی اس کے بعد ڈش، کیبل ٹی وی آیا، بلیئرڈ متعارف ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے جوئے کی وباء پھیلنے لگی، جس کی تان پرچی جوئے پر آ کر ٹوٹی۔

کچھ عرصہ قبل جب مجھے اپنے آبائی شہر ڈیرہ جانا نصیب ہوا تو کیمرے سے کھینچی گئی گلی کوچوں کی کچھ نادر و نایاب تصاویر میں اپنے ہمراہ لیے سڈنی لوٹا۔ جب کبھی فرصت کے لمحات میں ان سحر انگیز مقامات کی تصاویر نکال کر دیکھتا ہوں تو ایسے لگتا ہے کہ جیسے یادوں کی پوٹلی میں سے کوئی سہانی یاد سر نکالے جھانک رہی ہو۔ گلی محلوں کی تصاویر نے مجھے جکڑ لیا ہو۔ بچپن کی سہانی یادوں اور ان جانی پہچانی سڑکوں اور گلی کوچوں نے جیسے مجھے پکڑ لیا ہو۔ ان مقامات پر میری زندگی کے انمول لمحات بکھرے پڑے ہیں۔ جہاں میرا بچپن گزرا، لڑکپن روٹھا، جوانی چھوٹی۔ میرے خواب آج بھی مجھے انہی دھول اڑاتے رستوں پر لیے پھرتے ہیں، شاید اس لیے کہ رخصت ہوتے وقت میں یادوں کی اس پوٹلی کو مضبوطی سے گرہ لگانا بھول گیا تھا یا پھر شاید اس لیے کہ اپنا سب کچھ وہیں چھوڑ آیا تھا۔ سب تصاویر کی اہمیت اپنی جگہ لیکن چہتر بہار کے موسم میں میلہ اسپان سے واپسی پر اپنے مسات کے ساتھ نقاش فوٹو گرافر کی دکان میں نقلی پستول ہاتھ میں پکڑے کھینچوائی گئی بلیک اینڈ وائٹ دھندلی تصویر ان سب میں نمایاں ہے، جو مجھے اکثر اپنے حصار میں لے کر پولوگراؤنڈ پہنچا دیا کرتی ہے۔ ڈیرہ شہر میں اُن دنوں ہر سال کچھ مذہبی اور چہتر بہار کی مناسبت سے کچھ ثقافتی تہوار انتہائی جوش و جذبے سے منائے جاتے تھے، مثلاً ربیع الاول کی آمد پر نبی پاکؐ کے یوم ولادت

کی خوشی میں حق نواز پارک سے میدان حافظ جمال تک پھیلا شاندار جلوس۔ بہار کی آمد پر میلہ اسپان اور بلوٹ میں میلہ ستی کیول رام کافی نمایاں تھے۔ میلہ اسپان شہر کے مشہور پولو گراؤنڈ میں منعقد کیا جاتا تھا جہاں پر موت کے کنوئیں، گھڑ دوڑ، نیزہ بازی، ریچھ کتے کی لڑائی، کشتیاں، گسنی پکڑ وائی اور کبڈی جیسی سستی اور معیاری تفریح وسیب کے باسیوں کو مہیا کی جاتی تھی۔ اس کلچرل میلے کو دیکھنے کے لیے ڈیرہ بھر کے مضافات سے حتیٰ کہ بھکر، دریا خان اور ٹانک تک سے لوگ آیا کرتے تھے۔ بہار کے دنوں میں املتاس، نیپر، چراتا کراتا اور کئی دوسری کڑوی کسیلی جڑی بوٹیاں پنساریوں کی دکانوں سے خرید کر مٹی کے پیالوں میں بھگو کر جلاب تیار کیا جاتا اور صبح سویرے نہار منہ پلایا جاتا تھا۔ ہر قسم کی ملاش، پھوڑے پھنسیوں، معدے، جگر کی گرمی، جلدی بیماریوں اور خون کو مصفیٰ کرنے کے لیے یہ بہترین گھریلو ٹوٹکا تھا۔

نام نہاد ترقی، عمارتوں کی بھرمار اور جا بجا پھیلی غلاظت، سرانڈ اور ذہنی تعفن نے ہماری روحانی ترقی، کردار سازی اور فکر و عمل پر اب ایک جمود سا طاری کر دیا ہے۔ پھٹے کے اوپر بیٹھے نائی کے سامنے اکڑوں بیٹھ کر استرے سے شیو بنوانے والے، گنے کے رس کی طرح رسیلے لوگ کہ جن کے جسموں سے سرسوں کی خوشبو اٹھا کرتی تھی اور جن کے پسینوں سے مٹی کی باس آیا کرتی تھی۔ جو روحانی طور پر تندرست و توانا تھے۔ مسجد کے صحنوں میں بچھی ترپال پر سجدہ کرنے والے وہ لوگ کہ جن میں سے کئی ایک کو نماز نہیں آتی تھی مگر سجدہ کرنا ضرور آتا تھا۔ عرصہ ہوا یہ لوگ اپنے ساتھ اپنا گلبہار کلچر، اپنی تہذیب و تمدن اور اپنی حیات کی جمع پونجی رستے میں لٹائے کسی انجانی دنیا کا رخ کر چلے ہیں۔ وہ پھولوں سے لدا شہر، وہ خواب رستے اور رستوں کی تاریکیوں پر اجالا بکھیرتی جگنو ہستیاں۔ اب ان کی جھلک عجب خان اور بشیر باطش کے فن پاروں میں ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔

ڈیرہ شہر کے دھول اڑاتے رستے، بل کھاتے گلی کوچے اور ان کے کنارے خستہ حال بھربھری اینٹوں والے سیم زدہ مکانات۔ جست کی پیٹی پر پڑا چھوٹا ٹرنک اور سلائی مشین۔ بان کی پلنگڑیاں اور کانہے کے موڑے۔ صادق کے ہاٹ ہاٹ چھولے اور نرم و ملائم پُھلکے۔ مامے مٹھو کی دکان سے چرائی گئی مولیاں اور کچریاں۔ چاچے سَدُو کی میٹھی دہی اور خالص کھویا۔ امام بخش کا ڈِکار بھرا ہاضم لیمن سوڈا۔ اللہ نواز قصائی کا

بھیڑ کے گوشت کو بکرا بنا کر بیچنا۔ کرارے دہی بھلوں کی ریڑھیاں۔ کالو کا جگر ٹھار اور مکئی کے بھٹے۔ آگ پر تڑ تڑ کرتے ڈڈے۔ بُور، مونگ پھلیاں۔ گرم پلاؤ زردا کی آوازیں لگاتا نانا پیمی۔ پپو کے امجد خان اور امیتابھ بچن کے اسٹائل میں فلم شعلے اور کالیا کے ڈائیلاگ۔ نذیر دھوبی اور نور جہان کا معاشقہ۔ فضل کبابی اور اس کی انگیٹھی پر پنکھا جھلتا گاہک۔ بغل میں بچہ دبائے ناف سے کپڑا اٹھائے چلتا پھرتا خبط الحواس شیدو۔ مائی تیلڑں کی تندوری سے اٹھتی روٹی کی مہک۔ وِشلیاں، انار دانے والی وسل پاتیاں۔ ولاں والے پراٹھے۔ مٹی کی کٹوی میں پھک پھک کرتا ساگ، سوانجناں اور لُونڑک۔ گرمیوں کی دوپہروں میں بنایا گیا ستو۔ ڈگڈی بجا کر بندر اور ریچھ کا تماشہ دکھانے والے مجمع باز۔ پٹاری میں سانپ، جیب میں گیدڑ سنگھی اور ہاتھوں میں بین اٹھائے گلی محلوں میں گھومتے پھرتے جوگی۔ ٹانگوں پر بانس باندھ کر قد لمبا کیے اور کلائیوں کے اوپر سرخ رنگ چھڑکے، آر پار چھری نکالے چلتے پھرتے شعبدہ باز۔ ہر مال دو دو روپیہ کی آوازیں۔ مٹھا سرمہ، کوڑا سرمہ بیچنے والے، منادیاں کرنے اور نقارہ بجانے والے۔ ایک دوسرے کے کندھے پر ہاتھ رکھے ''ڈے اللہ سوہنے دے ناں تے پیسہ مُتھاج کُوں'' جیسی صدائیں لگاتے نابینا فقیر۔ قدم بقدم دعاؤں کے موتی بکھیرتی محلے کی بزرگ ہستی نانی جی۔ سب کو ملکی اور غیر ملکی وقت سے آگاہ کرتا مَدُو خان۔ بچوں سے چار آنے لے کر انہیں لکڑی کی ریڑھی میں رکھی دوربین سے مکہ مدینہ کی تصاویر دکھاتا چاچا ربڑ۔ سردی سے ہانپتا کانپتا کسی کونے کھدرے میں سمٹا بیٹھا مفلوک الحال نازا پاولی۔ اپنی ہی دھن میں ہتھ ریڑھی کھینچتا گاما پانڈی۔ فلمی ولن اسلم پرویز کی نفرت اور ایکٹرس نیلو کے عشق میں پور پور ڈوبا روبوٹ چال چلتا قادو عرف قادا کرڑی۔ گھر گھر ریڑھی پر سُو کھے ٹکر، بھور، خالی ٹین اور پرانے چپل اکھٹے کرتا چاچا قادر بخش عرف کھگل۔ سر پر کانچ کی چوڑیوں کے بھاری چھبے اٹھائے ''ونگاں چڑھواؤ ونگاں'' کی صدائیں بھرتی اور اسی بہانے لڑکیوں بالیوں کی قسمتوں کی لکیروں کا حال بتاتی محنت کش عورتیں۔ مرونڈے، کھنڈ والے لچھے، لاچی دانے، دمیدے، قلفیاں، برف کی چسکیاں، رنگ برنگی غبارے، باجے اور کھٹی گولیاں بیچنے والے۔ پیڑی مچھے بُننے والے۔ برتن قلعی اور چھریاں، چاقو، قینچیاں تیز کرنے والے۔ سرسوں اور چنبیلی کے خوشبودار تیل کی شیشیاں پکڑے اپنے آرٹسٹک ہاتھوں سے دیسی مساج کے

زریعے نس نس کو ریلیکس کر دینے والے پروفیشنل ماشیے ۔گلی محلوں میں پکڑن پکڑائی ،قطار گوٹی ،پٹھو گرم،تھپ کیں ماری ھ، چوندی کیں پاتی ھ،گلی ڈنڈا،لٹونیوں اور چِدوں کے کھیل۔گھروں میں جلتے مٹی کے دِیے،موم بتیاں،لالٹینیں۔کا کے کمہار کے گھڑے، چولہے،تندور، ہانڈیاں اور مٹی کی پھیلیاں۔مٹی کی گولک میں پیسے ڈالنا،خیالوں خیالوں میں اسے گنتے رہنا اور کسی لالچی لمحے میں اسے توڑ کر سارے پیسے نکال لینا۔رات کے وقت سرکاری بلب کی زرد روشنی میں ''کوکلے چھپک'' کے کھیل۔زندگی کی چہل پہل اور رنگینیاں۔اکھڑے سیمنٹ والی بوسیدہ سیڑھیاں۔آنگن میں اترتی سرما کی نرم گرم دھوپ اور ٹھری ٹھری شامیں۔ساون میں چھتوں کے ٹپکنے کا منظر،گلی محلوں میں برسات سے محظوظ ہوتے، اچھلتے کودتے ننگے منجھے فرشتے اور مانوس گلی کوچوں کے کونوں کھدروں میں چھپا بیٹھا کپکپاتے ننگے بچوں کا معصوم بچپن۔مزے مزے کی پہیلیاں، بجھارتیں اور کہاوتیں:''ککڑ ککڑ بانگ ڈے حاجی کوں سلام ڈے،حاجی بیٹھا ماڑی تے ہتھ مریندا داڑھی تے۔مسیت وِچ پئی گیٹی مُلا چپ چاکیتی (روپیہ)۔مسیت وچ پئی گیٹی مُلا دھاڑ دھاڑ کیتی (بچھو)۔آندی ھ ویندی ھ،من مٹی دا چیندی ھ(اندھاری)۔پہاڑ دے پچھوں ککڑ کٹھا،چم کراڑا زَیرا مٹھا(تربوز)۔اُتوں لتھے ڈوں انگریز،ہک مٹھا ہک تیز(چھوٹا،بڑا پیشاب)۔اُتوں لتھے ڈوں ملنگ ساویاں ٹوپیاں، نیلے رنگ(بینگن)،ترنگڑی آندے ویندے کوں چمڑی(حقہ)،سِر بدھی بھیڑو(جھاڑو) ،کاں وے کاں پھلا ڈیندیں کہ نئیں۔ نانا گنجڑو وے گنجڑو ڈوں بیرتاں ڈے۔کا کے کوں میں لولی ڈیواں اسپرودی گولی ڈیواں''۔

کسی نے واقعی سچ کہا ہے:''بچپن کی ایک بڑی خامی ہے کہ یہ بہت جلد بیت جاتا ہے مگر اس سے بھی بڑی خرابی یہ ہے کہ جاتے جاتے ذہن ودل کے نقشے پر ان مٹ نقوش چھوڑ جاتا ہے''۔ستر اور اَسّی کی دہائی کا وہ حسین منظر نامہ کہ جب سندھ کنارے تصنع سے پاک،سادہ لوح افراد کی ایک بستی ہوا کرتی تھی اب اس کی صرف یادیں باقی رہ پائی ہیں۔

پتہ نہیں آج سڈنی کے ریسٹورنٹ میں ڈونر کباب کھاتے میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا؟۔وہ بظاہر چوڑی چکلی سڑکیں اور ان پر جھلملاتی رنگین کاریں، بلند وبالا عمارتیں اور ان کے دامن میں پینٹ کوٹ

میں ملبوس سن گلاسز لگائے، والٹ میں کریڈٹ کارڈ، کانوں میں بلیوٹوتھ ٹھونسے بلیک بیری، آئی فون، آئی پاڈ اور لیپ ٹاپ کا بوجھ اٹھائے کیڑے مکوڑوں کی طرح چلتے پھرتے ہزاروں روبوٹ۔ پیراہن کی سلوٹوں میں بدن کا لوچ لیے کھٹ کھٹ کرتی ہیل میں چھپی ایڑیوں، ننگی پنڈلیوں، کھلے شانوں، سنہری بالوں اور بیضوی چہروں پر جمی فاؤنڈیشن کے لیپ کے پیچھے مصنوعی مسکان لیے مصر کے آثارِ قدیمہ سے نکلتی ممیاں۔ شفاف فٹ پاتھوں پر دنیا و مافیہا سے بے خبر سر کو سر کے ساتھ نیہوا ڑے، کمر میں ہاتھ ڈالے راز و نیاز، سرگوشیوں اور بوس و کنار میں مصروف کسی نہ کسی بات پر سانتا کلاز کی طرح کھل کھلا کر ہنس پڑتے کشیدہ قامت سراپے۔ مکھن کے اجلے پیڑوں کی مانند ہوا میں پھریرے مارتے سی گلز، کہکشاں کے سارے رنگوں کو اپنے پروں پر لادے اڑتے پھرتے دلکش آسٹریلین طوطے اور ڈار سے بچھڑے ایک ساتھی کی تیز آواز۔ ایک طرف چلبلا، عاشقانہ، سحر انگیز، نیم خوابیدہ منظر۔ دوسری طرف روہی، تھل اور دامان کے پیاسے سینے پر دم توڑتی انسانیت۔ دو مختلف مناظر ایک ساتھ۔۔ کیسے ممکن؟ شعور کی آنکھ کھولی تو عیاں ہوا کہ آنکھ کے پردے پر دو مختلف مقامات کی فلم ایک ساتھ چل رہی تھی۔ جگہ، ملک اور حالات بدل جانے کے باوجود میں ابھی تک اپنے مخصوص دیسی ماحول سے نکل نہیں پایا۔ ایک وہی دیکھا بھالا بلیک اینڈ وائٹ منظر ہر لمحہ، ہر لحظہ غیر ارادی طور پر میری روح میں بسا رہتا ہے جتنا چاہوں اس سے چھٹکارا پانا ممکن نہیں۔ دوسرا وہ مقام جہاں پر آج میرا جسم مجھے ساتھ لیے بیٹھا ہے۔ میرا بہت بڑا مسئلہ۔۔۔ پہلے منظر کو بھلا نہیں سکتا دوسرے کو اپنا نہیں سکتا۔ جب تصنع اور تضاد کی اس پرفریب دنیا میں سچائی اور آسودگی پھیلانے کا واضح طریقہ نہیں سوجھتا تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے انسان کی ساری بدحالی کا میں اکیلا ہی ذمے دار ہوں۔

.....

طاہر شیرازی کی بیٹھک

اس بار جب مجھے اپنے آبائی شہر ڈیرہ اسماعیل خان جانے کا اتفاق ہوا تو اسے نئے اینگلز اور نئے پہلوؤں سے دیکھنے کا موقع ملا۔ خاص کر اس کی نرم و ملائم مٹی سے جنم لینے والے باکمال ادیب، صحافی، شاعر اور مصور حضرات۔ میری زندگی کا یہ پہلا موقع تھا کہ میں اپنے شہر کی فنونِ لطیفہ سے وابستہ شخصیات کو اتنے قریب سے دیکھ رہا تھا۔ سعید اختر سیال، طاہر شیرازی، کاشف رحمٰن کاشف، منیر احمد فردوس، عرفان مغل، خورشید ربانی، عبداللہ یزدانی، پیامی صاحب، عجب خان، بی اے باطش، ریشم گل، تسلیم فیروز، سید ارشاد حسین، مظہر علی تابش، حفیظ اللہ گیلانی، امجد نواز کارلو، خادم حسین، ابرار حسین، عقیل چکڑیال، عرفان لغاری، شاہجہان بھٹی اور قیصر انور وغیرہ۔ ڈیرہ کی زرخیز مٹی سے اُگے اور اس کی بنیادوں سے چمٹے یہ وہی بے لوث لوگ ہیں کہ جو جذبوں سے سرشار اپنے اپنے فن کے ذریعے اپنے امن پسند کلچر اور اپنی مٹی کی آبیاری میں مصروف عمل ہیں۔ جذبوں کے نور سے مامور یہ چہرے مجھے اتنے حسین لگے کہ ان کا عکس میں نے اپنے دل پر ہی لے لیا۔ اگر موتیوں جیسا اجلا باطن رکھنے والے ان ہنرمندوں کا ذکر نہ کیا جائے تو شاید ادھورے پن کی دیمک مجھے چاٹ جائے گی۔ سب سے پہلے میں سعید اختر سیال کا ذکر کروں گا کہ جن کے طفیل ہی مجھے اہل علم اور اہل قلم سے ملنے کا شرف حاصل ہوا۔

سعید اختر سندھ کنارے مٹھاس بھری سرائیکی بولی بولنے والوں کے ایک نمائندہ قلم کار ہیں۔ وہ ڈیرہ اسماعیل خان کا Ace ہیں۔ اُن کے اندر اپنی مٹی سے جڑا اور اپنی ماں بولی سے لپٹا ایک مضبوط ڈیرہ وال ہمیشہ موجود رہا ہے۔ اگر ان کے ذاتی اوصاف کی بات کی جائے تو وہ اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں۔ چاہے اپنا ہو یا پرایا، میں نے اس پروقار، خوش اخلاق اور شگفتہ طبیعت شاعر کو سب کے ساتھ محبت سے پیش آتے دیکھا ہے۔ اگر وہ سنجیدگی کے روپ میں ہوں تو ان جیسا فلاسفر کوئی ہو ہی نہیں سکتا، مگر کمال ہنرمندی سے وہ سنجیدگی کا لبادہ اتارنے میں دیر بھی نہیں لگاتے، بس ایک لمحہ ہی کافی ہوتا ہے اور پھر سنجیدگی کا کہیں شائبہ تک نظر نہیں آتا۔ میرے ذاتی خیال کے مطابق سعید اختر احساسات و جذبات کی ایک ایسی ڈکشنری

ہے کہ جس کے ہر صفحے پر لفظ محبت لکھا ہوا ہے اور وہ اس جادوئی اسم کے ذریعے زنگ آلود دلوں کے قفل لمحوں میں کھولنے کا ہنر جانتے ہیں۔ سعید بھائی نے بڑی محبت سے مجھے اپنی کتاب ''وِساکھ'' پیش کی۔ سرائیکی زبان میں لکھی ''وِساکھ'' ان کا دوسرا شعری مجموعہ ہے، جسے 2007 میں اکادمی ادبیات پاکستان کی جانب سے خواجہ غلام فرید ایوارڈ سے نوازا جا چکا ہے۔ اُن کی شاعری میں اپنی ثقافت کے جہاں سارے رنگ نمایاں ہیں وہیں کسی قیمتی چیز کے کھو جانے کا ملال، ہجر کے صدمے، پیار کی رنگینیاں اور امید کے دیئے بھی روشن ہیں۔ سرورق پر بنے ڈھول اور اس کی تھاپ پر ناچتے گاتے خوشیاں مناتے لوگ شاعر کی طبیعت اور اس کے باطن کی نمایاں عکاسی کرتے ہیں۔ سعید سے میری متوقع ملاقات بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوئی اس کے بعد میرے اردگرد بے شمار نئے دوستوں کی برسات ہونے لگی۔

ڈیرہ میں ٹیٹلر سینما کے پہلو میں واقع جمیل ہوٹل کو وسیب کی جنت کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ جمیل ہوٹل نے فنونِ لطیفہ سے منسلک باہنر افراد کو اپنے پہلو میں بٹھا کر ان کی تھکن اپنے اندر اتار لینے کا بیڑا اٹھایا ہوا ہے۔ وہاں چائے کے بہانے ادیب حضرات روزانہ اکٹھا ہوتے ہیں، یہیں پر طاہر شیرازی سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ جمیل ہوٹل میں پرتپاک اور والہانہ انداز سے ملنے والے طاہر سلجھے ہوئے حساس انسان لگے۔ طاہر سے ملنے کے بعد میں بھی دوسروں کی طرح اُن کی شہرہ آفاق بیٹھک کا راستہ ناپتا نظر آیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ طاہر کی لاثانی بیٹھک کا ذکر کیے بغیر ان کا تعارف تشنہ رہے گا۔ ڈیرہ کا کوئی ادیب ایسا نہیں جس نے اُن کی بیٹھک میں بیٹھ کر ان کی گدگداتی باتوں اور بھابھی کے ہاتھوں کی بنی ذائقہ دار چائے کا لطف نہ لیا ہو۔ کسی نوخیز شاعر و ادیب نے اصلاح لینی ہو، کسی نے مسودہ تیار کروانا ہو یا پھر اپنی تخلیقات پر مشورہ کرنا ہو، سب کے لئے بیٹھک کے دروازے ہمہ وقت کھلے ملتے ہیں۔ کوئی بھی شاعر، ادیب یا میرے جیسا بھولا بھٹکا بن بلایا مہمان ان کے ڈیرے پر چلا جائے تو طاہر اس کی دیکھ بھال اور کھانے پینے کا اہتمام کچھ اس طرح سے کرتے ہیں جیسے پیر شاہ عیسیٰ کا مجاور سالانہ عرس کا۔ وہ بڑی ہی اپنائیت سے مہمان کے لیے اہل خانہ کو چائے کا آرڈر دیتے ہیں۔ بیٹھک کا دروازہ کھٹاک سے بند کرتے ہیں اور تھوڑی ہی دیر میں ان کی بزلہ سنجی اور قہقہے عروج پر ہوتے ہیں۔ مجھے نہ صرف طاہر کی ادبی سرائے میں بار بار اٹھنے بیٹھنے کا

شرف حاصل ہوا بلکہ میں نے ان کے مہمان خانے کو بہت قریب سے آبزرو کیا۔ میری آبزرویشن کے مطابق طاہر کی بیٹھک ادبی اکیڈمی کا درجہ رکھتی ہے۔ چھوٹے سے چوکور کمرے پر مشتمل اس بیٹھک نے ایک اچھی خاصی لائبریری کی شکل اختیار کر رکھی ہے کہ جہاں پر شیشے کے مرصع شوکیس میں نفاست اور قرینے سے سجا ادبی کتابوں کا قیمتی ذخیرہ ان کے ذوقِ جمال کی غمازی کر رہا ہے۔ اتنی ڈھیر ساری کتابیں دیکھ کر مجھے سڈنی کی بدنامِ زمانہ ''بونڈائی بیچ'' یاد آ جاتی ہے کہ جہاں کی سنہری ریت پر ناز و ادا سے لیٹی حسینائیں سن باتھ کے بہانے دعوتِ عام دے رہی ہوتی ہیں۔ لڑکیاں ہوں یا کتابیں ان دونوں کو دیکھ کر رال ٹپکنا لازمی ہے، مگر شوکیس پر لگا نفیس سا قفل سانپ بن کر ان کے اس ادبی خزانے کی حفاظت کر رہا ہے۔ بیٹھک کے ایک کونے میں رکھے کمپیوٹر پر ڈیرہ کے ادبی اخبار ماہنامہ اکناف کی کمپوزنگ ہوتی ہے، ساتھ ہی مہدی حسن کی غزلیں اور نصرت فتح علی خان کی قوالیاں بھی گونجتی رہتی ہیں۔ بیٹھک میں داخل ہوتے ہی بالکل سامنے بجلی کی وائرنگ کے پیچھے اٹکا ایک دل چسپ تنبیہی نوٹ ''غزل سنانا منع ہے، جرمانہ 20 روپے'' توجہ طلب کر لیتا ہے۔ یہ نوٹس شاید خادم حسین جیسے بدذوقوں کے ہاتھوں تنگ آ کر مجبوراً لگایا گیا ہے۔ اپنی بیٹھک میں ہی طاہر نے مجھے اپنا شعری مجموعہ ''ماسوا'' اور سرائیکی شاعری کی تازہ کتاب ''جاتراں'' کا نسخہ گفٹ کیا۔ ان کی پہلی کتاب ''انحراف'' ملک بھر میں خاصی پذیرائی حاصل کر چکی ہے، جسے اباسین آرٹس کونسل، صوبہ سرحد کی جانب سے سردار عبدالرب نشتر ایوارڈ سے بھی نوازا جا چکا ہے۔

طاہر کی شاعری ان کی شخصیت کی طرح محدود سے لامحدود کی طرف سفر کا اعلان کرتی نظر آتی ہے۔ اس اعلان میں ان کی اپنی ذات کا آہنگ بھی شامل ہے۔ ماسوا میں نے بار بار پڑھی ہے اور اس کے بیسیوں شعر میرے دل پر نقش سے ہو گئے ہیں۔ میں کوئی حرف خاک پر لکھوں۔ جس کی تصدیق آسمان سے ہو۔ بلاشبہ طاہر کے قلم سے نکلنے کے بعد الفاظ الفاظ نہیں رہتے، جذبات و حساسات کے روپ میں ڈھل جاتے ہیں۔ ان کے اندر ایک تخلیقی اضطراب ہے جس سے آئے روز نئے نئے تخیلات جنم لیتے رہتے ہیں اور جب یہ تخیلات آسمان کو چوم کر واپس آتے ہیں تو بند مٹھی میں مشاہدات کا خزانہ سمیٹے ہوئے ہوتے ہیں۔

طاہر کے نزدیک جذبہ ہی زندگی ہے کی اساس ہے، جس سے وہ روزانہ نئی زندگی کشید کرتا رہتا ہے۔اس شعر میں جذبہ کتنی معصومیت سے سرایت کر گیا ہے۔

تھوری سی ریت ان ہاتھوں میں لے کر
سمندر پر بچھانا چاہتا ہوں

ان کے ہاں کہیں کہیں ایک بے نام سی اُداسی ہے، غیر محسوس اضطراب ہے اور نادیدہ تنہائی بھی ہے۔

بہت دن ہو گئے ہیں میرے گھر میں
عجب بے نام سی افسردگی ہے

طاہر کی شاعری ہم جیسے پردیسیوں کو نئی طاقت، ولولہ اور حوصلہ دیتی ہے۔

آدمی کا خدا بھی ہوتا ہے
یار کچھ حوصلہ بھی ہوتا ہے

طاہر کی ادبی سرائے میں ہی نفیس طبیعت نوجوان منیر احمد فردوس سے میں پہلی بار متعارف ہوا۔سنجیدہ اور متین لہجے میں بات کرنے والے منیر فردوس ایک افسانہ نگار، مزاح نگار اور خوبصورت لب و لہجے کے نظم گو شاعر ہیں۔انحراف کی تقریب رونمائی کے موضوع پر ان کی ایک دلچسپ تحریر نے ڈیرہ میں کافی دھوم مچائی تھی۔مصروفیات کے باعث اس ڈگر کی کوئی دوسری شگفتہ تحریر ابھی تک سامنے نہیں آسکی مگر حال ہی میں ان کی نثری نظموں کا مجموعہ ''زندگی چہرہ مانگتی ہے'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔جدید لہجے اور دل کو موہ لینے والے منفرد انداز کے مالک منیر فردوس کو مختصر افسانہ لکھنے پر بھی کمال حاصل ہے۔وہ جزیات نگاری اور رمز و کنائے پر بھرپور توجہ دیتے ہیں اور ان کا مشاہدہ غضب کا ہے۔منیر احمد جیسے لوگ ہی دراصل وہ حساس ترین تخلیق کار ہیں جو اپنی باریک بین نظروں سے زندگی کے وہ پہلو ہمارے سامنے لاتے ہیں جن پر ایک عام آدمی کی نظر نہیں جاتی۔اللہ تعالیٰ نے انہیں دلوں میں جھانکنے کا وصف اور بصیرت دی ہوتی ہے جو پس آئینہ دیکھنے کا ہنر رکھتی ہے۔منیر کرداروں کی روح میں اتر کر ان کی زندگیوں کے دکھ سکھ، محبتیں اور نفرتیں تخلیق کرتے ہیں۔وہ ہماری سوسائٹی کے کرب کو ایک گہرے مشاہداتی تناظر میں سوچ سمجھ کر ایک واضح

مقصدیت کے تحت لکھ رہے ہیں۔خاص کر انہوں نے اپنے ایک افسانے ''تماشہ'' میں معاشرے کے ایک اہم کردار دینو موچی کو جس خوش اسلوبی سے جاندار انداز میں پینٹ کیا ہے وہ ان کی فنی صلاحیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔اس افسانے میں ان کی دسترس کہانی کے نقطہ انجام تک مضبوط رہی ہے۔منیر میں بے پناہ ٹیلنٹ ہے اور مجھے امید ہے کہ ان کے آنے والے افسانے بہت ہی اچھے ہوں گے۔

طاہر کی سرائے نے مجھے 1990ء سے بچھڑے اپنے کلاس فیلو خورشید ربانی سے بھی ملوا دیا۔ خورشید ایک خوش گلو اور تازہ دم شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ شریف الطبع انسان بھی ہیں، وہ آج کل روزنامہ نوائے وقت اسلام آباد کے سب ایڈیٹر کے عہدے پر فائز ہیں۔ہم دونوں نے اسلامیہ ہائی سکول سے جماعت نہم اور دہم سیکشن بی میں اکھٹے پڑھنے کے بعد میٹرک کیا تھا۔خورشید سے سکول کے زمانے کی کچھ یادیں تازہ ہوئیں۔میں جب کبھی بھی اپنی یادوں کے گھوڑوں کو بیس سال پیچھے دوڑاتا ہوں تو دھند لکے میں خورشید ربانی بزمِ ادب کے پیریڈ میں کھڑا ترنم کے ساتھ اپنی غزل ''صنم کے گاؤں تم جب جانا بادل، میری دعائیں برسانا بادل'' سناتا دکھائی دیتا ہے اور سارے طالب علم اسمبلی ممبران کی طرح ڈیسک بجانے لگتے ہیں۔ بھلا کون جانتا تھا کہ اردو کے استاد جناب صادق تبسم سے چھوٹی موٹی اصلاح لینے والا منہنی سا، خاموش طبع لڑکا آگے چل کر اردو شاعری میں ایک نئی نوید لے کر ابھرے گا۔خورشید ربانی نے اپنا تازہ کلام سنایا۔ہم سب نے اسے بھرپور توجہ سے سنا۔

طاہر کی سرائے میں باقاعدگی سے حاضری دینے والوں میں ایک قابل ذکر نام کاشف رحمٰن کا بھی ہے۔'سماء' ٹی وی اسلام آباد سنٹر کے سینئر اسائنمنٹ ایڈیٹر، ق پبلی کیشنز کے روح رواں، ماہنامہ اکناف کے چیف ایڈیٹر، ادبی تقریبات کے کمپیئر کاشف رحمٰن نہ جانے اور کتنی خوبیوں کے مالک ہوں گے۔بلاشبہ ڈیرہ میں نئی نسل کے نمائندہ قلم کاروں کو ''ق پبلی کیشنز'' کے ذریعے متعارف کروانے کا سہرہ اسی نوجوان کے سر جاتا ہے۔کم گو، شرمیلا اور اپنے موبائیل کے ایس ایم ایس میں گم رہنے والا کاشف اندر سے کافی یار باش انسان نکلا۔سفرنامہ حج پر مبنی میری پہلی کتاب 'خوشبو کا سفر' کو منظر عام پر لانے میں جتنا حصہ طاہر اور سعید اختر کا ہے اتنی ہی داد و تحسین کے حقدار کاشف رحمٰن بھی ہیں۔

شدید گرمیوں کی حبس بھری راتوں میں باہر نکلنے کی ہمت کس میں ہوتی ہے۔ مجھے جمیل ہوٹل کی وہ پر رونق محفلیں ہمیشہ یاد رہیں گی کہ جب میں لوڈ شیڈنگ کے باعث حبس اور گرمی کی شدت سے بے حال ہو جاتا تو سعید کا روح افزا راحت جاں بلاوا حبس زدہ گرم ماحول میں بہار کا جھونکا ثابت ہوتا۔ پھر جمیل ہوٹل میں رات گئے تک خوب محفل جمتی۔ منیر فردوس، کاشف، اخلاق اعوان، طاہر اور سعید بھائی کے ساتھ ساتھ اور بہت سارے اہل قلم اکھٹے ہوتے اور رات گیارہ بجے تک ہم وہاں بیٹھے رہتے، اٹھنے کو بالکل جی نہیں چاہ رہا ہوتا تھا مگر پھر ہوٹل والوں پر رحم آ جاتا۔

ایک ایسے ہی گرم دن جب میں سعید بھائی کے ہمراہ تاریخی عمارات کی تصاویر اتارنے کی غرض سے روزنامہ اعتدال کے دفتر پہنچا تو وہاں چیف ایڈیٹر جناب عرفان مغل اور فاروق عادل سے ملاقات ہوئی۔ عرفان کی ذاتی کاوشوں سے روزنامہ اعتدال ڈیرہ کی مقامی صحافت میں نمایاں کردار ادا کر رہا ہے۔ خصوصاً اعتدال کے انٹرنیٹ پر آ جانے سے ہم جیسے پردیسیوں کو ہزاروں میل دور بیٹھ کر اپنے شہر کے بارے میں بھی بروقت آگاہی ملتی رہتی ہے۔ اعتدال کے دفتر میں آئے فاروق عادل ریڈیو پاکستان اور ایف ایم ڈیرہ سے منسلک ہیں۔ ڈیرہ کا یہ بانکا اور سجیلا نوجوان اپنی مسحور کن، دلکش اور خوشبو بھری مترنم آواز کے جادو کو شہر کے چاروں کونوں میں خوب بکھیر رہا ہے۔ فاروق عادل سے میری دوسری ملاقات لیاقت پارک کے عقب میں واقع ایک این جی او کے دفتر میں ہوئی۔ وہیں پر ہم دونوں نے موٹر سائیکلیں کھڑی کیں اور پیدل ہی شاہجہان بھٹی اور پیامی صاحب سے ملنے چل پڑے۔ بظاہر رعب دار نظر آنے والے بھٹی صاحب اندر سے بہت نرم خو اور جلد گھل مل جانے والے انسان نکلے۔ شاہجہان بھٹی صاحب واقعی ایک جذبے اور جنون کا نام ہیں۔ ان ہی کی انتھک کوششوں سے ڈیرہ میں انٹرنیٹ کا اجراء ممکن ہوا۔ بھٹی صاحب جیسے قوی اعصاب والے انسان ہمارے آج کل کے نوجوانوں کے لیے مشعل راہ ہیں اور ان سے بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔ شاہجہان بھٹی سے ملاقات کے بعد ہم پیامی صاحب کی طرف نکل کھڑے ہوئے۔ پیامی صاحب بڑے خلوص اور چاؤ سے ملے۔ ان کی شاعری سے شروع ہونے والی گفتگو ریڈیو، ٹی وی ڈراموں اور فلموں تک جا پہنچی۔ پیامی صاحب نے اپنی مشہور فلم ''خزانے کی تلاش'' اور فلم کے دوران

پیش آنے والے نامساعد حالات کا تفصیلاً ذکر چھیڑا، خصوصاً کیمرہ مین کے رویے سے دلبرداشتہ ہو کر انہیں مجبوراً اپنا ذاتی کیمرہ خریدنا پڑا تھا۔ پیامی صاحب کے بولنے کا انداز ایسا میٹھا کہ بات کر کے مزہ آ جائے اور ان سے مل کر دل واقعی خوش ہو جائے۔ وہیں پر ڈیرہ کے مشہور شاعر شہاب صفدر کا ذکر بھی چلا۔ شہاب صفدر اپنی منفرد شاعری کی وجہ سے ملکی سطح پر اپنی ایک الگ پہچان رکھتے ہیں۔ فاروق نے مجھے اپنی کچھ ڈاکومنٹریز بھی دکھائیں۔ کیمرے کی آنکھ سے کی گئی اتنی پروفیشنل ریکارڈنگ اور آرٹسٹک ٹچ ان کی فنی صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

سعید کی وساطت سے میری ملاقات ایک اور قابلِ فخر نوجوان خادم حسین سے بھی ہوئی۔ لگی لپٹی رکھے بغیر ہر بات منہ پر کہہ دینے والے، بدتمیزی کی حد تک بدتمیز اور سب کے بیسٹ فرینڈ خادم حسین زندگی فزیوتھراپی سنٹر کو اپنی مدد آپ کے تحت چلا رہے ہیں۔ وہاں پر میں نے اپنے مفلوک الحال غریب لوگوں کو بہت قریب سے دیکھا جو علاج کی استطاعت نہیں رکھتے ان کے لیے یہ سنٹر واقعی ایک آس اور امید بنا ہوا ہے۔ ڈی آئی خان میں معذور افراد کی فلاح و بہبود کے لئے ایک اور نجی ادارہ ''سہارا'' کے نام سے بھی کام کر رہا ہے جس کے بانی عامر سہیل صاحب ہیں افسوس کہ وقت کی تنگی کے باعث ان سے میری ملاقات نہ ہو سکی۔ ڈیرہ والوں کو خادم حسین اور عامر سہیل جیسے نوجوانوں کے سچے جذبوں کو سلام کرنا چاہئے جو اس نفسا نفسی کی دنیا میں ہمارے بے کس اور نادار طبقے کے لئے بے لوث اور بے غرض ہو کر کام کر رہے ہیں۔ زندگی فزیوتھراپی اور سہارا جیسے ادارے حقیقی معنوں میں ہماری ہمدردی، توجہ اور امداد کے مستحق ہیں۔ ڈیرہ میں بغیر کسی سرکاری سرپرستی کے اپنی مدد آپ کے تحت سرائیکی ادب کے فروغ کے لیے جتنے بہتر انداز میں کام ہو رہا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ سرائیکی ہماری مادری زبان ہے چنانچہ اس لحاظ سے ڈیرہ کے اہل قلم پر یہ بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنی مادری زبان کو زیادہ سے زیادہ فروغ دیں کیونکہ یہی زبان ہی ہمارے آپس میں رابطے کا بہترین زریعہ ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں کمپلیکس میں مبتلا لوگوں پر مشتمل ایسے طبقے کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے جو اپنی مادری زبان میں گفتگو کو سرِ شان سمجھتا ہے۔ بلاشبہ زبانیں ساری ہی خوبصورت ہوتی ہیں مگر جو لوگ کسی زبان کو حقیر سمجھ کر اس سے رشتہ ناطہ توڑ لیتے ہیں

وہ خود حقیر ہوتے ہیں۔

مسکراتے لوگ کسے اچھے نہیں لگتے، دراصل ان لوگوں سے ہی ہمیں زندگی میں توانائی ملتی رہتی ہے۔ سعید، طاہر، منیر اور ارشاد حسین شاہ کے قریب رہ کر کبھی ہنسی تلاش کرنے میں مشکل پیش نہیں آتی۔ یہ وہ خوش بخت لوگ ہیں جو ہزاروں کی دعاؤں میں رہتے ہیں اور جن سے ہر کوئی محبت کرتا ہے۔ ان سب کے لیے میری دعا ہے کہ وہ جو بھی لکھیں، جب بھی لکھیں اور جس موضوع پر بھی لکھیں خوب لکھیں اور تخلیق کے مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے لکھیں۔

وقت کی ریت مٹھی سے بنا ئر کے گرتی رہی۔ روزمرہ کے مسائل، وقت کی کمی، ان گنت جھمیلوں اور جھن جھٹوں میں بٹی زندگی۔ میرے حصے کے روز شب کو گویا پر لگ گئے۔ یار دوستوں کی سنگت میں نہ تو موسم نے ہراساں کیا اور نہ ہی شہر کے ابتر حالات اور فرقہ وارانہ حالات نے خوفزدہ کیا۔ ایک عام ڈیرے وال کی طرح ڈیرہ کی سڑکوں پر خوب سائیکل چلائی اور سرکلر روڈ پر اڑنے والی آشنا دھول مٹی سے خوب سرگوشیاں کیں کیونکہ یہی میرا ماضی اور یہی میری اصل پہچان ہے۔ وقت گزرنے کا اندازہ اس وقت ہوا جب روانگی کا دن آ پہنچا۔ میں صرف دو ماہ کی قلیل مدت کے لیے ڈیرہ آیا تھا جس کا بیشتر حصہ اپنے گلی محلوں میں گھومتے پھرتے جبکہ باقی وقت عظیم ڈیرہ والوں سے ملنے ملانے میں گزرا۔ میں خالی ہاتھ ڈیرہ آیا تھا مگر پیار اور خلوص کی دولت سے مالا مال ہو کر واپس لوٹا۔

.....

ڈیرے کی گرمیاں اور ڈولتی پتنگیں

کسی فلسفی کا قول ہے کہ: ''وقت چاہے ہمیں کتنا بھی بدل ڈالے، لیکن وہ ہمارے دلوں پر لکھی تحریر کو کبھی نہیں بدل سکتا''۔ سیف گارڈ، اوپل، ٹیولپ ٹشوز، انٹرنیٹ، کیبل اور بلیک بیری موبائیل جیسی جدید ٹیکنالوجی کے دور میں پیدا ہونے والی ینگ جنریشن کے سامنے یہ انکشاف شاید حیرت کا باعث ہو کہ سندھ کنارے بسے پرامن اور پرشکوہ شہر ڈیرہ اسماعیل خان کی بھی کبھی ایک نرالی شان ہوا کرتی تھی۔ میر اتعلق چونکہ اَسّی کی دہائی کی اُسی خوش قسمت نسل سے ہے کہ جس نے اپنی بھیگتی مسوں کے ساتھ ڈیرہ اور اس کے مٹھاس بھرے رنگا بر نگے کلچر کو انتہائی قریب سے دیکھا تھا۔ یہ وہ دور تھا کہ جب شہر چھوٹا ہونے کے باوجود اپنے فراخ سینے میں ہر طرف سے آنے والوں کو سمیٹنے میں مگن تھا۔ ڈیرہ والوں کی زندہ دلی اور شہر کے امن وامان کا یہ عالم تھا کہ رات گئے تک اس کی رونقیں بحال رہا کرتیں، خصوصاً تو پانوالہ گیٹ کا درجہ لاہور کی مشہور مال روڈ سے کم نہ تھا۔ جہاں پلازہ اور ٹیٹلر سینما ئیں نوجوان طبقے کی اعلیٰ تفریح گاہیں تصور ہوتی تھیں وہیں دامن میں جمیل ہوٹل کا پررونق ماحول ایک عجیب قسم کا سماں باندھ دیا کرتا تھا۔ کوئی ٹولیوں کی صورت میں تو کوئی تن تنہا بے خوف وخطر تو پانوالہ بازار میں گھوم پھر رہا ہوتا۔ کوئی دریا سے واپس آرہا ہوتا، کوئی انڈہ پراٹھا کھانے نکل کھڑا ہوتا تو کوئی رات کا آخری شو دیکھ کر گھروں کو واپس لوٹ رہا ہوتا تھا۔

اُس وقت کے ڈیرہ کے موسم گرما کا بھی اپنا ایک الگ لطف ہوا کرتا تھا۔ اوائل جون کے تپتے دنوں میں بپھرے سندھو کا سینہ چاک ہوتے ہی سندھ کنارے بسے اس روشن شہر پر نیا جوبن، نئی جوانی

آ جاتی تھی اور دور تک پھیلی ہریالی اور پھولی سرسوں بدلتے موسم کا سندیسہ دیتی خوشگوار آہٹ کے ساتھ ہی چہار سو خوشیوں کے رنگ بکھر جایا کرتے تھے۔ جہاں مئی، جون کی گرمی میں کیوڑے کی خوشبو اعصاب کی الجھی گتھیوں کو دھیرے سے کھولنے لگتی، وہیں ہر طرف بڑے میاں کی قلفیاں، ٹھنڈا فالودہ، برف کے گولے چسکیاں، گڈ گڈ کی آئسکریم اور لیمن سوڈے کے چرچے زبانِ زدِ عام ہونے لگتے تھے۔ کہیں تخم بلنگو کے سیاہ بیج برف میں لپٹے یخ بستہ شربت میں ہلکورے کھا رہے ہوتے، کہیں ستو گھول کر پیا جاتا تو کہیں بادام گھوٹ کر اس کی ٹھنڈائی کے گھونٹ بھر کر نس نس میں اتارے جاتے تھے۔ اس وقت کی روایت کے مطابق ہاڑ کی دسویں کو گڑ اور شکر کا شربت بنا کر گلی محلوں میں لوگوں کو پلایا جاتا تھا۔ موسم گرما میں مٹھڑی دھرتی پر پیدا ہونے والے مٹھاس بھرے پھلوں کی بھی کیا بات ہوا کرتی تھی، کہیں منکیرہ اور کلاچی کے خربوزوں کی بھری ہتھ ریڑھیوں والوں کے ہُوکے 'لُڑ گے کلاچی آ گے دمان'، کہیں انور لٹور اور لنگڑے آم کی صدائیں، کہیں ڈھکی کی کھجوریں اور کچے پکے ڈوکوں کے تذکرے تو کہیں ہر طرف لیہ کے میٹھے تربوزوں کے ڈھیر دکھائی دیا کرتے تھے۔ کہیں گرمی کی شدت سے نالاں منچلوں کی ٹولیاں ٹیوب اور جست کے کدو ساتھ لیے دھاونی کی نیت سے دریا کی طرف گامزن تو کوئی پہاڑ پور نہر کو دریا بنائے اس میں غوطہ زن دکھائی دیتا تھا۔

1980ء کے عشرے میں گرما رت چھاتے ہی سرائیکی وسیب کے دوسرے علاقوں کی طرح ڈیرہ میں بھی پتنگ سازی اور پتنگ بازی کا آغاز ہو جایا کرتا تھا۔ پاکستان کے باقی ماندہ شہروں کے برعکس ڈیرہ میں پتنگ بازی صرف گرمیوں میں ہوا کرتی تھی۔ موسم کی تمازت میں شدت آتے ہی گرمیوں کی چھٹیوں کا اعلان کر دیا جاتا اور پھر چھٹیوں کا بیشتر عرصہ پتنگ بازی کی نذر ہو جاتا، گو کہ گھر والوں کی نظر میں یہ وقت کا ضیاع تھا اسی لیے پتنگیں اڑانے کی بھرپور مخالفت کی جاتی تھی لیکن اس کے باوجود ہمارے دل و دماغ پر تین ماہ تک اس کا غلبہ رہتا اور دن رات ذہن پر مانجھا، ڈور، چرخی اور پتنگیں چھائی رہتی تھیں۔ یہ موسم گرما میں اس وقت کی نسل کی واحد آؤٹ ڈور تفریح ہوا کرتی تھی۔

اَسّی کی دہائی میں ڈیرہ شہر میں پتنگ بازی کے ساتھ پتنگ سازی بھی اپنے عروج پر تھی۔ اگرچہ اس وقت ڈیرہ بھر میں پتنگیں بنانے کے اِکا دُکا کاریگر تھے، جیسے محلّہ عیسب زئی کے ایک گھر میں زبردست

سُودی فرفری گڈیاں تیار کی جاتی تھیں، اسی طرح تھانے والی گلی کے سامنے انور گڈی فروش اور قریشی برادرز (نزد پانچ رنگ لائبریری، مسلم بازار) زیادہ مشہور تھے، جہاں سے ایک اور دو پنوں والے شاندار فینسی لغڑ اور فرفری گڈیاں مناسب داموں ملتی تھیں۔ انور گڈی فروش کے آرٹسٹک ہاتھوں سے مختلف رنگوں اور سائزوں کی بنی پتنگیں معیار اور کوالٹی میں اپنی مثال آپ تھیں۔ وہ کھجور کے خوشوں کو بڑی مہارت سے تیز دھار چاقو کی مدد سے کاٹ کر کانہیں تراشتا اور اس بات کا خصوصی خیال رکھتا کہ پتنگ کم سے کم وزنی ہو تاکہ دائیں بائیں جھول نہ مارنے پائے۔ ہم اکثر چھپ چھپا کر پتنگیں گھر لے کر آتے اور پھر چھتوں پر دوڑ لگا دیتے تھے۔ جہاں تک ڈور کی بات ہے تو اس وقت محلّہ بموں شاہ کے علاقے میں صابر عرف صابے گُڈے کی تیز دھار ڈور کی بڑی مانگ تھی جسے مہنگے داموں خریدا جاتا، مگر ڈیرہ میں اُن دنوں کئی شوقین پتنگ باز ڈور خریدنے کی بجائے خود سے مانجھا لگانے کو ترجیح دیا کرتے تھے، چونکہ یہ ایک ٹیم ورک تھا اسی لیے اس مقصد کی خاطر مل جل کر مانجھا لگانے کے پروگرام ترتیب دیئے جاتے اور پروفیشنل پتنگ بازوں سے اس ضمن میں خوب مشورے لیے جاتے تھے۔ کون سا کانچ اور دھاگہ مانجھا لگانے کے لیے مفید ہوگا اور اس کا طریقہ کار کیا ہوگا؟۔ اس وقت کے مستند پتنگ باز مانجھا لگانے کے لیے لمبے چوڑے نسخے بنا کر دیتے، ان میں وہ اجزاء بھی شامل ہوتے جو پنساریوں کے پاس دستیاب نہ ہوتے تھے، بہرحال اس پراجیکٹ کی تکمیل کے لیے بڑے اہتمام اور جذبے سے پیسے اکھٹے کیے جاتے اور پھر اصلی پری کے دھاگے والی نلکیاں یا پھر اس سے بھی اعلیٰ کوالٹی والے گوٹے، سریش اور کانچ اکھٹا کیا جاتا تھا۔ پروفیشنل پتنگ باز تلقین کرتے کہ پسا ہوا کانچ ڈور لگانے کے لیے سب سے اہم جزو ہوتا ہے، اگر کانچ ٹھیک طریقے سے پسا نہیں ہوگا تو وہ ڈور پر اچھی طرح نہیں چپکے گا اور ڈور کی کوالٹی افیکٹ ہوگی، ویسے تو دیگر اجزاء کی طرح پسا ہوا کانچ بھی منیاری کی دکان سے مل جاتا تھا، لیکن اُس وقت یہ بات مشہور تھی کہ بازاری کانچ میں آٹا ملا ہوتا ہے۔ کانچ کوٹنا ایک نازک ترین مرحلہ ہوتا تھا جس کے لئے کوئی اپنے گھر سے امام دستہ چرا کر لے آتا، کوئی ململ کا بوچھن تو کوئی فیوز بلب، ٹوٹی بوتلیں اور سرکاری کھمبوں پر لگے گلوب چرا کر لے آتا تھا۔ ایک لڑکا کپڑے کی بکل مار کر شیشہ کوٹنے میں لگ جاتا، جسے بوقت ضرورت ململ کے کپڑے کی چھلنی بنا کر خوب چھانا جاتا تھا۔

اس نازک مرحلے میں امام دستے کی آواز سن کر اکثر گھر والے چھاپہ مار کر سارا سامان ضبط کر لیا کرتے اور پوری ٹیم کی حسبِ توفیق خوب ٹھکائی ہوتی تھی۔ اکثر مائیں جل کر کہتیں: ''وے شالا ہاں دی چُونڈی لگی، اِیندے وِچ میں لاچیاں کُٹیندی ھاں، تے تُوں اِیندے وِچ کچ کُٹیندا بیٹھیں، تیں میڈا ململ دا بوچھن وِی لیر ولیر کر دِتے''۔ بھلا کوئی عشق اور شوق پر بھی کوئی پابندی لگا سکا؟۔ چنانچہ اگلے دن تمام اشیاء بازیاب کروانے کے بعد کسی اور محفوظ مقام کا انتخاب کیا جاتا اور بلاخوف وخطر کانچ کوٹا جاتا اور پسے ہوئے کانچ کا پاؤڈر، جست کا خالی ڈبہ، سریش، رنگ اور دھاگے کے گوٹے ساتھ میں لیے بڑی اہتمام کے ساتھ تپتی دوپہروں میں خوب مانجھا لگایا جاتا تھا۔ اُن دنوں قلعہ روڈ، بجلی گھر روڈ، اسلامیہ سکول کا میدان اور سرکلر روڈ خصوصاً گرلز کالج، جلال پارک اور حق نواز پارک کے سامنے مانجھے لگائے جاتے تھے۔ سریش کو ابلتے پانی میں پگھلایا جاتا اور پھر گاڑھا ہونے پر اس میں رنگ اور باریک پسا ہوا کانچ ڈال دیا جاتا تھا، پھر گاڑھے سیال گرم مادے میں دھاگے کی نلکی خوب ڈبو کر تہہ دار سوتی کپڑے پر بھی کانچ کا پاؤڈر پھیلا کر اس کے اندر ڈور کو رکھ کر اسے ایک مقام سے دوسرے مقام تک کھینچ تان کر لٹکایا جاتا، وقفے وقفے سے ڈور کی کوالٹی کا جائزہ بھی لیا جاتا اور خشک ہوتے ہی اس کے پنے بنائے جاتے یا پھر اُسے چرخیوں پر لپیٹ کر اسٹیک ہولڈرز کے بیچ برابر تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ جس دن کسی نے نیا مانجھا لگایا ہوتا اس دن وہ اپنے گھر کی چھت پر کھڑے ہو کر مخالف پتنگ باز کو کچھ اس طرح للکارتا: ''اوئے تیں بہوں میڈیاں گڈیاں کپن، آ وَت، زرا پیچا لڑاؤں ہا''، مخالف پارٹی کو پتہ چل چکا ہوتا کہ آج نیا مانجھا لگایا گیا ہے اسی لیے وہ جواب دیتا: ''نئیں لالہ تیڈی نویں تندھ ہے''۔ یہ بات سنتے ہی فوراً طعنہ دیا جاتا: ''چھے بھیڈ بن گیں''۔ اچھا اے گال ہے تاں آ وَت۔ اس طرح خار پخار میں مقابلہ عروج پر پہنچ جایا کرتا تھا۔

میں اکثر اپنی چھت پھلانگ کر اپنے دوست فضل الرحمان کی چھت پر پہنچ جاتا اور پھر ہم دونوں چھت کے ساتھ ملحقہ بلند ماڑی پر چڑھ جاتے۔ اس وقت چونکہ آٹو رکشہ ناپید تھا، موٹر سائیکل بھی چند ایک کے پاس تھی، اسی لیے فضا دھلی دھلائی اور کثافتوں سے پاک ہوا کرتی تھی۔ بلندی پر کھڑے ہو کر جہاں جنوب کی سمت چونگلہ اور اس سے بھی کہیں آگے مریالی ٹاور صاف دکھائی دیتا وہیں مشرقی جانب مسجد لاٹو

فقیر کے گنبد بھی نظر آتے تھے۔تپتی دوپہروں میں دہکتے،شعلہ اگلتے سورج کی تمام تر حدتوں کے نیچے پسینے سے شرابور لال بھبھوکا چہرہ لیے گڈیاں اڑاتے اڑاتے پسینہ ایڑیوں تک آجاتا اور اکثر ہاتھ شل ہو جایا کرتے تھے لیکن جو مزہ ،فیلنگز اور ایکسائٹمنٹ اس وقت ہوا کرتی تھی وہ بیان سے باہر ہے۔دھوپ کی تمازت کم ہوتے ہی پروفیشنل پتنگ باز اپنی رنگین چرخیاں اور ہیوی ویٹ لغڑ سنبھالے چھتوں پر آجاتے اور پھر مختلف سائزوں کی رنگا رنگ پتنگوں اور گڈیوں کے رنگین پیراہنوں سے آسمان سج جاتا تھا۔اس وقت کے مستند پتنگ باز پتنگ اڑانے ،اسے فضا میں معلق رکھنے اور پیچا لڑانے کے فن میں یکتا تھے مثلاً پیچا مخالف پتنگ کے اوپر ڈالنا ہے یا نیچے؟ ڈور کو کتنی ڈھیل دینی ہے اور کس مقام پر آکر جھٹکا دینا ہے؟۔مانے ہوئے پتنگ بازوں کے آتے ہی نوآموز اپنی پتنگیں اتار کر بیٹھ جایا کرتے ، جو پتنگ نہیں اتارتا اسے اپنی پتنگ سے ہاتھ دھونا پڑتے تھے مستند پتنگ باز کھینچا دے کر پتنگیں کاٹنے والوں سے پیچا لڑانے کی بجائے اصول و ضوابط کی پیروی کرنے والوں کے ساتھ پیچا لڑایا کرتے تھے،اگر کوئی نوآموز ان کے ساتھ پیچا لڑانے کی کوشش کرتا تو وہ دور سے آواز لگاتے:''اوئے کاکا آپڑی گڈی لہا چا،سیڈے نال پیچا لڑاون تیڈے وس دا کم نیں''۔اس طرح انتہائی جذباتی انداز میں ایک دوسرے کو للکار کر پیچے لگائے جاتے اور جب کسی حریف کا پتنگ کٹ جاتا تو چل ویندا،رکھ تے ویندا کی صدائیں ہوا میں گردش کر رہی ہوتی تھیں۔

پتنگ اڑانے اور پیچا لگانے والوں کے علاوہ ایک تیسرا طبقہ بھی تھا جو پتنگ خریدنے کی سکت نہ رکھنے کے باعث ہاتھوں میں لمبا بانس پکڑے یاس وحسرت سے آسمان کی طرف ٹکٹکی باندھے کسی کٹی پتنگ کا منتظر دکھائی دیا کرتا اور اکثر پتنگ ہاتھ نہ لگنے کی صورت میں ڈور لوٹنے پر ہی اکتفا کر لیا کرتا تھا۔لوٹی ہوئی ڈور کو ایک تیلے پر پنّے کی شکل میں لپیٹا جاتا ، یہ رنگا رنگ پِنا مختلف ڈوروں کا مجموعہ ہوا کرتا تھا۔اسی طرح ایک اور طبقہ کمند بازوں کا بھی تھا جو اکثر آم کی گٹھلیاں ڈور سے باندھ کر کمندیں بناتا اور پتنگ باز کی تنبیہہ کو نظر انداز کر کے اس کی گڈی پر اچھال کر پتنگ اور ڈور لوٹ لیا کرتا تھا،ردعمل میں پتنگ باز طیش میں آکر کسی اونچی جگہ پر کھڑے ہو کر اس پر پتھروں کی بارش برساتا اور ساتھ میں اسے کہتا:''بچہ توں اج گھر کو ل باہر نکل، میں تیکوں ڈیکھساں''اور واقعی جب کمند باز کا گلی محلے میں اس پتنگ باز سے آمنا سامنا ہوتا تو

اس کی گردن دبوچی جاتی اور کہا جاتا: ''ناں اوئے ب۔۔دا نول ،تُوں ہٹے ویلے میڈی تندھ تے کمند اکیوں سٹیندیں،اج میں تیکوں نہ چھڑیساں'' ۔اس طرح کمند باز کی خوب پٹائی کی جاتی جس کے باعث وہ کمند بازی کے مکروہ عمل سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تائب ہوجایا کرتا تھا۔

المختصر موسم گرما کے پورے سیزن میں خوب پتنگیں اڑائی جاتی تھیں، یہاں تک کہ کسی حبس زدہ دوپہر میں آنے والی آندھی اور تیز ہوا میں بھی چھٹی کرنے کی بجائے، پتنگ کی نچلی کانہہ پر سوتی کپڑے کی ایک لمبی دم (پُونچھ) باندھ کر اسے اڑایا جاتا تھا۔ کپڑے کی لمبی دم لگانے سے پتنگ کو تیز ہوا میں ایک مخصوص ردھم مل جایا کرتا تھا۔اس کے علاوہ پتنگوں کے ساتھ رنگ برنگے چڑول باندھ کر بھی اڑانے کا رواج عام تھا۔دھوپ کی تمازت پیچھے پلٹتے ہی جون جولائی کی پگھلتی گرمی جب آہستگی سے ہلکی خنکی میں بدلنے لگتی تب گڈیاں اتار کر بڑے لغڑوں کے ساتھ چڑول باندھ کر اڑائے جاتے تھے۔سرمئی آسمان پر نیلے، پیلے،سرخ وسبز رنگت چڑول ٹمٹماتے دیے کی مانند نظر آتے تھے۔اس منظر میں ایک عجیب قسم کی پر اسراریت اور کشش ہوا کرتی جو دیکھنے والوں کو حیران کیے رکھتی اور جسے دیکھتے دیکھتے دل نہیں بھرتا تھا۔ اگست کے اوائل میں پتنگ بازی کی شدت میں کمی آنا شروع ہوجاتی اور آخری ہفتے تک آسمان پر اِکا دُکا پتنگیں اڑتی دکھائی دیا کرتی تھیں۔گرما کی چھٹیوں کے آخری دو ہفتوں میں سکول کے بستے کونے کھدروں سے دریافت کر کے خوب جھاڑے جاتے اور پتنگ باز گرمیوں کی چھٹیوں کے کام میں جُت جایا کرتے تھے ،اس طرح پتنگ بازی کا سیزن اختتام پزیر ہوجاتا تھا۔

یہ اَسّی کی دہائی کی ایک تاریخی جھلک تھی،کوئی کہانی یا افسانہ نہ تھا۔کہانی اور تاریخ میں واضح فرق یہی ہوتا ہے کہ کہانی میں کردار فرضی ہوتے ہیں جبکہ تاریخ میں کردار، تاریخ، نام اور مقام اپنی اصل سے جڑے ہوتے ہیں۔ یہ ڈیرہ کی اس دور کی تاریخ ہے جس میں اڑتی پتنگ زندگی کی علامت ہوا کرتی تھی،اگرچہ اس وقت سماج دشمن ضیائی اور سیاسی قوت کی بھوکی مُلّائی طاقتیں پاکستان خصوصاً سرائیکی وسیب پر قبضہ جمانے کے منصوبے بنانے میں مگن تھیں۔کہیں راکھ میں دبی چنگاری کو فرقہ واریت کے پنکھوں سے ہوا دے کر سلگایا جارہا تھا تو کہیں شہر کی خوبصورتی اور ثقافتی حسن کو پامال کرنے کا قبیح عمل اندرون خانہ شروع

ہو چکا تھا جس کے باعث ثقافتی خوبصورتیوں سے مالا مال شہر ڈیرہ کا ڈاؤن فال شروع ہو چکا تھا۔ یہ ڈیرہ اسماعیل خان کے پرامن سنہری دور کی وہ آخری ہچکی تھی جو اُس وقت کی نسل کے شانوں پر آئی اور پھر تاریخ کا حصہ بن گئی۔

.....

اُف ڈیرے کی سردی

موسم کسی ماہر مصور کی طرح ہماری زندگی کے منظر نامے میں رنگ بھرتا رہتا ہے۔ موسم بدلتا ہے تو زندگی کے رنگ ڈھنگ اور انداز بھی بدلنے لگتے ہیں۔ سردی، گرمی، خزاں، بہار، برسات غرض ہر موسم کا اپنا ایک الگ لطف، الگ مزہ ہوتا ہے۔ ہم سب موسموں کے اسیر ہیں۔ جہاں تک موسم سرما کا تعلق ہے تو یہ اپنے ساتھ ایک منفرد انداز اور نرالہ نشہ لیے وارد ہوتا ہے۔ سردیوں میں برسنے والی بارشوں کی رم جھم در و دیوار کو نم کرنے کے ساتھ ساتھ ٹھنڈی برفانی لہروں کو بھی رگ و پے میں اتار دیتی ہے۔ سردی جب اپنے پورے جوبن پر ہوتی ہے تو زندگی کی ہر سرگرمی ٹھٹھر کر رہ جاتی ہے اور ہر چیز کو جمود آ جاتا ہے۔ بھیگی بھیگی ٹھنڈی ٹھنڈی سرما رُت میں چلنے والی یخ بستہ، کہر آلود ہوائیں، خزاں رسیدہ ٹنڈ منڈ درختوں کے نیچے بکھرے چرمر کرتے سوکھے پتے، دریا کے سکوت کا مزہ اور تو اور پنچھیوں تک کی اڑانیں بدل جاتی ہیں۔ سردی کے موسم میں صبح صبح کسل مندی سے گرم لحاف اور بستر چھوڑنا، دہکتے کوئلوں کی انگیٹھی کے سامنے بیٹھ کر آگ تاپتے ہوئے گرما گرم چائے کی چسکیاں لینا، انڈے کھانا، سبز چائے پینا۔ کیا بات ہے بھئی سردی کی۔

سرد موسم کے حوالے سے جب بات ڈیرہ کی خشک سردی کی ہو تو کوئی مانے یا نہ مانے یہ حقیقت

ہے کہ ڈیرہ شہر میں سردی وارد ہوتے ہی اس کے باسیوں کے عمومی مزاج اور ان کے روزمرہ معمولات کو یکسر بدل کر رکھ دیتی ہے۔ڈیرہ میں اس کی آمد کا انداز کافی نرالہ ہوتا ہے۔مثلاً جب بھیڈ مسات سائیکل رکشہ چھوڑ کر آلو موٹھ بیچنا شروع کر دے۔''سَم پو'' میلی شلوار کے نیچے ایک اور رنگین شلورا پہن لے۔ شیدو برف بیچنے کی بجائے زندہ برائیلر بیچنے لگ جائے۔ملک بشیرو کا مست اور اڑیل کھوتا اطاعت گزار بن جائے۔اختر طوفان بُگل مار کر سائیکل پر روڈ ماسٹری کرنے لگے۔حاجی غضب دھوتی اتار کر گرم شلوار پہن لے۔بچوں سے لے کر بوڑھے حتیٰ کہ ڈاکٹر اور حکیم تک کھانسنے لگ جائیں۔جست کی پیٹی کھول کر اس کے اندر پڑے لحافوں،کمبلوں اور رضائیوں کو باہر نکال کر دھوپ لگوائی جانے لگے۔چاچا کالو مکئی کے بھٹوں کی بجائے گاجروں کا جگر ٹھار بیچنے لگے۔گڈ گڈ اپنے آئس کریم کے قُلف چھپا کر سوہن حلوہ باہر لے آئے۔ملک کھیری دہی کی بجائے کھویا بنانا شروع کر دے۔بڑے میاں اپنی قلفیوں کی ریڑھی کو کھبے سے باندھ کر اپنے عزیز و اقارب سے ملنے ہندوستان کا رخ کر جائیں۔کاکے کمہار کے گھڑے اور مٹی کے ٹھنڈے پیالے بکنا بند ہو جائیں۔دریا کے سوکھنے پر پاوندہ مٹی اور ریت ڈھونا شروع کر دے۔ٹھٹھرتی سرد آلود سحر میں مولوی صاحب خود مؤذن،مقتدی اور خود ہی امام بن جائے۔آگ تاپتے پہرہ داروں کی عدم دلچسپی سے چوریوں اور وارداتوں میں اضافہ ہو جائے۔سرور پنساری کی دکان پر جوشاندہ ختم ہو جائے۔گرم حلیم اور یخنی کی جا بجا ریڑھیاں لگ جائیں۔کہر آلود اور برفانی راتوں میں سارے ضرر رساں موذی جانور اپنے اپنے بلوں میں جبکہ انسان سر شام اپنے کمبلوں اور رضائیوں میں جا گھسیں۔سنسان و بیابان سڑکوں اور گلیوں میں آوارہ کتوں،چوکیداروں اور پولیس کا راج ہو جائے تو سمجھ لیں ڈیرہ میں سردی کا آغاز ہو چکا۔

سردیوں کا موسم چاہے کیسا بھی ہو انسان کو شائستہ اور مہذب ضرور بنا دیتا ہے۔ہر دوسرا آدمی اپنے دونوں ہاتھ باندھے رکوع کی صورت میں تعظیماً کھڑا شارٹ ہینڈ میں بات کرتا نظر آتا ہے۔ایسے موسم میں ایک اچھا خاصا انسان بھی فلسفی بن جاتا ہے کیونکہ کرنے کو کچھ نہیں مگر سوچنے اور دیکھنے کو بہت کچھ ہوتا ہے۔بقول ایک آلس کی پَنڈ کے:''ٹھٹھرتی سردیوں کے کپکپاتے دنوں میں جب لحاف کے اندر پڑا

سوئے سوئے اکتا جاتا ہوں تو تھوڑی دیر کے لیے اٹھ کر اور سکون سے بیٹھ کر آرام کر لیتا ہوں''۔

سردیوں کی برفانی راتوں میں اکثر چوکیدار محلے میں ''جاگدے راؤ'' کی آوازیں لگاتے پائے جاتے ہیں۔ بندہ ان سے پوچھے کہ اگر ہمیں ہی جاگتے رہنا ہے تو ساری رات کیا تمہیں آگ سینکنے اور بھنگ گھوٹنے کے لیے رکھا ہوا ہے۔ڈیرہ شہر میں چھائی یخ بستہ کہر آلود اندھیرے کی بُکل سے روشنی کی پہلی کرن جاگتے ہی شہر کی زندگی آہستہ آہستہ بیدار ہونا شروع ہو جاتی ہے۔دھند لکے میں ہی بیکری اور چائے کی دکانیں کھلنا شروع ہو جاتی ہیں۔گرم چادروں میں منہ لپیٹے سائیکلوں پر منوں وزنی دودھ کے کنٹینرز لادے پیڈل مارتے، منہ سے بھاپ اڑاتے گوالے اپنی اپنی منزل کی طرف رواں دواں نظر آتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ سبزی فروش سائیکل ریڑھوں پر مولی، گاجر، شلجم اٹھائے سبزی منڈی سے واپس آتے دکھائی دیتے ہیں۔کہر کے چھٹتے اور گھروں کے آنگن میں ہلکی دھوپ پھیلتے ہی ڈیرے وال نیند سے بیدار ہو کر اکثر یہ دعا مانگتے ہیں: ''یا اللہ! کیں نیک بندے دے متھے لاویں''۔کہیں ٹین میں پانی گرم ہو رہا ہوتا ہے تو کہیں کسی بچے کو جبراً نہلایا جا رہا ہوتا ہے۔کہیں انڈے ابالے جا رہے ہوتے ہیں تو کسی گھر سے گرما گرم پراٹھوں کی سوندھی خوشبو اڑوس پڑوس کو مہکا رہی ہوتی ہے۔ دن روشن ہوتے ہی گلی محلوں کی گہما گہمی اور رونق میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ایک طرف گرم پوشاکوں، حسین و رنگین ٹوپیوں، رنگارنگ سوئیٹروں، موزوں میں لپٹ سمٹ کر کانپتے لبوں اور سوں سوں کرتی ناکوں کے ساتھ سکول کو جاتے بچے دکھائی دیتے ہیں تو دوسری طرف حاجی کریم بخش کی کھٹارا موٹر سائیکل پھڑ پھڑ کی آواز میں کھانستی ہوئی مست گدھے کی مانند سڑک کے بیچ ٹس سے مس نہ ہونے والی ادا لیے کھڑی نظر آتی ہے۔

دن چڑھتے ہی ہتھ ریڑھیوں پر چھولے چاول، حلیم، سنگترہ، کینو، سیب اور پھل فروٹ بیچنے والوں کی مترنم آوازوں سے گلی محلے گونج اٹھتے ہیں۔ بڑی بوڑھیاں اور خانہ دار خواتین دھوپ سینکنے کے بہانے ساگ، پالک، گوبھی، مولی، شلجم اور گاجریں اٹھائے چھتوں پر پہنچ جاتی ہیں۔ دل جمعی سے ساگ صاف کر کے اُسے سوکھنے کیلئے چھتوں پر پھیلا دیا جاتا جسے گرمیوں میں استعمال میں لایا جاتا ہے، جبکہ کچھ ساگ کو چھری سے خوب چاپ کر کے دھویا جاتا ہے جو سارا دن ہلکی آنچ پر مٹی کی کٹوی میں پکتا رہتا

ہے۔ کچھ گھروں میں پیاز، آلو اور گاجروں کا اچار بھی ڈالا جاتا ہے۔ روزمرہ کے گھریلو کام سے فراغت پاتے ہی ٹوکری سے اون کے نرم گولے اور سلائیاں نکال کر سویٹر کی بنائی شروع کر دی جاتی ہے۔ کبھی کوئی پڑوسن یا سہیلی بھی اپنی اون اور سلائیاں لے کر ساتھ بیٹھ جاتی ہے، لب باتوں میں مشغول رہتے ہیں اور ہنر مند انگلیاں آنے والے کسی ننھے فرشتے کا یا کسی پیارے کا سویٹر بڑی محبت سے بننے لگتی ہیں۔ سردی کے باعث چھانے والی دھند اور آٹو رکشہ سے پھیلے گرد و غبار کے حصار میں لپٹا چار ٹانگوں پر کھڑا چونگلہ دور سے مدہم، سمٹا سمٹا اور کپکپاتا دکھائی دیتا ہے۔ درابن کلاں، پروآ اور شہر کے دوسرے مضافات سے اونٹوں اور گدھوں پر لکڑیاں اور گوئے لادے دیہاتی بازاروں میں گھوم پھر کر سردی کے قدرتی تحفے بیچتے نظر آتے ہیں۔ بنوں چونگی اور اس کے اطراف کا علاقہ شہر کا مصروف ترین کمرشل ایریا بن جاتا ہے جہاں لنڈے کی ایک عالیشان اوپن مارکیٹ وجود میں آجاتی ہے۔

ڈیرہ شہر میں جس طرح سخت گرمیوں میں پاوندوں کی آمد سے آنکھوں کی متعدی بیماریاں اور ڈاکٹر بگو کا بزنس عروج پر پہنچ جاتا ہے بالکل اس طرح سردی اپنے ساتھ مشہور سوغات نزلہ، زکام اور بخار لیے وارد ہوتی ہے۔ سردی میں کھانسی اور زکام کی کالی دوا دیتے دیتے ڈاکٹر بگو خود بھی کبھی کبھار بیمار پڑ جاتا ہے۔ حاجی غضب کے بقول: ''سردی کے بخار، رَمانے علی والے کے اچار اور بخت گلی کی نسوار کا اپنا ایک الگ مزہ ہے''۔ یہ بات کافی حد تک درست بھی ہے کیونکہ تینوں میں انسان مدہوش ہی نظر آتا ہے۔

ڈیرہ میں دوپہر ڈھلتے ہی سرمست ہوا کی خنکی میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے اور موسم کی ٹھنڈی دستک جسم و جاں ہی نہیں روح تک کو گدگدانے لگتی ہے۔ چمکیلی دھوپ مدہم پڑنے لگتی ہے، پنچھی سرِ شام گھروں کو لوٹنے لگتے ہیں اور دن ڈھلنے کو کمر کسنے لگتا ہے۔ سورج کا راج ختم ہوتے ہی بھیگی شام پر شفق اپنا ٹھنڈا آنچل لہرائے آن پہنچتی ہے۔ سرد ہوا کے دامن میں کہر کی گلکاری لیے شام کے دھندلکے پھیلتے ہی فضا میں ایک عجیب قسم کی اداسی چھا جاتی ہے۔ چولہے اور الاؤ روشن کر دیئے جاتے ہیں۔ مکمل اندھیرا پھیلتے ہی رات ایک بھرپور انگڑائی لے کر اپنے شباب پر پہنچ جاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی ٹیٹلر سینما اور اس کے پہلو میں بنے جمیل ہوٹل کی مدہم روشنی اور ٹوٹے پھوٹے بنچوں پر ادیبوں اور پاگلوں کی اٹھک بیٹھک شروع ہو

جاتی ہے۔ ہوٹل کے اندر بجنے والے لاؤڈ میوزک کی چیخ و پکار اور شعراء کی ادبی باتیں سرد جذبات کو گرما کر رکھ دیتی ہیں۔ قادے کرڑی کی ایک تازہ ریسرچ کے مطابق: ''جمیل ہوٹل پر آنے والا ہر دوسرا شخص رکشہ ڈرائیور، فقیر، نشئی یا پاگل ہوتا ہے اور اگر وہ ان میں سے کوئی نہ ہو تو پھر شاعر اور ادیب تو ضرور ہوتا ہے''۔ المختصر ڈیرہ کی سردی، موسم کی رنگینی، تیز چمکیلی صبحیں، اجلے روشن دن، سرمگیں شامیں، اوس میں بھیگی راتیں اور گرم گرم پوشاکوں، رنگین و حسین ٹوپیوں، موزوں میں لپٹے سمٹے چلبلے اور شریر باسیوں کے بارے میں جتنا بھی لکھا جائے کم ہی ہوگا۔

.....

ڈیرہ کی برسات

آج صبح سے سڈنی میں چھائے شدید حبس کو موسلا دھار بارش نے کافی حد تک کم کر دیا تھا۔ صاف شفاف پانی بغیر کسی رکاوٹ کے روڈ کی دونوں جانب بنی ذیلی نالیوں کی طرف بھاگتا چلا جا رہا تھا۔ شاہراہیں اور گلیاں پہلے سے کہیں زیادہ شفاف، نکھری نکھری اور آئینہ ہو چلی تھیں۔ سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر بارش میں بھیگتے، ہواؤں کے ساتھ گنگناتے اور بادلوں سے برستی ٹھنڈی بوندوں سے کھیلتے ایسا لگتا تھا کہ جیسے یہ سب کچھ ہمارے لیے ہی ہوں۔ ہم دیسی لوگوں کے مزاج، طور طریقے اور رویے عموماً موسمی تبدیلیوں کے تابع ہوتے ہیں۔ مثلاً بیماریاں، کیچڑ اور مشکلات لانے والی برسات میں کوئی رومینٹک پہلو نکالنا، چاند میں محبوب کا حسین چہرہ ڈھونڈنا، بلا وجہ ستاروں کو تکنا اور گننا۔ ہلکی بارش اور بادلوں سے گھرے موسم میں ہم لوگ خاصا رومینٹک ہو جایا کرتے ہیں، یہاں تک کہ ہمارے ہاں ایسے دلفریب موسم میں سرد مزاج دلوں پر بھی اکثر مستی چھا جایا کرتی ہے۔ مگر گوروں کو بارش ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ اگر ہلکی سی بوندا باندی بھی ہو رہی ہو تو یہ بیزاری سے موسم کو کوستے نظر آتے ہیں۔ ایسے موسم میں جب آسمان پر بادل گھرے ہوں اور ہلکی ہلکی نرم پھوار پڑ رہی ہو، آپ کسی گورے سے موسم کا حال دریافت کریں تو وہ منہ بسورتے ہوئے کہتا ہے ''What a terrible Weather''۔ گورے کے نزدیک موسم وہی اچھا ہے جس میں سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا ہو، بادلوں کا دور دور تک نام و نشان نہ ہو تو ایسے میں وہ بے اختیار کہہ اٹھتا ہے: ''what a lovely day''۔ شاید گورے کو کپڑے اتارنے کا بہانہ چاہئے، اسی لیے اس کی تو خواہش ہوتی ہے کہ ہر ڈے بس سنی ڈے ہی ہو۔

سڈنی کے پھوار زدہ مدہوش موسم کو انجوائے کرتے ہی اکثر ڈیرہ کی مستانی برسات آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے۔ ڈیرہ میں اگرچہ برسات کم کم ہی آتی ہے مگر جب تشریف لاتی ہے تو منہ پھاڑ بارش

برساتی ہے۔ بارش کی آمد سے ذرا پہلے تیز جھکڑوں سے کواڑ بجنا شروع ہو جاتے ہیں، ٹپ ٹپ کرتے پانی کے موٹے قطرے گرتے ہی پیاسی زمین اپنی تپش باہر نکالنے لگتی ہے، گھروں کے صحن میں پڑا پھیلاؤ سمیٹنے کے ساتھ ساتھ چھتوں سے فٹافٹ کپڑے اتار لیے جاتے ہیں۔ بارش کچھ ہی لمحوں بعد جب ''واچھڑ'' کی شکل میں اندرون شہر کی سڑکوں اور گلیوں پر پڑتی ہے تو جمع ہونے والا پانی جلد ہی سیلابی ریلے کی صورت میں ندی نالوں کا روپ اختیار کر لیتا ہے، بچے خوشی سے دیوانہ وار ناچتے کودتے سڑکوں پر نکل آتے ہیں۔

ایک زمانہ تھا جب گھروں کے آنگن بھی دلوں کی طرح وسیع ہوا کرتے تھے، تب ان آنگنوں میں چارپائیاں ڈال کر بارش کا لطف دوبالا کیا جاتا تھا۔ ادھر بوندا باندی شروع ہوئی ادھر صحن میں پڑی چارپائی پر بیٹھ کر پت دانے مارنے کے بہانے پیٹھ ننگی کیے رم جھم کرتی پھوار میں اپنے آپ کو بھگونے لگ گئے۔ اگر آج سے پندرہ بیس سال پہلے کے دلفریب ساون پر نظر دوڑائیں تو شہر کے شمالی نشیبی علاقوں مثلاً مسلم بازار میں ٹھاٹھیں مارتا گدلا پانی، اس میں کھیلتے کودتے بچے اور سائیکل رکشہ آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ اس وقت چونکہ شہر بھر میں سائیکل رکشہ چلا کرتا تھا تو ایسے میں رکشہ چلانے والوں کی مہارت بھی قابل داد ہوا کرتی جو بہتے دریا میں سواری کو آرام سے بٹھائے بڑی مستعدی اور مہارت سے رکشہ کھینچتے چلے جاتے، ساتھ ہی اِکا دُکا سائیکل سواروں پر پٹ سن کی بوری ڈالے کتے چھوڑ سائیکلوں کے پیڈل مارتے جبکہ پیدل حضرات پنڈلیوں تک بہتے پانی میں اپنے پائنچوں کو اوپر اٹھائے شڑپ شڑپ کی آوازیں نکالے سہم سہم کر سلوموشن میں آگے بڑھ رہے ہوتے تھے۔ کچھ کو یہ خوف لاحق ہوتا تھا کہ کہیں سائیکل سوار کے گزر جانے سے پانی کے چھینٹے کپڑوں پر نہ پڑ جائیں۔ مسلسل برستی بارش میں سڑکوں پر لبالب پانی جمع ہوتے ہی محلے کے بچے کپڑے اتار کر گدلے پانی میں پھسلتے، اُچھلتے، کودتے اور پیراکی کی مشق کرتے نظر آتے تھے بارش کے بعد سڑکوں پر پھیلے حلیم نما کیچڑ بکف جوتوں اور چپلوں کے ساتھ گھر کے اندر گھستے ہی ماؤں بہنوں کی صلواتیں سننا، کیا مزے ہوا کرتے تھے ڈیرہ کی برسات کے۔

اتنے ماہ و سال گزرنے کے باوجود ڈیرہ شہر میں اب بھی کچھ خاص نہیں بدلا۔ وہی سڑکیں، وہی برسات اور وہی سڑک پر پانی کھڑے ہونے کا منظر۔ سالوں پہلے شہر کی سڑکیں کچھ پائیدار ہوا کرتی تھیں مگر

آج کی سڑکیں اس کے بنانے والے ٹھیکیداروں کے ایمان کی طرح خستہ حال، نازک اور حساس ہیں۔ آزادی کے بعد ڈیرہ شہر میں واضح نام نہاد ترقی اگرچہ توپانوالہ چوک پر لگائے گئے ٹریفک سگنلز، اسٹیٹ لائف بلڈنگ اور آٹو رکشہ کی آمد تصور کی جاتی ہے۔ آٹو رکشہ تیز رفتاری کے ساتھ ساتھ شہر میں آلودگی، گرمی اور شور جیسے خرافاتی تحفے بھی اپنے ساتھ لے کر آیا ہے۔ بارش کے سیلابی پانی سے گزرتے ہوئے ہر رکشہ ڈرائیور کو اب یہ خوف لاحق ہوتا ہے کہ اس کا پھٹ پھٹ کرتا رکشہ بمعائے سواری عزت واحترام کے ساتھ سیلابی ریلے سے نکل جائے۔ اگر بدقسمتی سے رکشہ عین سڑک کے بیچ رک گیا تو ڈرائیور کو دھکا لگانے والے رضا کار ڈھونڈنا پڑتے ہیں۔ رضا کاروں کی عدم دستیابی کے باعث بعض اوقات سواری خود باہر نکل کر ڈرائیور کی مدد کرتے ہوئے رکشے کو پانی کے ریلے سے نکالنے کا فریضہ انجام دیا کرتی ہے۔ اسی تگ و دو میں سواری کو یہ یاد نہیں رہتا کہ وہ کہاں سے سوار ہوئی تھی اور اس کی منزل کہاں ہے؟۔ ڈرائیور بھی یہ بھول چکا ہوتا ہے کہ اس نے سواری سے کرایہ بھی وصول کیا ہے یا نہیں۔ الغرض اس حالت میں آٹو رکشہ، سواری اور ڈرائیور پر جو گزرتی ہے اس کے بعد بھی اگر یہ اس سیلابی ریلے سے زندہ سلامت نکل جائیں تو خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتے ہیں۔

کوئی بھی نئی بستی یا کالونی بسانے کے لیے پوری دنیا میں ہمیشہ پہلے اسکیم بنائی جاتی ہے، پلاننگ کی جاتی ہے اور پھر ماہرین کی مدد سے نقشے بنوائے جاتے ہیں۔ نقشوں کی منظوری کے بعد عمارتیں کھڑی کی جاتی ہیں لیکن ہمارے ہاں یہ سارا عمل الٹے سرے سے انجام دیا جاتا ہے، یعنی پہلے عمارت تعمیر کر دی جاتی ہے اور اس کے بعد اگر ہاؤسنگ کمیشن یا کمیٹی مجبور کرے تو نقشہ پاس کروایا جاتا ہے جبکہ پلاننگ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ڈیرہ شہر کی نشیبی ترین کالونی ''اسلامیہ کالونی'' اور حلیم کالونی ماشاءاللہ اسی اُلٹی پلاننگ کا جیتا جاگتا شاہکار ہے۔ خصوصاً اسلامیہ کالونی کی تنگ، خمدار اور نشیبی سڑک بلکہ پوری کالونی کا نقشہ اپنے وقتوں کے ایک کرپٹ ترین پٹواری کے تخریبی کارناموں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ کالونی کی گلیوں اور نکاسی آب کے قدرتی نظام کو دیکھ کر دل بے اختیار پکار اٹھتا ہے کہ واقعی اگر کوئی تعمیراتی پراجیکٹ نقشے کو الٹا رکھ کر ڈیزائن کیا گیا ہے تو وہ صرف اسلامیہ کالونی ہی ہے، جہاں سارا سال گندے پانی میں ڈوبی گلیاں اور

نالیاں مچھروں کو نیا جیون فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ شہر بھر کو تھوک کے حساب سے مچھر سپلائی کرنے کا فریضہ بہ احسن انجام دے رہی ہیں۔ بارش کے دنوں میں پہلا قطرہ گرتے ہی کالونی کے گلی کوچوں میں ایک نیا سونامی وجود میں آ جاتا ہے۔عموماً پانی سے لبریز تنگ گلی میں گزرتے وقت جب کوئی رکشہ منہ اٹھائے دندناتا اور پھڑ پھڑاتا کسی راہگیر کے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے تو آس پاس سے نکلنے کی کوئی جگہ باقی نہیں بچتی۔اس وقت تو بہت ہی دلچسپ صورتحال پیدا ہو جاتی ہے جب بارش کے پانی میں کسی راہ گیر کے سامنے چادر میں لپٹی کسی محترمہ کا گزر ہوتا ہے۔وہ بے چاری بے بسی سے اپنی پلکیں جھپکائے راستہ لینے کی درخواست کرتی نظر آتی ہے جبکہ راہ گیر پائنچے اوپر کیے چھپکلی کی طرح اپنی پیٹھ کو گلی کی دیوار کے ساتھ سختی سے چپکائے کھڑا ہو جاتا ہے۔اتنی احتیاط کے باوجود اگر اتفاقی طور پر محترمہ کے لبادے کا کوئی حصہ دیوار پر چپکے شخص سے لگ جائے تو وہ ایسی تیکھی نظروں سے اسے گھورتی ہے کہ راستہ دینے والا خود شرم کے مارے پانی پانی ہو کر بہہ جاتا ہے۔

اگرچہ ڈیرہ میں برسات کسی طوفان سے کچھ کم نہیں ہوتی جہاں پر لوگ لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے بچاؤ اور تحفظ میں بھی مصروف ہو جاتے ہیں،لیکن ان سب خامیوں کے باوجود ڈیرہ کی برسات ایک یادگار برسات ہوا کرتی ہے، جسے یاد کرتے ہی دل میں ایک عجیب سی خواہش مچلنے لگتی ہے۔ دل چاہتا ہے کہ مٹی کے بھیگے بدن سے اٹھنے والی خوشبو اور اس خوشبو کو چھو کر بکھرنے والی ٹھنڈی،معطر اور پرنم ہوا کے جھونکوں کو محسوس کرتے رہیں،اس کی سرگوشیاں سنتے رہیں۔اپنے دل کے کسی گوشے میں طرح طرح کی امیدوں،آرزؤں اور امنگوں کی پھوار میں ہرا بھرا جنگل آباد کیے بھیگتے رہیں۔پھر سے بچے بن جائیں اور انفیکشن کے خوف سے کوسوں دور آلودہ پانی میں کھیلتے کودتے ، ڈبکیاں مارتے پھریں اور کسی کالے بادل پر بیٹھ کر پیار کا سندیسہ بن کر ہوا سے باتیں کرتے ہوئے دور، بہت دور نکل جائیں۔

.....

ڈیرہ کے بھائی لوگ

ہم لوگ برے لوگ ہیں بدنام ہیں لیکن
جو لوگ مقدس ہیں وہ کیا کچھ نہیں کرتے

یہ تذکرہ ہے سر ہتھیلی پر رکھ کر موت کی شاہراہوں پر چلنے والے اُن بے خوف وخطر انسانوں کا کہ جنہیں ہمارا معاشرہ بدمعاش یا بھائی لوگ کہہ کر بلاتا ہے۔ یہ کون لوگ ہوتے ہیں اور کن کن مراحل سے گزر کر بدمعاش بنتے ہیں؟ یہ ایک حقیقت ہے کہ بدمعاش ہمیشہ اپنی ماں کے پیٹ سے جنم لیتے وقت دوسرے بچوں کی طرح ایک معصوم فرشتہ ہی ہوتا ہے لیکن ہمارے عدم مساوات پر مبنی انصاف سے عاری بے حس دوغلے معاشرے میں مساوی حقوق نہ ملنے کے صورت میں اسے بزور طاقت چھین لینے والے شخص کو بدمعاش کہا جاتا ہے۔ بدمعاش کسی بھی علاقے کی تاریخ کا ایک مخصوص حصہ ہوتے ہیں، تاریخ اچھی ہو چاہے بری، تاریخ تاریخ ہوتی ہے۔

انسان اپنے بچپن میں جو غیر انسانی رویہ اپنے اردگرد کے ماحول سے لیتا ہے وہ باقی کی ساری حیاتی سود سمیت انہیں واپس لوٹاتا رہتا ہے۔ جس انسان کو تنگدستی، جابرانہ نظام، مفلسی، بے حسی، غربت، بھوک اور حقوق تلفی وراثت میں ملے تو زیادتی کے اس احساس کے سبب اس کی شخصیت میں بچپن ہی سے چڑچڑا پن، ضد، سخت گیری، ہٹ دھرمی اور مزاج میں کڑواہٹ فطری طور پر شامل ہوتی چلی جاتی ہے۔ چنانچہ شعور کی منزل پر قدم رکھتے ہی وہ اپنے اردگرد پھیلے پیپ زدہ معاشرے کو یہ سب چیزیں واپس لوٹانا

شروع کر دیتا ہے۔جس کے نتیجے میں معاشرہ اسے بدمعاش کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔اونچے نیچے پتھریلے اور خاردار راستوں پر چلنے والے یہ لوگ بھی ہماری سوسائٹی کا حصہ ہوتے ہیں۔ون وے پر چلنے والے یہ لوگ کبھی جھک کر راستے کے پتھر نہیں اٹھاتے،سرخم کر کے تاریک سرنگ قدم بقدم طے نہیں کرتے،ان کی پرخطر زندگیوں میں کبھی بھی یوٹرن نہیں آتا کیونکہ اگر یہ مڑنا چاہیں تو توڑ دیئے جاتے ہیں یا پھر تاریک راہوں میں ہی مار دیئے جاتے ہیں۔

قیام پاکستان کے ابتدائی دنوں میں خصوصاً ایوب خان سے لے کر بھٹو دور تک جب گلی محلوں میں بدمعاشی عام تھی۔اس تاریخی دور میں قومی بدمعاشوں کے ساتھ ساتھ ڈیرہ شہر نے بھی نامی گرامی بدمعاش پیدا کیے،جن میں سے کچھ کا تذکرہ نہایت ضروری ہے۔

شیر علی: جس طرح دنیا داؤد ابراہیم،کریم لالہ،حاجی مستان،چھوٹا راجن،پھولن دیوی،اچھوا ور طافے گجر کے نام سے کانپتی ہے اسی طرح ڈیرہ کی عوام میں بھی کسی زمانے میں شیر علی کے نام کا ڈنکا بجا کرتا تھا۔شیر علی اپنے دور کا ایک نامی گرامی بدمعاش تھا۔ڈیرہ کی تاریخ کے اس انڈر ورلڈ ڈان کا نام سن کر لوگوں کو ٹخنوں پسینہ آ جاتا تھا اور کیوں نہ آتا کہ شیر علی واقعی ایک دشمن دار اور دادا گیر قسم کا ڈاڈھا بدمعاش تھا۔اس کا زیر اثر علاقہ توپانوالہ بازار اور اردگرد کا سارا علاقہ تھا،جہاں پر اس کے کارندے دکانداروں سے ہفتہ وصولی یا جگا ٹیکس لیا کرتے تھے۔شام کو شفاف بوسکی کا کرتا پہنے،بالوں میں تیل لگا کر مانگ نکالے،نوکیلی گھنی مونچھیں، چُوں چُوں کرتی طلے والی جوتی،گلے میں مفلر اور شلوار کے نیفے میں چاقو چھپائے وہ بدمعاشی کیا کرتا تھا۔ ایک حواری کے مطابق شیر علی اپنے نیفے میں ہر وقت کانیگرام کا چاقو لیے پھرا کرتا تا کہ مقابلے کے وقت دشمن کو زیر کر سکے۔(کانیگرام جنوبی وزیرستان میں ایک چھوٹا سا علاقہ ہے جہاں کے کمانی دار چاقو کسی زمانے میں بہت مشہور ہوا کرتے تھے۔اس قسم کے چاقو کا لیور دباتے یا انگلیوں سے کھولتے ہی کڑکڑ کی آواز کے ساتھ ہی چاقو کھل جایا کرتا تھا۔لڑائی جھگڑوں کے دوران اکثر بدمعاش یہی چاقو استعمال کیا کرتے تھے،بعض اوقات اس کی ''کڑکڑ'' سے ہی مخالف بدمعاش بھاگ کھڑا ہوتا تھا)۔

ڈیرہ کی تاریخ بتاتی ہے کہ عورتوں کے ساتھ احترام اور چھوٹوں کے ساتھ شفقت سے پیش آنے والا شیر علی

بدمعاش اصول پرست اور مضبوط اعصاب کا مالک ایک جی دار اور وضعدار قسم کا انسان تھا۔ شیر علی کو للکار کر قتل کرنا انتہائی مشکل کام تھا۔ وہ دشمنوں کے لیے موت کا پیغام بن کر جہاں کہیں بھی جاتا تو اس کے جوتوں کی دھمک سے ہی گلی کوچوں میں سناٹا چھا جاتا اور خوف کے مارے خلقت کے چہرے پیلے پڑ جایا کرتے تھے۔ شیر علی نے مختصر عرصے میں کافی نام کمایا مگر اسے جوانی میں ہی دیرینہ دشمنی کی بناء پر کسی دشمن نے انتقاماً اوپر سے کھولتا ہوا گرم پانی ڈال کر مار دیا تھا اور یوں ڈیرہ کی تاریخ کا یہ مشہور ترین کردار اپنے ہی جیسے کسی کردار کے ہاتھوں قتل ہو گیا تھا۔

فلک شیر عرف فلکا: فقیر شاہ والی گلی کا رہائشی فلکا بھی اپنے دور کا ایک نامی گرامی بدمعاش ہو گزرا ہے۔ فلکا بدمعاش ڈیرہ بھر میں شیر علی کے پائے کا بدمعاش تصور ہوتا تھا۔ یہ ریچھ کتے کی لڑائی کا بڑا شوقین تھا چنانچہ اس کے مردانہ خانے یعنی جھاہ پر ہر جمعرات کی شام ریچھ کتے کی لڑائی ہوا کرتی تھی جسے دیکھنے کے لیے دور دور سے خلقت امڈ آیا کرتی تھی۔ فلکے کی بدمعاشی کا دور کافی طول پکڑتا اگر یہ نشے کی لعنت میں پڑ کر تباہ نہ ہوا ہوتا۔ فلکے بدمعاش نے اپنے عروج کے دور میں اپنے ایک بھائی کو ٹرک لے کر دیا تھا جو وہ ڈیرہ کراچی روٹ پر چلایا کرتا تھا مگر ایک دن کراچی جاتے ہوئے اس نے غلطی سے ٹرک کو بجلی کے کھمبے سے ٹکرا دیا تھا۔

کسی نے واقعی سچ کہا ہے کہ: ''بدمعاش کی زندگی چاند اور سمندر کے گہرے ملاپ کی طرح ہوتی ہے۔ جب چاند پورے شباب پر ہوتا ہے تو سمندر کا پانی چھلک چھلک کر اس تک پہنچنے کی ناکام کوشش کرتا ہے۔ لیکن جوں جوں چاند کمزور ہوتا جاتا ہے سمندر کا پانی بھی پرسکون ہوتا چلا جاتا ہے۔ چاند کے عروج و زوال اور سمندر کے نشیب و فراز انسانی زندگی سے گہری مماثلت رکھتے ہیں۔ جب انسان پر عروج ہوتا ہے تو ساری مادی طاقتیں پانی کی طرح اس پر لپکتی ہیں اور جب زوال آتا ہے تو اپنا سایہ بھی ساتھ چھوڑ دیتا ہے''۔ نشے کے ہاتھوں فلکے بدمعاش کی بے وقت موت کے سبب تنگدستی نے اس کے گھر کا راستہ دیکھ لیا۔ چنانچہ باقی ماندہ افراد اپنے آبائی علاقے سے اٹھ کر بنوں چونگی کے قریب رہائش پزیر ہو گئے۔ جب ڈیرہ میں نیا نیا آٹو رکشہ متعارف ہوا تو فلکے کے بھائی نے بھی نیا آٹو رکشہ نکلوایا تھا۔ حسب عادت اس نے رکشے کو ایم او ڈی سی روڈ سے دریا کی طرف جاتے ہوئے سواری سمیت سیدھا دریا میں جا اتارا، بعد میں

دریا پر موجود کچھ افراد نے موقع پر پہنچ کر رکشہ کو سواری اور ڈرائیور سمیت بچا لیا تھا۔ فلکے بدمعاش کو ڈیرہ کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

چیچکا بدمعاش: پستہ قد و قامت کا یہ بدمعاش انڈین فلموں کے منا بھائی اور سرکٹ کی طرز کا مشہور کردار ہو گزرا ہے۔ چیچکے بدمعاش کا ڈیرہ اسماعیل خان کے جھومر ''چونگلہ'' کے آس پاس ہی کہیں ٹھکانہ ہوا کرتا تھا ۔عین لڑائی کے دوران یہ دشمن کے ہاتھوں سے پھسل کر نکل جایا کرتا شاید اسی خصوصیت کی بنیاد پر ہی اسے چیچکے بدمعاش کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ چیچکا بھی حد درجہ نشہ اور شراب کی عادت کے باعث وقت سے پہلے ہی چل بسا تھا۔

خدا بخش عرف خدا گاڑی والا: متوسط درجے کے اس بھاری بھرکم ڈیل ڈول کے سرٹیفائیڈ پروفیشنل بدمعاش کا دور کافی طویل رہا ہے۔ خدا گاڑی والا اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ بدقسمتی سے اس کے عہد شباب میں ہی بدمعاشی تقریباً زوال پزیر تھی اور ہفتہ وصولی یا جگا ٹیکس کا تقریباً خاتمہ ہو چکا تھا مگر پھر بھی اسے مغلیہ دور کے بہادر شاہ ظفر کی طرح ڈیرہ کی تاریخ کے آخری سرکردہ بدمعاشوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ مملکت نیک آباد کے سابقہ امیر حضرت مولانا ضیاء الحق مدظلہ علیہ کے میڈ اِن امریکن دور میں قومی سطح پر چرس، ہیروئن، کلاشنکوف اور ہتھوڑا گروپ کلچر کو بام عروج ملتے ہی گلی محلوں میں قائم بدمعاشی کو بھی زوال آ گیا، ساتھ ہی ساتھ چاقو چھریوں اور مفلروں کی صنعت کو بھی نا قابل تلافی نقصان پہنچا اور جلد ہی بہادری کی جگہ بزدلی اور منافقت نے لے لی۔ دشمن کو للکار کر مارنے کی بجائے چھپ چھپ کر وار کیا جانے لگا تو خُدے نے بھی مجبوراً بدمعاشی ترک کی اور ڈرگ کا کاروبار کرنے لگا، مگر کچھ عرصہ بعد وہ خود اس بھیانک نشے کی لپیٹ میں آ گیا اور ہیروئن کی عادت اسے بھی لے ڈوبی۔ اب اس کا بیٹا گُلی اس کی جگہ پر بدمعاش ہے۔

جمعہ عرف جمعی: حیدری چوک ڈیرہ کے قریب رہنے والا یہ بدمعاش شمالی سرکلر روڈ پر اکثر نظر آ جایا کرتا تھا۔ جمعی بدمعاش کا ایک بیٹا مختیار بھی کافی دلیر، بہادر، نڈر اور بیباک انسان تھا، مگر بس اڈے پر دشمنوں نے اسے دن دیہاڑے قتل کر دیا تھا۔ جمعی بدمعاش چند سال قبل فوت ہوا ہے۔

معاشرے کے ان کرداروں کی تاریخ پڑھنے کے بعد ہر کوئی اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ اگر ہم سماج میں انسانوں کے غصب کیے ہوئے حقوق کسی نہ کسی طرح حقداروں کو واپس لوٹا دیں تو پھر کسی بھی دکھیاری ماں کے لعل کو شیر علی یا فلکا بننے کی بجائے نہ صرف معاشرے کا ایک کارآمد فرد بنایا جا سکتا ہے بلکہ چوری چکاری کرنے اور لوگوں کی زندگیاں چھیننے والے ہاتھوں میں روٹی دے کر انہیں آسانیاں بانٹنے، نیکیاں عام کرنے اور مسکراہٹیں بکھیرنے والا ایک کارآمد انسان بنایا جا سکتا ہے۔

.....

اختر طُوفان سے چاچے ریڈو تک

ہم سب گنہگار ہیں، خطاؤں کے پتلے ہیں۔ ہم میں کئی خوبیاں اور کئی خامیاں ہیں۔ ہم عام انسانوں کی طرح کھاتے پیتے ہیں، کام کرتے ہیں، روتے، چیختے چلاتے، گھبراتے اور خوش ہوتے ہیں۔ اکتاتے، تھکتے اور بور بھی ہوتے ہیں۔ ہم چڑتے، الجھتے، دکھی بھی ہوتے ہیں۔ ہم مشتعل ہو کر غصہ بھی کرتے ہیں اور کبھی کبھار لڑ جھگڑ کر کھلم کھلا اس کا اظہار بھی کر لیتے ہیں۔ پیار، محبت، نفرت، جھوٹ، سچ، جنگ، امن اور صلح صفائی جیسی ڈھیروں خوبیوں اور خامیوں کے امتزاج سے مل کر ہماری زندگیاں تشکیل پاتی ہیں۔ کوئی مانے یا نہ مانے مگر یہ سچ ہے کہ ہم سب کی بھی کوئی نہ کوئی چھیڑ، کوئی نہ کوئی چڑ ضرور ہوتی ہے، یہ دراصل ہماری وہ پھڑپھڑاتی نرو ہوتی کہ جسے اگر کوئی دبانے کی کوشش کرتا ہے تو ہمارے ماتھے پر سلوٹیں پڑ جاتی ہیں اور ردعمل کے طور پر ہم ری ایکٹ کرتے ہیں۔ چاچا ریڈو، رزاق ویلڈر، بھیڈ مسات اور سم پوسمیت ہم سب ایک جیسے ہیں۔ اگر کچھ فرق ہے تو صرف اتنا کہ ہم میں سے کچھ لوگ الجھنے، چڑنے اور ردعمل کا اظہار کرنے کی بجائے اپنے اوسان قائم رکھ کر پتلی گلی سے چپکے سے نکل جاتے ہیں جبکہ کچھ لوگ اپنے اوپر گھبراہٹ طاری کر کے بچوں کی طرح اس کا اظہار کرنے بیٹھ جاتے ہیں اور نتیجتاً گلی محلوں میں پاگل مشہور ہو جاتے ہیں۔

بھیڈ مسات: بازار کے دونوں جانب کی ٹریفک رکی ہوئی تھی۔ سڑک کے بیچوں بیچ ایک بندہ رکشہ روکے، پھولی سانسوں کے ساتھ پسینے میں شرابور گلہ پھاڑے اپنے مخاطب پر چلائے جا رہا تھا: ''آ ڈیکھ گھِن، اے

بھیڈ ھِ کہ گھٹا''۔مغلظات کا ایک طوفان اس کے لبوں سے جاری تھا۔حلق سے بلند ہوتی آواز جیسے ہی دکانوں کے چھپروں اور چھتوں کو چیرتی ہوئی گھروں میں داخل ہوئی تو مکین شرم کے مارے اپنی انگلیاں کانوں میں ٹھونسے ایک دوسرے کو کہنے لگے:''اج وَت کیں بھیڈ مسات نال کھڑایا ھ؟''(آج پھر کس نے بھیڈ مسات کو چھیڑا ہے؟)۔بھیڈ مسات کو چھیڑنے والا حسبِ معمول منہ ماری اور مسات کی ہوائی فائرنگ سے بچنے کیلئے پتلی گلی سے کب کا نکل کر رفو چکر ہو چکا لیکن مسات کا غصہ ٹھنڈا ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔مجبوراً کسی شریف النفس اور معزز بندے کو بیچ میں کودنا پڑا۔کوئی نیک دل دکاندار بھاگم بھاگ پانی کا بھرا گلاس لے کر آیا،بھیڈ مسات نے غٹا غٹ پانی پیا اور بے ترتیب سانسوں کے ساتھ ہی صلح صفائی کروانے والے سے کہنے لگا:چاچا یہ آپ کا منہ تھا کہ میں لحاظ کر گیا ورنہ میں اس بہن چ۔۔کو بتاتا کہ بھیڈ کیا ہوتی ہے اور گھٹا کیا ہوتا ہے۔یہ کہتے ہی بھیڈ مسات سائیکل رکشہ کھینچتا اپنی منزل کی طرف چل پڑا۔ اَسّی کی دھائی کا یہ مزاحیہ کردار ڈیرہ میں سبزی منڈی کے نزدیکی علاقے کا رہائشی تھا جو اکثر سائیکل رکشہ چلاتا نظر آتا تھا۔رکشہ چلاتے ہوئے اگر کوئی اسے بھیڈ مسات کہہ کر چھیڑنے کی کوشش کرتا تو وہ سرِ بازار سواریوں سے بھرا رکشہ وہیں روک کر نیچے اترتا اور چھیڑنے والے کو گالی گلوچ دے کر خوب رسوا کر کے اس کی خبر لیا کرتا تھا۔پتہ نہیں وہ بھیڈ کے نام سے اتنا الرجک کیوں تھا اور یہ لفظ اس کے چڑچڑے پن کی وجہ کیوں بنا تھا؟۔حقیقت کوئی بھی نہیں جانتا۔

جہاں تک چھیڑ کا سوال ہے تو دنیا کے ہر انسان کی کوئی نہ کوئی چھیڑ ضرور ہوتی ہے،جس کے نفسیاتی ردعمل میں وہ چڑتا ہے۔ایسی صورتحال میں اگر کوئی سمجھدار انسان ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا کر چپ چاپ شیطانی ہجوم سے بچ کر نکل جائے تو بہت ہی اچھی بات ہے،دوسری صورت میں اگر کوئی جذباتی انسان آپے سے باہر ہو کر جوابی کاروائی کرنے پر مجبور ہو جائے تو وہ عوامی تمسخر کا نشانہ بنا دیا جاتا ہے۔ردعمل ظاہر کرنے والا اپنی کمزوری سب پر عیاں کر دیتا ہے جس کا لوگ وقتاً فوقتاً فائدہ اٹھاتے رہتے ہیں۔حقیقت یہی ہے کہ بھیڈ مسات بھی ہماری طرح کا ایک عام سا انسان ہے،وہ بھی تھکتا ہے،چڑتا ہے،اکتاتا ہے،اسے بھی غصہ آتا ہے۔اس کی بھی اپنی نفسیات،اپنی کیمسٹری اور کمزوریاں ہیں

اور وہ بھی کسی مخالف عمل کے ردعمل میں آ کر مشتعل ہو جایا کرتا ہے۔ کیا بھیڈ مسات پر ہر وقت غصہ سوار رہتا ہے؟۔ کیا وہ کوئی جنونی، جذباتی یا خونخوار قسم کا انسان ہے؟ ایسی کوئی بات نہیں وہ عام حالات میں ایک بے ضرر سا انسان ہے جو زیادہ تر نارمل ہی رہتا ہے، کوئی اسے جتنا بھی برا بھلا کہہ دے وہ آگے سے کچھ نہیں بولتا لیکن اگر کوئی اسے غلطی سے بھی بھیڈ مسات کہہ کر پکارنے کی کوشش کرے تو وہ اسے اپنی چھیڑ سمجھتا ہے اور ردِعمل کے طور پر فوراً مشتعل ہو کر مخاطب کو سرائیکی میں ایسی سلیس قسم کی اول فول گالیوں سے نوازتا ہے کہ شیطان بھی انگلیاں کانوں میں ٹھونسے دم دبا کر وہاں سے بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ لیکن ان سب خامیوں کے باوجود بھیڈ مسات ایک قوم پرست انسان ہے۔ آج سے کوئی پندرہ سال پہلے جب رمضان ڈبرّے والے کی الیکشن مہم زوروں پر تھی تو وہ سائیکل رکشہ چلانے والوں میں ڈیلی ویجز کی بنیاد پر پیسے بانٹا کرتا تھا۔ سائیکل رکشہ والے اپنے رکشوں پر اس کی پارٹی کا جھنڈا لگاتے، دن بھر کی دھاڑی ایڈوانس میں لے کر حلف اٹھاتے کہ شہر میں کسی سواری سے بھی کوئی کرایہ وصول نہیں کریں گے، مگر بازار میں آتے ہی اکثر رکشہ ڈرائیور جھنڈا اتار دیا کرتے اور سواریوں سے بھی برابر کرایہ وصول کیا کرتے تھے۔ ایسی صورتحال میں بھیڈ مسات ڈبرے والے سے کچھ لینے کی بجائے اپنی ہی دھن میں رکشہ چلائے رکھتا تھا۔ ایسے میں اگر کوئی مفت خور سواری اس سے پوچھتی: مسات کیا تیڈا رکشہ ڈبرے آلا ہِ؟ تو وہ آگے سے جواب دیتا: نئیں تیڈے پیو آلا ہِ۔ بھیڈ مسات ایک دفعہ کسی پردیسی کو اپنے رکشہ میں بٹھائے پیڈل مارتا منزل مقصود کی جانب گامزن تھا کہ پردیسی سواری نے ازراہ مذاق پوچھ لیا: ''جناب میں نے سنا ہے کہ ڈیرہ کے لوگ گالیاں نکالنے میں مشہور ہیں؟''۔ یہ سننا تھا کہ بھیڈ مسات نے مشتعل ہو کر جذباتی انداز میں رکشے کی ہائیڈرالک بریکیں لگاتے ہوئے رکشہ وہیں پر روکا اور نیچے اتر کر مہمان سواری کی کچھ ان الفاظ میں عزت افزائی کی:

''تیکوں کیرے کتے دے۔۔ آکھے کہ اساں لوک گالیاں کڈھیندے ہیں۔ ڈیواں اُوندی۔۔ جیڑا آدھے کہ اساں دیرے وال مندھیل ہیں۔ میکوں اُوں داناں تاں ڈساجیڑا اساڈے تے ایں قسم دا الزام لئی پھردے؟''۔ سواری شرمندگی کے مارے کرایہ مسات کی مٹھی میں دباتی، اپنی عزت بچاتی چپکے سے

آ گے نکل گئی۔ سائیکل رکشہ پر پابندی لگنے کے بعد بھیڈ مسات اب کیا کرتا ہے، کچھ پتہ نہیں۔

اختر طوفان: خادم حسین (زندگی فزیوتھراپی) کا اختر لالے کے بارے میں کہنا ہے: ''اَخ تر نال اگر کوئی بندہ پنج چھیں منٹ کھڑا تھی ونجے تاں اُوندے کول اِیویں کھٹی بو آندی ھ جیویں ملک فراز ودے اُٹھ کول آندی ھ تے ملک فراز ودے اُٹھ کول زیادہ ترکّی اوئی بو پاوندے کو آندی ھ''۔ خیر میں خادم حسین کے اپنے کلاس فیلو اختر طوفان کے بارے میں دیئے گئے ریمارکس سے پوری طرح اتفاق نہیں کرتا کیونکہ اختر کے بارے میں میرے خیالات ذرا مختلف ہیں۔ جس طرح سِکھ کنگھا، کڑا، کرپان، کیش اور کچھے کے بغیر سکھ نہیں ''اَڑں سِکھ'' ہے اسی طرح عینک، وِگ اور ننھی سائیکل کے بغیر اختر طوفان کا تعارف مکمل نہیں ہوسکتا تن پر بوسیدہ سی کالی قمیض چڑھائے، سر پر لمبے بالوں کی خستہ حال وِگ ٹکائے، آنکھوں پر سن سینتالیس کے سن گلاسز سجائے، پائنچے ٹخنوں سے اوپر کیے سائیکل کی اونچی گدی پر بیٹھا، بے تکے پیڈل مارتا، جاسوسی کا شوقین، ڈیرہ کا جیمز بانڈ، بچوں کا عینک والا جن، نوجوانوں کا مسٹر ڈیرہ اور بڑوں کا اختر طوفان عرف اختر دی گریٹ ڈیرہ بھر کی مشہور و معروف شخصیت ہے۔ کوئی اسے سی آئی ڈی کا جاسوس، کوئی درویش منش ملنگ تو کوئی اللہ لوک انسان سمجھتا ہے اور اختر کی کرشماتی شخصیت ان ساری خصوصیات کا کما حقہ احاطہ کرتی ہے۔ درویشانہ صفات کے حامل اختر کی مٹیالی اور گھنگھریالی وِگ کو دیکھ کر ایسے لگتا ہے جیسے بچوں نے اس کے سر پر شب برأت منائی ہو۔ لوگ عموماً اپنے ریشمی بالوں کو ہیڈ اینڈ شولڈر شیمپو سے دھونے کے بعد انہیں ڈرائیر سے خشک کر کے کنگھی کرتے ہیں جبکہ اختر کو اپنے کھردرے بالوں میں پہاڑی مٹی ڈال کر اس کے اوپر ہل چلانا پڑتا ہے۔ اختر کی زلف تراشی کے عوض حجام بھی اس سے چار گنا زیادہ معاوضہ طلب کرتا ہے اسی لیے مجبوراً اختر کو گومل یونیورسٹی کے مالی ''چاچے عیدو'' کے پاس جانا پڑتا ہے جو اپنی ناک پر سختی سے ہاتھ رکھ کر خصوصی سنتھا کی باڑ کاٹنے والی مشین سے بڑی تگ و دو کے بعد اختر کی حجامت کا فریضہ سرانجام دیتا ہے۔ روزانہ تسلسل کے ساتھ اپنی سائیکل پر سرکلر روڈ کے اردگرد کم از کم سات پھیرے لگانے والا ابن بطوطہ، کرسٹوفر کولمبس اور واسکوڈے گاما عرف اختر طوفان اب پارٹ ٹائم کالے علم میں پی ایچ ڈی کر رہا ہے اور کچھ عرصہ سے کچی پائند خان کے دکھی لوگوں کا پیر بنا ہوا ہے۔ اختر کے بقول میں ہمیشہ بھلائی اور اچھائی کے

تعویز دیتا ہوں۔ڈیرہ کی معروف شخصیت ہونے کے ناطے حال ہی میں جیو نیوز چینل کو دیئے گئے ایک انٹرویو کے ذریعے اختر اب عالمی شہرت یافتہ شخصیت بن چکا ہے۔یوٹیوب پر پڑا اختر کا ویڈیو کلپ اتنی بار دیکھا جا چکا ہے کہ اتنا تو مشہور انڈین فلم ''دل والے دلہنیا لے جائینگے'' بھی کسی نے نہ دیکھی ہوگی۔

مُمّوں ھِی: اصل نام شاید محمود تھا مگر بازار والے اسے مُمّوں ھِی کہہ کر پکارتے تھے۔ایک ٹانگ سے معزور بیساکھی کے سہارے چلنے والا، پکی رنگت کا مُموں ہی ایک شغلی اور رونقی بندہ تھا۔مزاحیہ کردار کے حامل اس شخص کو پاگل کم اور مست کچھ زیادہ سمجھا جاتا تھا۔وہ اکثر ڈاکٹر امان اللہ کلینک کے سامنے والی دکان پر یا کبھی اس کے آس پاس بنے سیمنٹ کے پھٹے پر اپنا بوریا بستر بچھائے راہگیروں کو تنقیدی نظروں سے گھورا کرتا اور ممکنہ حد تک لوگوں کو سینگ مارنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔''دیکھا ہے پہلی بار ساجن کے منہ پے بُتھاڑ''، ہر وقت کسی نہ کسی انڈین گانے کی پیروڈی مموں کے لبوں پر جاری رہتی تھی۔اس کی ظرافت بھری باتوں سے کچھ لوگ واقعی محظوظ ہوتے مگر کچھ راہگیروں کو اس کی طنزیہ چبھتی باتوں سے شدید کوفت ہونے لگتی تھی۔مموں کا سب سے زیادہ نشانہ سکول کے نوجوان لڑکے ہوا کرتے تھے،جن پر وہ طنزیہ جملے کسنے سے بھی گریز نہ کرتا تھا۔وہ انہیں دیکھتے ہی کہتا:''بہوں بھاندیں، کتھاں راندھیں، کیری چکی دا اٹا کھاندیں؟''اگر کوئی اس کی مزاحیہ باتوں پر ہنس دیتا تو یہ آگے سے کہتا: ''بہوں کھلدیں اگوں ملدیں''۔مموں صحیح معنوں میں مسلم بازار کا ایک زندہ دل کردار تھا، جو ہر دم خوش وخرم اور شاد رہا کرتا تھا۔

محمد سلیم عرف سلیما مچھی: سلیم محلّہ حافظ جمال کا رہائشی ہے جو اکثر دہی کی جستی کٹوری ہاتھ میں پکڑے مسلم بازار میں گھومتا پھرتا نظر آتا ہے۔سلیم کے صرف دو ہی شوق ہیں۔

1۔ محلے میں ہونے والی شادی کی ہر تقریب میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا اور تیاریوں میں ہاتھ بٹانا خصوصاً پورے محلے میں شادی کارڈ اور چاول تقسیم کرنا۔

2۔ ہر قسم کی شادی میں ولیمے کی بو سونگھ کر فوراً نازل ہو جانا اور زکوٹا جن کی طرح ہر ایک سے کہتے پھرنا'' مجھے کام بتاؤ میں کیا کروں، میں کس کو کھاؤں؟''۔

سلیم واقعی ایک عجیب وغریب کریکٹر ہے، اگر اسے شہر کی چلتی پھرتی اسٹریٹ ڈائریکٹری کہا جائے تو بے جا

نہ ہوگا۔ محلے میں کسی بھی انسان حتیٰ کہ جن، بھوت، پریت، چڑیل اور پری تک کے ٹھکانے کا پتہ سلیم کو ازبر یاد ہوتا ہے اور تو اور سلیم ہر اس بندے کو بھی جانتا جس کے وجود کے بارے میں بلائیں اور چڑیلیں بھی لا علمی کا اظہار کر چکی ہوں۔ اگر کوئی غلطی سے یا بھول کر سلیم خان کو اپنی شادی پر مدعو نہ کرے تو سلیم بے تکلف وہاں چلا جاتا ہے اور جاتے ہی دولہا سے گلہ کرنے بیٹھ جاتا ہے۔ شکایتی الفاظ اس وقت تک سلیم کے لبوں پر رہتے ہیں جب تک دولہا باپ نہیں بن جاتا اور جب دولہے کا بچہ بڑا ہو جاتا ہے تو سلیم اپنی توپوں کا رخ بچے کی طرف کر کے اس سے ''اَٹ نوٹ'' کا اظہار کچھ اس انداز میں کرتا ہے: ''بچہ! تیڈے پیومیکوں آپڑی شادی تے سڈانئیں ڈِتا، میکوں اجن تئیں ارمان ہِ، ہن تُوں آپڑی شادی تے میکوں نہ بُھلیں''۔

چاچا ٹماٹر: کسی زمانے میں چھوٹے بازار میں سبزی بیچنے والا چاچا ٹماٹر بہت مشہور ہوا کرتا تھا۔ ''چاچا ٹماٹر'' اس کی چھیڑ تھی اور اسے اس نام سے الرجی تھی۔ اگر کوئی اسے چاچا ٹماٹر کہہ کر مخاطب کرتا اور وہ گاہکوں میں مصروف ہوتا تو کام روک کر ٹماٹر اٹھا کر مخالف کو دکھاتے ہوئے سرائیکی کی ایسی خوفناک گالیوں سے نوازتا کہ جسے سن کر شیاطین بھی بھاگ کھڑے ہوتے اور اگر وہ فارغ بیٹھا ہوتا تو چھیڑنے والے پر باقاعدہ جسمانی حملہ کرنے سے بھی گریز نہ کرتا تھا۔

ٹوپیاں داشیر: چھوٹی سی داڑھی والے اس باتونی نوجوان کو یونیورسٹی کے شریر لڑکے اکثر بس میں ساتھ بٹھا کر یونیورسٹی کیمپس لے جایا کرتے تھے۔ دوران سفر پوری بس میں ''ٹوپیاں داشیر'' کے نعرے گونجتے رہتے تھے۔ یہ الفاظ اس کی چڑ بن گئے تھے چنانچہ جیسے ہی یہ الفاظ اس کے کانوں تک پہنچتے تو وہ بس میں سفر کرتی طالبات کا لحاظ کیے بغیر گالیاں دینا شروع کر دیا کرتا تھا۔ اکثر طلباء اسے اپنے ساتھ لیکچر رومز میں بھی ساتھ لے جاتے تھے، جہاں وہ پروفیسروں کے ساتھ کافی زور آزمائی اور مغز ماری کیا کرتا تھا۔

قیوم: گھنگھریالے ہلکے بال، ستواں ناک، دراز قامت، بغل میں بجتا ٹیپ ریکارڈر دبائے مزے سے پنجابی اور انڈین گانے سنتا اپنی دھن میں چلتا پھرتا یہ انسان بھی ڈیرہ کی مشہور شخصیت تھا۔ گانا سنتے سنتے کہیں رک کر کیسٹ تبدیل کرنے کے بہانے سگریٹ کا ایک کش بھی لے لیا کرتا تھا۔ اگر خوش قسمتی سے ٹیپ ریکارڈر بک جاتا تو قیوم کی کمیشن بھی کھری ہو جاتی ورنہ شام کو ٹیپ مالک کو واپس لوٹائے، اپنی مزدوری لیے

وہ گھر کی راہ لیتا۔ایک دفعہ کسی محلے کا ایک نوجوان نیا نیا تبلیغ کی طرف راغب ہوا تو اس نے اپنی واحد تفریح ٹیپ ریکارڈر کو بھی ٹھکانے لگانے کا فیصلہ کیا۔اس موقع پر کسی دانش مند نے مشورہ دیا کہ اس شیطانی چرخے کو تلف کرنے کی بجائے اگر قیوم استاد کو دے دو تو وہ گھوم پھر کر اس کی اچھے دام دلوا دے گا۔مشورہ نہایت معقول تھا چنانچہ اس نے چند بیٹری کے نئے سیل ڈلوا کر ٹیپ ریکارڈر قیوم کے حوالے کر دیا۔قیوم کوئی دو ہفتوں تک ٹیپ ریکارڈر بغل میں دبائے شہر بھر میں گھوم پھر کر بجاتا رہا مگر بدقسمتی سے ٹیپ ریکارڈر کا کوئی خریدار نہ مل سکا۔آخر کار ٹیپ کے مالک نے پوچھا۔یار قیوم اگر میڈی ٹیپ نیں پئی وِکدی تاں میکوں ولا ڈے چا۔قیوم نے خوشی خوشی اسے ٹیپ واپس کرتے ہوئے دو ہفتوں کی مزدوری اور سیلوں کا اضافی خرچہ ملا کر ایک سو بیس روپے کا بل بنا ڈالا۔بل دیکھ کر ٹیپ ریکارڈر کا مالک چیخ اٹھا:یار قیوم اتنی قیمت دا ٹیپ نیں جتنا تیں بل بڑا دِتے،اگر میں کجھ ڈیں بیانہ پچھدا تاں تیڈی مزوری دے کیتے میکوں گھر دا سامان ویچنا پو ندا،بس توں ٹیپ آپڑے کول رکھ۔مگر قیوم بضد رہا کہ وہ مزدوری لے کر رہے گا۔جب معاملے نے طول پکڑا تو معززین کی مداخلت پر تصفیہ کرتے ہوئے اُسے قیوم کو ستر روپے دینے پڑے۔مارکیٹ میں سی ڈی اور ڈی وی ڈی پلیئر آجانے سے کیسٹ پلیئر کی مانگ میں خاطر خواہ کمی کے باعث اب قیوم کیا کرتا ہے ،کچھ پتہ نہیں۔

چاچا ریڈو: بستی گھائیاں والی کا رہائشی محمد رمضان عرف چاچا ریڈو غلہ منڈی کے قریب گلاب اور چنبیلی کے پھول بیچا کرتا تھا۔چاچا ریڈو تازہ پھولوں کو لکڑی کے ڈنڈے پر بڑے سلیقے سے لٹکائے اس پر شاپر چڑھائے بستی گھائیا نوالی،اسلامیہ کالونی،مسلم بازار اور چونگلہ جیسے روایتی راستوں سے گزرتا گھاس منڈی پر آکر دم لیتا۔اکثر شام کو جب وہ پھول بیچ کر مستانہ چال کے ساتھ خوشی خوشی واپس مسلم بازار کی حدود میں داخل ہو رہا ہوتا تو کہیں نہ کہیں سے چاچا ریڈو کی صدائیں بلند ہونا شروع ہو جاتی تھیں۔ یہ آوازیں دراصل چاچے کی چڑ تھیں،خصوصاً مسلم بازار میں ڈاکٹر قاسم سے لے کر ڈاکٹر امان اللہ تک کا علاقہ چاچے ریڈو کے لیے نو گو ایریا کی حیثیت رکھتا تھا کیونکہ اس علاقے میں ہی اسے زیادہ ستایا جاتا تھا۔ان آوازوں کو سن کر چاچا فوراً الرٹ ہو جاتا اور ناگہانی صورت حال سے نمٹنے کے لیے جیب میں پہلے سے موجود روڑے

اور پتھر نکال کر شریر لڑکوں پر بمباری کرنے کے ساتھ ساتھ انتہائی سخت الفاظ میں اُن کی مذمت اور مرمت بھی کیا کرتا تھا۔ چاچا ریڈو آج بھی گھاس منڈی میں کھڑے ہو کر پھول بیچتا ہے اور اگر عام حالات میں آپ اس سے ملیں تو ایسے لگتا ہے کہ جیسے اللہ میاں نے اسے موم کا بنایا ہو لیکن اگر آپ اسے یہ کہیں کہ :''چاچا ریڈو! تیڈی ریڈو کیرا کیرا اسٹیشن پکڑیندی ھ''؟۔ تو یہ سب سنتے ہی چاچے کی ساری کیمسٹری ،جغرافیہ اور حدود اربعہ تبدیل ہو جاتا ہے اور وہ جو شیلے الفاظ میں ارد گرد کے ماحول کو رنگین بنانے کے ساتھ ساتھ چھیڑ خانی کرنے والوں پر عقیدتوں کے پھول کچھ اس طرح نچھاور کرتا ہے:

''کھر کے دا....... اِیں ریڈو کُوں آپڑی.م......دوَ گھن ونج، اُوکوں چنگی طراں پتہ ھِ ایندے تے کیرا کیرا اسٹیشن آندے''۔

....

گُلی کملی کے دیس میں

معاشرے میں ہر انسان کی زندگی عموماً ایک ہی ڈگر پر چل پھر کر بسر ہوتی ہے لیکن کبھی نہ کبھی کسی بدقسمت انسان کی زندگی میں کچھ ایسا ڈرامائی موڑ بھی آتا ہے کہ جو اس کے روزمرہ معمولات کو یکسر بدل کر رکھ دیتا ہے۔ کوئی محیر العقول واقعہ، پراسرار حادثہ ایک جیتے جاگتے باشعور انسان کو زندگی کی عام ڈگر سے ہٹا کر اس کے شعور، لاشعور اور تحت الشعور کو یکسر صاف کر کے رکھ دیتا ہے، اور اس بی ہیوئیر کو ہمارا معاشرہ پاگل پن کا نام دیتا ہے۔ عموماً جب کبھی بھی کسی خطے کی تاریخ لکھی جاتی ہے تو اسے عقل وخرد کے حامل دانشوروں اور منافق سیاستدانوں سے بھرا جاتا ہے جبکہ اپنے اردگرد بسنے والے سینکڑوں معصوم چہروں کو یکسر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ حالانکہ ہمارے مادیت پرست معاشرے کے یہی وہ بے غرض لوگ ہوتے ہیں جو جھوٹی روحانیت کا ڈھونگ رچا کر مذہب اور پرہیز گاری کے لبادے میں سادہ لوح افراد کے جذبات کا استحصال نہیں کرتے۔ یہ وہی لوگ ہوتے ہیں جو اپنے اندر کی کھوج میں ہی اپنی ساری عمر گزار دیتے ہیں، نہ راہ حیات میں ملنے والی خوشیاں ان کو مسرت بخشتی ہیں اور نہ ہی کسی پیاری چیز کے کھو جانے کا ملال ان کے چہروں سے عیاں ہوتا ہے۔ اپنے اردگرد ایک بے نام سی اداسی، غیر محسوس اضطراب اور نادیدہ تنہائی کا ہالہ بنائے یہ لوگ ہمارے ساتھ ساتھ چلتے رہتے ہیں۔ ان کے بھی دوست احباب ہوتے ہیں، رشتے اور

رفاقتیں ہوتی ہیں جن کی یادیں ریت کے دریا میں کہیں دفن کیے یہ لوگ اپنے آپ میں جی رہے ہوتے ہیں۔ یہ اللہ والے کبھی بھی مصنوعی کرب کو اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیتے بلکہ معاشرے کی اذیت، بھوک، بے حسی اور مفلسی سے ان کے اندر کا ایک نیا انسان جنم لیتا ہے۔ جس کو آپ اور ہم جیسے عقلِ کل کا دعویٰ کرنے والے سمجھنے کی بجائے پاگل کہا کرتے ہیں۔ بلاشبہ زگ زیگ راستوں پر چلنے والے لوگوں کے درمیان صراط مستقیم پر قائم یہی اللہ لوک ہی ہمارے اردگرد کا اصل حسن ہیں۔ ان میں سے چند ایک کو مجھے کافی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، ان کا تذکرہ نہایت ضروری ہے۔

گلی کملی: اس اللہ لوک سیدزادی کا تعلق چاہ سید منور سے تھا۔ خمدار کمر، سانولی رنگت اور کمزور جسامت کی مالک یہ اللہ لوک مجذوبہ دنیا و مافیا کی پروا کیے بغیر سردی و گرمی سے بے نیاز اپنی الگ نگری بسائے گلی محلوں میں ننگ دھڑنگ گھوما پھرا کرتی تھیں۔ ہوش و خرد سے بیگانہ، گل بی بی جس کسی گھر کے اندر قدم رکھتی تو اس گھر کی خواتین بھاگم بھاگ کوئی قمیض ڈھونڈ کر اس کی حرمت ڈھانپنے کی کوشش کیا کرتیں۔ جوڑا پہنتے وقت گلی کملی کی سانولی سی پیشانی پر اکثر سلوٹیں ابھر آتیں۔ چار و ناچار اسے زبردستی کپڑے پہنائے جاتے، کھانا کھلایا جاتا اور اس سے دعائیں لی جاتی تھیں، مگر گھر سے باہر قدم رکھتے ہی وہ قمیض اتار کر نالے میں پھینکتیں اور اپنے آپ میں مگن آگے نکل کھڑی ہوتی تھیں۔ بھرے مجمع میں خود کو اکیلا اور تنہائی میں اپنے آپ سے باتیں کرنے والی عقل و خرد سے بیگانی اس اللہ لوک فقیرنی کو ننگ دھڑنگ حالت میں دیکھنے کی بجائے اُس وقت لوگ احتراماً منہ پھیر لیا کرتے تھے اور سر اٹھا کر چلنے والے نوجوان اپنی نگاہیں نیچی کر لیا کرتے تھے۔ اکثر اوقات عورتیں برقعہ اوڑھے کوئی نہ کوئی پرانا سوٹ ہاتھ میں لیے اس کے پیچھے بھاگتی دوڑتی دکھائی دیتیں تاکہ سیدزادی کے جسم کو ممکنہ حد تک ڈھانپا جا سکے۔ یہی وہ سنہری دور تھا کہ جب سماج میں اخلاقیات، روایات، شرم و حیا اور انسانیت ابھی زندہ تھی۔ کافی عرصہ ہوا گلی کملی ایک ٹریفک حادثے میں زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملیں۔ انہیں ان کے آبائی قبرستان چاہ سید منور میں انتہائی عزت و احترام کے ساتھ دفنایا گیا۔ میں جب کبھی اس سیدزادی کی زندگی کے بارے میں سوچتا ہوں تو خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ وہ اسّی اور نوے کی دھائی میں سرعام ننگا چلنے پھرنے کے باوجود اپنی حرمت

بچا کر عزت کے ساتھ اوپر چلی گئیں۔ اگر وہ ہمارے موجودہ پیپ زدہ، کھوکھلے، ہوس زدہ، جنسی طور پر فرسٹریٹڈ اور ہبلا سے کے مارے ننگے منجھے سماج میں ابھی تک زندہ ہوتیں تو شاید کبھی نہ بچ پاتیں۔ گلی کملی اگرچہ اس دنیا سے پردہ کر گئیں لیکن ڈیرے والوں کے دلوں میں وہ ہمیشہ زندہ رہیں گی۔

نانی جی: سانولی رنگت، کشادہ پیشانی، سفید بال، لمبا قد، آنکھوں پر نظر کا چشمہ اور چہرے پر پڑی جھریاں جس میں نہ جانے کتنی الف لیلہ جیسی کہانیاں چُھپی ہوئیں تھیں۔ یہ تھیں ''نانی جی''۔ ہمارے محلے کی واحد بزرگ ہستی کہ جن کی محبت ہر ایک کیلئے ہمیشہ بے طلب رہی۔ نانی جی دراصل محبت، وفا شعاری، خودداری اور ایثار کی ایک روشن مثال تھیں۔ شادی کے ابتدائی دنوں میں ہی ان کے خاوند کا انتقال ہو گیا تو انہوں نے ہمت نہ ہاری بلکہ محلے کی بچیوں کو قرآن مجید پڑھا کر اپنی گزر اوقات پوری کرنے لگیں۔ محلے بھر کی خواتین مختلف قسم کے روحانی اور طبّی مشوروں کے لیے اُن سے رجوع کرتیں مثلاً کسی بچے کو بخار آ جائے یا کسی کو سانپ بچھو کاٹ لے تو اس کا دم رکھا کرتی تھیں۔ انتہائی تنگدستی کے عالم میں بھی کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی بجائے پوری عمر یہ بے سہارا عورت صبر و شکر کی تصویر بنی رہیں۔ میں نے اپنی زندگی میں نانی جی کو کئی بار سڑک پار کروائی اور ہر بار ان سے دعاؤں کا فیض سمیٹا۔ نانی جی کو فوت ہوئے کچھ ہی سال ہوئے ہیں، اللہ کریم اسے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ (آمین)۔

عصمت: عصمت محلّہ گاڑی بان یا پھر محلّہ قصابان میں رہا کرتا تھا۔ ہمیشہ تھری پیس سوٹ میں ملبوس عصمت آدھی شیو کیا کرتا اور گردن کے بال چھوڑ دیتا، جب کوئی وجہ پوچھتا تو کہتا ''مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں بلیڈ سے گردن ہی نہ کٹ جائے''۔ عصمت ہر وقت کھمبوں کو روڑے وٹے مار کر اس سے باتیں کیا کرتا اور اکثر کھمبے کو کہتا ''ہیلو بش، ہیلو کلنٹن، گیومی دا ہول کنٹرول، آئی نو ہاؤ ٹو ہینڈل دا ہول ورلڈ''۔ شرارتی لوگ اس کے سر سے ٹوپی چھین کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں اور وہ بیچارہ ان کے پیچھے بھاگتا پھر رہا ہوتا تھا۔

مدُو خان: گلی قاضیانوالی کا رہائشی مدو خان ایک انتہائی پڑھے لکھے، سلجھے اور باعزت گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ مدو خان کلائی پر ایک خوبصورت اور قیمتی گھڑی باندھے، چپ چاپ اپنی دنیا بسائے ہر ایک کو اس امید پر تکتا رہتا ہے کہ کوئی اس سے وقت دریافت کرے گا۔ اگر بھولے سے بھی کسی نے مدو سے وقت پوچھ

لیا تو خوشی خوشی پاکستان اسٹینڈرڈ ٹائم کے علاوہ لندن، فرانس، جرمنی اور امریکہ تک کا وقت بتا دیتا ہے۔ مدو خان کا دوسرا شوق اپنے کمرے کی دیواروں کو ہر کوالٹی، ہر برانڈ اور ہر کمپنی کے وال کلاک سے سجانا ہے۔ ملٹری واچ اور دوسرے گھڑی سازوں سے زیادہ مدو خان کو پتہ ہے کہ کونسی گھڑی اچھی کوالٹی کی ہے۔

گاماں پانڈی: مسلم بازار کے محلّہ عیسب زئی میں تن تنہا رہنے والے اس محنتی اور جفاکش انسان کو سارا بازار گاماں پانڈی، گاماں روڑا، گاماں مادی اور گاماں گھر میسیت تھیوی کے خطابات سے چھیڑا کرتا تھا۔ جب لوگ اسے گاماں مادی کہتے اور اگر یہ فارغ ہوتا تو سرائیکی میں سلیس قسم کی ایک بھرپور گالی بھی دے دیتا تھا ورنہ عموماً چپ چاپ اپنے آپ میں مگن ہتھ ریڑھی کھینچے چلا جاتا تھا۔ سر کے پچھلے حصے پر پیدائشی گلٹیوں کی وجہ سے ''گاماں روڑا''، پیشے کے لحاظ سے گاماں پانڈی جبکہ چھیڑ خانی کے لیے گاماں مادی۔ اصل میں ان سب خطابات کا ذمہ دار ہمارا وہ کھوکھلا معاشرہ ہے جہاں ہر خوبصورتی بدصورتی سے جنم لیتی ہے اور جہاں نرم و نازک پھول کھردری اور بے جان زمین پر پیدا ہوتے ہیں، ایسے معاشرے میں انسانی رویے اگر غیر انسانی نہیں ہوں گے تو اور کیا ہوں گے؟۔ کچھ ہی سال ہوئے یہ پیارا انسان بھی اپنے خالق حقیقی کے پاس چلا گیا مگر جاتے جاتے اپنا سارا مال و متاع اور جائیداد محلے کی مسجد کے نام وقف کر کے واقعی ''گھر میسیت تھیوی'' کو سچ ثابت کر گیا ہے۔

جمعہ ''دولوشاہ'': محلّہ ڈاکٹر جلال شاہ سے تعلق رکھنے والا یہ درویش صفت انسان ایک لمبی سائز کا عصائے موسوی اٹھائے اکثر سرکلر روڈ پر دکھائی دیتا ہے۔ دکاندار اسے آتا دیکھ کر چھیڑنے اور ستانے کے بہانے دکانوں سے باہر نکل آتے ہیں تو یہ بے چارہ اللہ لوک سڑک پر رونے بیٹھ جاتا ہے۔ بدقسمتی سے آج بھی اگر جمعے جیسا کوئی اللہ لوک فقیر سڑک پر غلطی سے نکل آئے تو سڑک بلاک ہو جاتی ہے اور لوگ اس معصوم انسان کو دولوشاہ داچوہا کہتے ہوئے ستانے لگتے ہیں۔ دکھ کی بات یہ ہے کہ ہمارے سماج کے کچھ پڑھے لکھے لوگ بھی دوسروں کی دیکھا دیکھی اس قبیح فعل کا حصہ بن جاتے ہیں۔

جمعے سے مشابہہ جتنے بھی دولوشاہ ہیں وہ سب اللہ لوک فقیر ہیں اور ان کے بارے میں دو نظریات عام ہیں۔ ایک نظریہ یہ ہے کہ جن کے ہاں اولاد نہیں ہوتی وہ پیر دولے شاہ کی درگاہ پر جا کر

مخصوص منت مانتے ہیں اور پھر اس منت کے مطابق پیدا ہونے والا پہلا بچہ پیر شاہ دولہ کے مزار پر جا کر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اگر پہلے بچے کو مزار پر نہ چھوڑا جائے تو دوسرا بھی اسی طرح پیدا ہوتا ہے۔ جمعے کے متعلق بھی یہی خیال کیا جاتا ہے کہ اس کے والدین نے چونکہ اسے پیر دولو کے مزار پر نہیں چھوڑا تھا شاید اسی لیے اس کا دوسرا بھائی بھی ایسا ہی پیدا ہوا۔ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ پیر شاہ دولے کی منت کے بعد بچہ عموماً نارمل پیدا ہوتا ہے مگر جب اس کو مزار یا دربار پر چھوڑتے ہیں تو بچپن میں ہی اس کے سر پر لوہے کا ایک خول چڑھا دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے سر اور دماغ کی نشوونما رک جاتی ہے اور سر دھڑ سے چھوٹا رہ جاتا ہے۔ چاہے کوئی سا بھی نظریہ صحیح ہو اس کی گہرائی میں جانے کی بجائے ہمیں صرف اتنا پتہ ہونا چاہیے کہ یہ سب اللہ لوک فقیر ہماری محبت، توجہ اور ہمدردی کے طالب ہیں۔ اگر ہم ان کے ساتھ ہمدردی نہیں کر سکتے تو انہیں مذاق کا نشانہ بنا کر ان کی بے حرمتی اور اذیت کا سامان بھی پیدا نہ کریں۔

چاچا قادو (قادا کرڑی): واسکٹ اور پھتوئی میں پھرنے والا محلّہ خٹک کا رہائشی چاچا قادو جسے مذاق میں اکثر قادا کرڑی کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔ پینٹ شرٹ پہننے کا دلدادہ چاچا قادو زیادہ تر فلمی ڈائیلاگ بولتا یا پھر اپنے مسوڑھے چباتا نظر آتا ہے۔ ماضی کی مشہور فلم ایکٹریس نیلو کا عاشق اور ولن اسلم پرویز سے شدید نفرت کرنے والا چاچا قادو دن کو زیادہ تر محلّہ خٹک اور مسلم بازار جبکہ رات کو جمیل ہوٹل کے اردگرد اکثر منڈلاتا نظر آتا ہے۔ نیلو اور اسلم پرویز نے اکھٹے کون کون سی فلموں میں کام کیا تھا؟۔ ان فلموں کے ہدایتکار، موسیقار اور اسکرپٹ رائٹرز کون تھے؟۔ فلم کے کس سین میں اسلم پرویز نے نیلو کو اغواء کیا تھا اور اس موقع پر کون سے ڈائیلاگ بولے تھے؟۔ یہ سب کچھ چاچے قادو کو اسی طرح ازبر ہیں جس طرح سکول کے بچے کو دو کا پہاڑا۔ چاچا قادو ہمارے معاشرے کے اُن گنے چنے سادہ لوح انسانوں میں سے ایک ہے کہ جنہوں نے کبھی خود کو نیک اور متقی باور کرانے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی کبھی اس قسم کا کوئی جھوٹا دعویٰ دائر کیا ہے۔

اللہ ڈتہ عرف ڈتو ملنگ: بڑی بڑی حیران کن آنکھیں، پاؤں میں پلاسٹک کے چپل، گھٹنوں سے نیچے تک کالا چولا پہنے، منہ سے رال ٹپکائے ہر وقت ''دے خیا، دے خیا (دے سخیا، دے سخیا) کی صدائیں بکھیرتا، تھلہ

بموں شاہ، چوک سیٹھ اشرف اور اس کے گردونواح میں چلتا پھرتا اللہ ڈتہ فقیر عرف ڈِتو ملنگ ہماری اپنی نفرتوں اور سفاکیوں کی ایسی بھینٹ چڑھا کہ شیعہ سنی فسادات میں ہی مار دیا گیا۔ ہم ظالم لوگوں نے اس اللہ لوک فقیر کو بھی نہ بخشا۔

سَم پو: اپنی حرکات وسکنات، وضع قطع اور حلیے سے نیم پاگل نظر آنے والا یہ شخص آج سے دس بارہ سال پہلے کافی مقبول ہوا کرتا تھا۔ سم پو زیادہ تر بازار کلاں میں ہی چلتا پھرتا نظر آتا تھا۔ ''سم پو'' اس کی چڑ تھی اور اگر کوئی اسے اس نام سے چھیڑتا تو وہ جوابی کاروئی کرتا اور کسی کا لحاظ کیے بغیر جواباً کہتا: ''آپڑی م.....نال سم پو، آپڑی ب.....نال سم پو کتے دا.....''۔ سم پو کافی کاہل اور سست الوجود انسان تھا جو سارا سارا دن کسی دکان کے پھٹے پر یا راتوں کو کھلے آسمان کے نیچے موسم کی شدت سے بے نیاز وسوسوں کا سمندر دل میں بہائے، پیٹ میں گھٹنے ٹھونسے سوتا ملتا تھا۔ سنا ہے کہ سم پو کا بھی انتقال ہو گیا ہے۔

تصور: 1990ء کا یہ جسیم فقیر ایک ہی رٹ ''روپیہ ڈے چا، روپیہ ڈے چا'' لگائے رکھتا تھا۔ غالباً اس کا گھر بموں شاہ تھلے کے قریب کہیں واقع تھا۔ تصور بھی سنا ہے فوت ہو چکا ہے۔

اُچے خان: نیشنل بینک ٹانک اڈہ برانچ میں ملازم اُچے خان خاصا پڑھا لکھا، مہذب انسان تھا، مگر یہ نام اس کی چڑ تھی۔ اگر اسے کسی نے نماز کے دوران بھی ''اُچے خان'' کہہ دیا تو نماز توڑ کر گالیاں دینا شروع کر دیتا تھا۔ اُچے خان دماغی طور پر بالکل ٹھیک ٹھاک تھا لیکن ہمارے غیر انسانی رویوں نے اسے پاگل بنا دیا تھا۔

وڈے بھرانے چھوٹے کوں کے آکھیا؟: مجھے اس فقیر کا اصل نام یاد نہیں مگر یہ الفاظ اس کی چڑ ہوا کرتے تھے۔ یہ بہت اچھا تیراک تھا اور اکثر دریائے سندھ کے کنارے اپنی دھن میں چلتا پھرتا نظر آتا تھا۔ اگر کوئی اسے ''وڈے بھرانے چھوٹے بھراکوں کے آکھیا؟'' کہہ کر چھیڑنے کی کوشش کرتا تو یہ موسلا دھار گالیاں برساتا تھا۔ سلوٹ زدہ بوسیدہ لباس میں ملبوس اس شخص کا شمار بھی ان چند لوگوں میں ہوتا تھا جو ہمارے شہر کی محدود زندگی اور محدود وژن کی قید سے نکل کر لامحدود کی فضاؤں میں پرواز کرنے کے لیے کبھی کبھی نشے کا استعمال کر لیا کرتے ہیں، مگر ہیروئن کی زیادتی نے اسے عقل وخرد سے بالکل ہی بیگانہ کر دیا تھا۔

نذیر دھوبی: نذیر اپنی دھن میں رہنے والا ایک شریف النفس انسان ہے جو مسلم بازار میں کبھی کپڑے استری کیا کرتا تھا۔ نذیر ملکہ ترنم نور جہان کی مدھر آواز کا بچپن ہی سے دیوانہ تھا۔ اسی شوق کی خاطر وہ کام کرنے کے ساتھ ساتھ مستقلاً ریڈیو بھی سنتا رہتا، جیسے ہی ملکہ ترنم کا کوئی گانا آن ایئر آتا تو نذیر گرم استری اسٹینڈ پر رکھ کر بڑی محویت سے پہلے پورا گانا سنتا اور پھر سے دوبارہ اپنے کام میں جت جایا کرتا تھا۔ اسی معصوم شوق کی مناسبت سے نذیر کو نور جہان کا عاشق کہا جانے لگا، جس سے وہ پہلے پہل تو بہت خوش ہوا لیکن رفتہ رفتہ یہ نام اس کی چڑ بنتا چلا گیا۔ نذیر ان سیدھے سادے بے غرض انسانوں میں سے ایک ہے کہ جنہیں اگر غصہ دلایا جائے تو وہ اسے پینے کی بجائے کھلم کھلا اس کا برملا اظہار کر دیا کرتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنی صاف دلی اور سادہ مزاجی کے سبب دن میں ایک آدھ بار جھگڑا بھی کر لیا کرتے ہیں، مگر یہ لوگ عموماً اس وقت جھگڑتے ہیں جب کوئی انہیں بھڑکاتا یا ستاتا ہے۔ ٹھنڈا ہوتے ہی پھر خود بتا رہے ہوتے ہیں کہ فلاں نے اُسے چھیڑا تھا۔

گدڑ (گیدڑ): یہ شخص گہوارہ پارک کینٹ کے سامنے بنے کسی بنگلے میں ڈرائیور تھا اور ہر وقت میلشیا کے کپڑوں میں ملبوس ننگے پاؤں پھرا کرتا تھا۔ اگر لوگ اسے گدڑ کہہ کر چھیڑتے تو یہ گاڑی روک کر جوابی کاروائی کرتا تھا۔

رزاق ویلڈر: نیو بنوں چونگی کے رہائشی عبدالرزاق بے چارے کا دماغی توازن اگرچہ گڑبڑ تھا مگر دوسری طرف یہ انتہائی قابل مستری بھی تھا۔ لوگوں کے بار بار چھیڑنے سے ایک خاص قسم کا نفسیاتی اثر اس کے دماغ پر پڑا جس سے اس کے لہجے میں کڑواہٹ، چڑچڑاپن اور انتقام کے ساتھ ساتھ اذیت پسندی کے تمام اوصاف شامل ہوتے چلے گئے۔ مزاج کی تیزی کی وجہ سے کوئی گاہک اس کی دکان پر نہیں چڑھتا تھا۔ رزاق اکثر سکوٹر پر پھرا کرتا، اگر کوئی اسے چھیڑتا تو سکوٹر سمیت اس کا گھر تک پیچھا کیا کرتا۔ وہ اپنی گلی میں بھی کسی کا آنا جانا پسند نہیں کرتا تھا اور بعض اوقات انجان آدمی پر تو باقاعدہ حملہ بھی کر دیا کرتا تھا، خاص کر اس کا چھاپہ مار گوریلا حملہ محلے بھر میں مشہور تھا۔ کوئی پانچ سال ہوئے کہ رزاق بھی اللہ کو پیارا ہو گیا۔

گُلا: مسلم بازار میں ہر کسی کے سامنے کولگیٹ ٹوتھ پیسٹ کی مسکراہٹ بکھیرنے والا گُلا ڈاکٹر غلام قاسم مرحوم

کا نوکرِ خاص تھا۔گلا جب نیا نیا شہر میں آیا تھا تو دماغی طور پر بالکل ٹھیک ٹھاک تھا مگر محلّہ قاضیاں کے کچھ شرارتی لڑکوں نے اسے ذہنی اذیتیں دے دے کر نفسیاتی مریض بنا ڈالا تھا۔اکثر جب وہ مائی تیلن کے تندور سے ڈاکٹر صاحب کیلئے روٹیاں لگوا کر واپس جا رہا ہوتا تو بازار کے کچھ شریر لڑکے اس سے روٹیوں کا تھال چھین لیتے یا ایک آدھ روٹی اٹھا کر بھاگ کھڑے ہوتے تھے۔گُلا بیچارہ روٹیوں سے بھرا تھال سڑک پر رکھ کر اینٹ روڑہ اٹھائے ان سب کے پیچھے بھاگ رہا ہوتا تھا۔گھر کے کام کاج کے علاوہ ڈاکٹر صاحب اپنے کمپاؤنڈروں،قیمتی انجکشنوں اور گولیوں کے اسٹاک پر نظر رکھنے کے لیے گُلے کو پارٹ ٹائم جاسوسی کے طور پر بھی استعمال میں لایا کرتے تھے۔ڈاکٹر صاحب کی وفات کے بعد حافظ خیر احمد قبرستان کے نزدیک بنائے گئے ڈاکٹر غلام قاسم میموریل کلینک کے باہر بے دھیانی میں ایک زاویے پر منہ کھولے کولگیٹ کی مسکراہٹیں بکھیرتا گُلا آج بھی اکثر دکھائی دیتا ہے۔

ربڑ دی ب: یہ کافی بڑی عمر کا بزرگ تھا جو مسلم بازار اور گلی قاضیا نوالی میں ہتھ ریڑھی پر ہاتھ سے چلنے والے پروجیکٹر کو رکھ کر بچوں کو ساکن تصاویر دکھا کر دو آنے، چار آنے معاوضہ وصول کیا کرتا تھا۔ بچے دوربین کی مدد سے تصویریں دکھانے والے اس بوڑھے شخص کے گرد جمع ہو جایا کرتے تھے۔اس کے پاس بچوں کا دل لبھانے کے لیے کئی قسم کی شاہکار تصاویر ہوا کرتی تھیں۔وہ بچوں سے چار چار آنے معاوضہ لے کر باری باری دوربین کسی ایک کی آنکھوں سے لگاتا اور کہتا ''وہ مکہ دیکھو، مدینہ دیکھو، غارِ حرا، جدہ، ریاض دیکھو''۔ تصویری نمائش کے ساتھ ساتھ اس کی لائیو کمنٹری بھی لاجواب ہوا کرتی تھی۔ربڑ دی ب اس کی چڑ تھی اور اگر کوئی اسے اس نام سے چھیڑتا تو وہ کافی برا مناتا تھا۔سالوں ہوئے یہ شخص فوت ہو گیا ہے۔

حافظ: پتھرائی سی آنکھیں، بے ترتیب بال، ناخن، دانت اور بے ہنگم شیو کے ساتھ تپتی دھوپ میں میلا پھٹا پرانا کمبل اوڑھے کسی گہری یاد میں کھویا، سوچوں میں گم حافظ واقعی ایک مجذوب شخص تھا۔وہ سردیوں کی یخ بستہ راتوں اور سرد ہوا کی سرسراتے تھپیڑوں میں ایک پتلا سا جوڑا جبکہ گرمیوں میں موٹی جرسی پہنے اوپر کمبل اوڑھے تپتی دھوپ میں اکثر سویا ملتا تھا۔کہا جاتا ہے کہ ایک دفعہ یہ معصوم انسان سویا ہوا تھا کہ کسی ٹریکٹر والے نے جان بوجھ کر اس غریب کے پورے بازو پر ٹریکٹر چڑھا دیا مگر اس اللہ لوک کو کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔

ادھا(آدھا): یہ جمیل ہوٹل پر چائے پلانے کا کام کیا کرتا تھا۔ پستہ قد کا یہ انسان اندر سے کافی ٹھنڈے مزاج، نیک طبیعت اور مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔ کافی لوگ اسے چھیڑتے اور ستاتے ،لیکن انتہائی پرہیز گار، عبادت گزار اور نرم خو، سلجھا ہوا یہ شخص اکثر خاموش رہتا اور کسی کو گالی دینا تو درکنار اس کے چہرے پر ناگواری کی سلوٹ تک دکھائی نہ دیتی تھی۔

نازا پاولی: پرانی پتلی چھلکا سی بنیان، جس کا رنگ مٹیالا سرمئی اور جس میں ان گنے چھید۔ بدبو کے سخت زور آور قسم کے اٹھتے بھبھکوں والا یہ شخص اسّی کی دھائی میں قاضیاں والی گلی کے ایک کوچے کی نکر پر بنی تنگ و تاریک کھوئی میں رہا کرتا تھا۔ نازا پاولی دنیا و مافیہا سے بیگانہ تھا۔ کافی عرصہ ہوا اس کا انتقال ہو چکا لیکن ابھی تک لوگ اسے یاد کرتے ہیں۔

گاماں لالی: بے دھلا منہ، پیلے دانت، جامنی مسوڑھے، ناخنوں میں بڑھی میل اور پھٹی ایڑیاں۔ 1980ء کی دھائی کا یہ اول جلول سا اللہ لوک مٹی کے کھلونے بنایا کرتا تھا،'' گاماں لالی'' اس کی چڑ تھی، گاماں لالی بھی فوت ہو گیا ہے۔

کرامتا: گلی پونگراں والی کا یہ فقیر ایک ٹانگ سے اپاہج تھا۔

زما: یہ اکثر غلہ منڈی اور تھلہ بموں شاہ میں سیٹیاں بجاتا دکھائی دیتا تھا۔

ان سب اللہ لوکوں کے علاوہ کپڑوں کی پوٹلی کبھی بغل میں دبائے تو کبھی کندھے سے لٹکائے اپنے تھکے ہارے نڈھال وجود کو گھسیٹتی، گلی محلوں اور بازاروں میں رلتی پھرتی منو، شیلو کملی اور ثریا۔ من کے مندر میں ایک نئی دنیا آباد کیے سڑکوں اور گلیوں میں چلتے پھرتے دولو شاہ، گاماں پانڈی، کہیں آلتی پالتی مارے بیٹھے ابھاڑِ دھنگ اور'' کھوڑ بوڑ'' تو کہیں خاک پر نیم دراز'' سم پو''، سرِ راہ بیٹھے اپنی مٹی سے محبت کا اظہار کرنے والے اُچے خان اور نذیر اور ان جیسے کئی سرد و جامد جذبات لیے زندہ لاشوں کی طرح چلتے پھرتے افراد ہمارے غلط اور غیر انسانی رویوں کی پیداوار ہیں۔ یہ ہمارے معاشرے کے ستائے ہوئے وہ لوگ ہیں کہ جن میں سے اکثر کا کوئی والی وارث نہیں، اسی لیے یہ در در کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہیں۔ کچھ اللہ کے نیک بندے ایسے بھی ہیں کہ جو ان کے لیے روٹی کپڑے کا انتظام کرتے رہتے ہیں۔ یہ سب لوگ

اپنی ذات کے خول میں اپنے آپ کو چھپائے ،خوشبوؤں کو قید کیے،تتلیوں اور بھنوروں کی طرح اٹھلاتے ،بل کھاتے ہمارے اردگرد منڈلاتے پھرتے ہیں۔دراصل یہی وہ لوگ ہیں کہ جن کے پڑوس میں خدا،گلی میں فرشتے ، بادل اور تتلیاں رہتی ہیں۔خیال رہے کہ ان اللہ لوک بھنوروں اور حساس تتلیوں کو پکڑنے ،ستانے اور مٹھی میں دبانے سے ان کے کچے رنگ کہیں پھیکے نہ پڑ جائیں۔ہمیں اللہ لوک فقیر اور مظلوم کی آہ اور بد دعا سے بچنا چاہیے،اگر یہ لوگ ہمارے بیچ سانسیں لے رہے ہیں تو ان کے کام آنا چاہیے اور اگر فوت ہو چکے ہوں تو ان کی بخشش اور مغفرت کے لیے دعا مانگنی چاہیے۔

.....

ماسی سرداراں

نوے کی دہائی میں مسلم بازار، گڑھی سدوزئی اور اسلامیہ سکول کے گردونواح میں گھوم پھر کر تازہ پھولوں کے ہار بیچنے والی ایک بوڑھی عورت بہت پاپولر ہوا کرتی تھی۔ مہکتے پھولوں کے ہار چھوٹی سی ڈنڈی پر لٹکائے اوپر گیلی ململ کا کپڑا ڈالے، تھوڑا سا خم نکالے گھر گھر جا کر ہار اور گجرے بیچنے والی اس ضعیف عورت کو لوگ ماسی سرداراں کہا کرتے تھے۔ ماسی سرداراں کا تعلق اس محنت کش طبقے سے تھا جو تمام عمر اپنا اور اپنے کنبے کا پیٹ پالنے کی خاطر محنت مزدوری میں جتا رہتا ہے۔ ماسی اپنے طبقے میں اس لئے بھی نمایاں تھیں کہ ایک تو وہ عورت تھیں، دوسرا اُس کا تعلق خوشبوؤں، خوشیوں اور خوشحالیوں سے تھا۔ جس عمر میں ہم نے اسے دیکھا وہ یقیناً اُس کی عمر کا آخری دور چل رہا تھا۔ ماسی سرداراں کا پرانا گھر نظام خان گیٹ کے قریب اسلامیہ سکول کے بالمقابل تھا، مگر جب اس جگہ پر دکانیں بننا شروع ہوئیں تو ماسی سرداراں بجلی گھر روڈ پر گرڈ اسٹیشن کے قریب کسی گھر میں منتقل ہو گئیں۔

پھول بیچنا پیشے سے زیادہ اُس کا شوق تھا۔ وہ علی الصبح اللہ نبی کا نام لے کر تازہ پھول بیچنے نکل کھڑی ہوتی تھی۔ اُسے خوب پتہ ہوتا کہ کن کن گھروں میں جا کر پھول بیچے جا سکتے ہیں۔ اسی لیے وہ زیادہ تر گڑھی سدوزئی، محلّہ خاکوانی، محلّہ خٹک، مسلم بازار اور گلی قریشیاں کے صاحب ثروت گھرانوں میں جایا کرتی تھی۔ اِن علاقوں کے بیشتر گھرانے اس کے پکے گاہک تھے۔ پھول بیچنے کے ساتھ ساتھ ماسی سرداراں کے مائنڈ میں اُن سارے گھروں کی ڈیٹا بیس موجود رہا کرتی تھی کہ جہاں پر گلاب اور رانبیل کے

پھول مفت میں حاصل کئے جا سکتے تھے۔ اکثر گھروں میں اسے پھول توڑنے کی اجازت تھی، مگر اس کے باوجود اگر کوئی لڑکی بالی ماسی کو پھول توڑنے سے منع کرتی ''ماسی توں ساڈے پُھل نہ تروڑ''۔ وہ آگے سے کہا کرتی: ''بچڑا اے پُھل اُووِیں وِی رکر کے ازَائے تھی ویسن، میں غریب دے کم آ ویسن، دُعاواں ڈیساں''۔ گھروں میں کام کرنے والی لڑکیوں اور ماسیوں سے متھا مارنا گویا اُس کے پیشے کا حصہ تھا اور وہ روزانہ خندہ پیشانی سے نہ صرف ان سب کا مقابلہ کیا کرتی بلکہ منع کرنے کے باوجود اپنے حصے کے پھول توڑ کر لے جاتی تھی۔ پھولوں کے رومانس میں روزانہ میلوں پیدل چلنا اس کی روٹین کا حصہ تھا اور شاید یہی اُس کی طویل عمری کا راز بھی تھا۔ خواتینِ خانہ شادی بیاہ کے موقعوں پر اکثر ماسی سرداراں کو پھولوں کے ایڈوانس آرڈر دیا کرتی تھیں۔ وہ خوشی خوشی آرڈر لے کر سیدھا عیدگاہ کلاں کے عقب میں اعوانوں کے کھیتوں سے لے کر قاضیانوالہ قبرستان تک جہاں اب قدوس آباد کالونی ہے وہاں پر بنے کنوؤں کے اردگرد پھیلے گلاب، موتیا اور رابیل کے باغات سے خوشنما پھول خریدتی اور انہیں انتہائی عقیدت سے دھاگے میں پرو کر ڈنڈی پر لٹکائے شادی والے گھر حاضر ہو جایا کرتی تھی۔ ماسی سرداراں کے حساب کتاب کا طریقہ بڑا ہی ڈرامیٹک اور فول پروف ہوا کرتا تھا۔ وہ 12 روپوں کو ڈُوں اُتے ڈاہ، 6 کو ہِک اُتے پنج اور 8 کو ڈُوں گھٹ ڈاہ کہہ کر انگلیوں پر آناً فاناً حساب کر لیا کرتی تھی۔ اگر کوئی عورت خوشی سے کچھ اضافی رقم دیتی تو ماسی سرداراں قطعاً برا نہ مناتی اور رقم کو انتہائی سلیقے سے ململ کی چادر میں تہہ کر کے اوپر سے تین چار گانٹھیں کس دیا کرتی تھی۔ اسّی اور نوے کی دھائی کا زمانہ انتہائی سادہ پرامن اور کسی حد تک خوشحالی کا زمانہ تھا۔ اس دور میں خواہشوں کا پھیلاؤ جہاں محدود تھا وہیں خوشیاں اور غم بھی سب کے مشترک تھے۔ اسی لیے اُن دنوں ہر ایک کی جیب کم از کم دو تین پھولوں کے ہار خریدنے کی بخوشی اجازت دے دیا کرتی تھی۔ پھولوں کے ہار خرید کر گلے میں ڈالے جاتے، جوڑے کے گرد لپیٹے جاتے یا پھر مٹی کے کورے گھڑے کی گردن کے گرد لپیٹ دیئے جاتے تھے۔ اس طرح ماسی سرداراں کی خوب بکری ہو جاتی اور وہ خوشی خوشی گھر کو لوٹ جایا کرتی تھی۔

کبھی کبھار جب وہ راہ چلتے مل جاتی تو لوگ اس سے پوچھتے: ''ماسی سرداراں کوئی نویں تازی

ڈے''؟۔ ماسی کے ذہن میں پرانے وقتوں کی یادیں جمع رہا کرتی تھیں۔ اگر وہ فارغ ہوتی تو اپنے پرانے زمانے کا کوئی قصہ یا پھر کس خان کی شادی کس دور میں اور کس کے ہاں ہوئی ایسی دل جمعی کے ساتھ سناتی کہ جیسے یہ کوئی اہم تاریخی واقعہ ہو۔ کبھی کبھار جب اس کے ہار نہ بکتے تو وہ کسی جاننے والے کے گلے میں ہار ڈال دیا کرتی تھی۔ اکثر لوگ اس کی ضعیفی، بزرگی اور سب سے بڑھ کر ہاروں کی مہکتی خوشبوؤں کے سبب بغیر کچھ کہے معاوضہ ادا کر دیا کرتے تھے۔

ستر سے اَسّی کی دھائی میں پیدا ہونے والی نسل واقعی خوش قسمت تھی کہ اس نے ڈیرہ کے عہدِ زریں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ جب اس شہر کو واقعی پُھلاں دا سہرا کہا جاتا تھا۔ آبادی کا دباؤ کم ہونے کے باعث میونسپل کمیٹی کے پاس شہر کی صفائی کے لئے فنڈز بھی موجود رہا کرتے تھے۔ یہ وہی دور تھا کہ جب سرکلر روڈ سے دن کے اجالے میں کوئی ایک آدھ ٹرک یا مسافر بس ہی گزرتی تھی۔ موسم گرما خصوصاً بہار کا موسم آتے ہی سرکلر روڈ کے گرد گھیرا تانے کھڑے درختوں کی ٹنڈ منڈ شاخوں پر سبزہ اگنے لگتا اور ڈیرہ کے گرد و نواح کے علاقے رنگا رنگ قسم کے پھولوں کی خوشبوؤں سے مہک اٹھا کرتے تھے۔ اسلامیہ کالونی سے لے کر پہاڑ پور نہر تک بکھری ہریالی، کنوئیں، جھلاریں، کھجوروں کے درخت، پھولوں کے باغات اور سرکاری نرسری میں لگے مختلف خوشبو دار پودوں کی مہکتی خوشبوئیں جب ہواؤں میں رچے سبز پتوں کی آمیزش لیے سرکلر روڈ تک پہنچتیں تو اسلامیہ سکول کی دیواروں کے ساتھ لگے ''کرنے'' کے پھولوں کی مسحور کن خوشبو بھی ساتھ شامل ہو جایا کرتی تھی۔ پھر جو کوئی بھی ان رومان پرور مقامات کے پاس سے گزرتا تو بھینی بھینی مہکتی خوشبو نتھنوں میں گھستے ہی اس کے اعصاب پر ایک عجیب قسم کی مستی اور سرشاری چھا جایا کرتی تھی۔ ریشمی کلائیوں میں لپٹے گجروں کے پھول جب کملانے لگتے تو انہیں کوڑے کرکٹ میں ڈالنے کی بجائے کسی کونے میں جمع کیا جاتا اور پھر مردہ پھولوں کی پوٹلی باندھ کر کسی مناسب دن دریا شاہ کی نذر کر دیا جاتا تھا۔ واقعی اس وقت کے ڈیرے وال اپنے سندھو اور اپنے پھولوں کے ساتھ تکریم کے رشتوں میں بندھے ہوئے تھے، مگر یہ امن، آسودگی اور خوشحالی کی آخری ہچکی تھی، پھر اس کے بعد خوشبوئیں مفقود ہوتی گئیں اور میونسپل کمیٹی کنگال۔ نتیجے کے طور پر گندگی، تعفن اور آلودگی اس شہر کا نیا تعارف بنی۔ آج

ہمیں اپنے اردگرد جتنی بھی غلاظتیں بکھری نظر آتی ہیں اس سے کہیں زیادہ بغض، عناد، تعفن، تعصب اور گندگیاں ہم نے اپنے اندر چھپا رکھی ہیں۔

یہ قانونِ قدرت ہے کہ پھول کھلنے میں تو وقت لیتا ہے مگر اس کے مرجھانے کے لیے چند پل ہی کافی ہوتے ہیں۔ آج کے اس پرآشوب دور میں جب بے محبتی کے احساس نے شہر کی فضاؤں کو بنجر کر دیا ہے، پھولوں کی خوشبو مردہ ہوگئی ہے اور پرندوں کی بولیاں مٹھاس سے عاری ہیں اور سہرے کی لڑیاں کملا گئی ہیں، اس کے ساتھ ہی موتیا کے پھول پرونے والی، رابیل کے گجرے بنانے والی اور گلاب کے پتوں کی بھری چنگیریں ہاتھوں میں لے کر خوشبوؤں کا کاروبار کرنے والی ماسی سرداراں بھی قصہ پارینہ بن گئی۔ ہاں مگر اُس دور کا احساس، اُس سمے کی خوشبو بھری یادیں اور اُس عہدِ کے سیدھے سادے، بھولے بھالے کردار ہماری یادوں میں آج بھی زندہ ہیں، بالکل ماسی سرداراں کی طرح کہ جو خود تو مرجھا گئی مگر اس کی یادوں کی بھینی بھینی خوشبو آج بھی چہار سو پھیلی محسوس ہوتی ہے۔

.....

گولے آلا گولا وَجا

رمضان المبارک کا چاند جب ہر سو نور کی چادر تانے کرہ ارض پر سایہ فگن ہوتا ہے تو طہارت و پاکیزگی، تزکیہ نفس اور رحمتوں کے در کھول دیئے جاتے ہیں۔ رمضان کا چاند آسمان پر رکتا، ٹھہرتا فضا کو منور کرتا اپنی منزل کی طرف دھیرے دھیرے آگے بڑھتا چلا جاتا ہے وہیں نیم غنودگی کے عالم میں مانوس سی آوازیں ابھر کر ہماری سماعتوں میں رس گھولنے لگتی ہیں۔ ''اٹھو روزے دارو، اللہ دے پیارو، وقت ہیوے اَسُو ردا، نغمہ پڑھو حضور دا''۔ یہ ان بے غرض نوجوانوں کی بخت بھری ٹولیاں ہیں جو بڑے چاؤ، ترنم اور شبنمی لہجوں میں گلی محلوں میں گھوم پھر کر لوگوں کو جگانے کا فریضہ سرانجام دے رہی ہیں۔ ساتھ ہی وقفے وقفے سے مساجد کے لاؤڈ اسپیکروں سے اعلان ہو رہا ہے۔ ''اٹھو اللہ دے پیارو، روزہ رکھ گھنوٹیم نکلا ویندا وے۔ وِی منٹ باقی رہ گین جلدی جلدی سحری کر گھنو''۔ باورچی خانے میں زندگی مختلف آوازوں کے روپ میں جاگ اٹھی ہے۔ کہیں گرما گرم پراٹھے اور سالن پکایا جا رہا ہے تو کہیں چائے کا دور چل رہا ہے۔ لیجئے چائے کی پیالی ابھی لبوں پر تھی کہ یکا یک گولا ٹھاہ ہوا اور چائے کو فٹافٹ پرچ میں ڈال کر غٹا غٹ حلق میں اتار دیا گیا۔ واقعی ڈیرے جیسا رمضان اور کہاں؟۔ ہمارے شہر کے روزوں کا نرالہ پن، پاکیزہ ماحول اور اچھوتا تصور باقی شہروں سے واقعی منفرد ہے۔ میرے ذاتی خیال میں ڈیرے وال جہاں کہیں بھی بس رہے ہوں گے ڈیرہ کے رمضان کو ضرور مس کرتے ہوں گے۔

ڈیرہ شہر میں رمضان المبارک کی خاص پہچان سحر اور افطار کے وقت گولا پھٹنے کی گونج دار آواز ہوا کرتی ہے۔ گولے کی دھمک سے سارا شہر کانپ اٹھتا ہے، اس کے ساتھ ہی چوگلے کی مسجد سے گھُو

گھُو (سائرن) بجنے کی آواز۔ اَسّی کی دھائی میں ہماری عمر کے بچے عموماً بڑوں کے ساتھ اٹھ کر بیٹھ جایا کرتے اور روزہ رکھنے کی ضد کیا کرتے تھے۔ انہیں بتایا جاتا ''بچڑا ہالے توں چھوٹا ہیں۔ اچھا توں مخمی روزہ رکھ چا''۔ جی بالکل ان دنوں بچوں کا دل رکھنے کے لیے مُخّمی روزہ (کُوڑا روزہ) رکھوایا جاتا، جس میں چھپ کر سب کچھ کھانے کی اجازت ہوا کرتی تھی۔ ''اماں میکوں روٹی دا بھوراڈے چا، میں وت کوٹھے وِچ لُک کے کھاساں، جو میکوں اج مُخّمی روزہ ھِ''۔ بچہ کچھ اور بڑا ہوتا تو اسے آدھے دن کا روزہ رکھوایا جاتا اور اس طریقے سے اس کی عملی تربیت کا شاندار اہتمام کیا جاتا تھا۔ پھر جب بچے کا پہلا روزہ ہوتا تو اس دن کو یادگار بنانے کی خاطر گھاس منڈی سے موتیا اور چنبیلی کے ہار خریدے جاتے اور خوشی خوشی بچے کو پہنائے جاتے، غرض اس دن سحری سے لے کر افطاری تک پرہمت اور صابر بچہ سب کی توجہ کا مرکز بنا رہتا تھا۔

مجھے یاد ہے کہ بچپن میں ہم سب کے لیے گولا پھٹنے کا منظر کسی ایڈونچر سے کچھ کم نہ ہوتا تھا۔ محلے کے سارے بچے یہ دل ہلا دینے والا منظر دیکھنے کے لیے اکثر مسجد کلاں کا رخ کیا کرتے اور مسجد کے سامنے مٹھو بکسٹال کے پھٹے پر کھڑے ہو کر بیتابی سے صحن میں رکھے لوہے کے پائپ کو تکتے اور ترنم کے ساتھ گاتے ''گولے آلا گولا وجا۔ نہ کھاسوں نہ پیسوں کریسوں دعا''۔ ایک مخصوص وقت پر گولا بجانے والا مسجد کے صحن میں رکھے لوہے کے پائپ کو آگ دکھاتا تو ردعمل کے طور پر انتہائی سرعت سے بارود فضا میں اوپر اٹھتا اور ایک مخصوص بلندی پر پہنچ کر اس میں سے شعلہ نکلتا جس کے ساتھ ہی گونج دار دھمک سے پورا شہر کانپ اٹھا کرتا تھا۔ گولا بجتے ہی اللہ اکبر کی ایمان افروز صدائیں پورے شہر کو اپنے حصار میں لے لیا کرتیں اور ہم سب ان صداؤں کے تعاقب میں قاضیانوالی گلی میں واقع اپنی مسجد کی طرف دوڑ لگا دیتے جہاں پر بچوں کی صف میں کھڑے ہو کر نماز ادا کی جاتی۔ اکثر اوقات پہلی رکعت کے دوران ہی مسجد لاٹو فقیر کا گولا پھٹنے کے خوف سے ہم میں سے کوئی نہ کوئی بچہ دہل جایا کرتا تھا۔ گولا بجنے سے چند ساعت پہلے ہی بچوں کی صفوں میں آوازیں آنا شروع ہو جاتیں: ''اوہ آیا گولا''۔ اگر کبھی گولا سجدے کی حالت میں بجتا تو آواز کی دھمک سے اکثر بچوں کا ماتھا فرش سے جا ٹکرا جاتا اور اگر رکوع کی حالت میں پھٹتا تو بچے کچھ ایسا گھبراتے کہ پوری صف میں بدنظمی پھیل جاتی اور دبی دبی ہنسی کے فوارے پھوٹ پڑتے نتیجتاً ہر نماز کے بعد

سب کو وارننگ ملا کرتی تھی۔ ان دنوں مسجد لاٹو فقیر کا گولہ بجنے کے بعد بعض گھروں کی چھتوں پر نقارے بھی بجائے جاتے تھے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ماہ رمضان میں سحر و افطاری کے وقت چلانے والا گولہ بارود مقامی طور پر بنایا جاتا ہے۔ ڈیرہ میں گولہ بارود بنانے کا فن ایک ہنر مند فیض محمد چوڑی گر کے خاندان کے ہاں پشتوں سے چلا آ رہا ہے۔ صوبائی حکومت نے اس خاندان کو خصوصی سرکاری لائسنس دے رکھا ہے۔ ماہ رمضان کے لیے آج بھی فیض محمد چوڑی گر کے بیٹے اور بھتیجے گولے بناتے ہیں۔

بچوں کے ساتھ ساتھ رمضان کے دنوں میں بڑوں کا مزاج بھی افسرانہ اور قلندرانہ ہو جایا کرتا تھا یہاں تک کہ شہر میں بھیک مانگنے والے فقیروں کی باڈی لینگوئج اور صدا کی ٹون بھی بدل جایا کرتی: ''بچڑا لکھی ماہ رمضان دا مہینہ ھِ، کجھ خریت ڈے چا مُتھاج کوں''۔ ماہ رمضان شروع ہوتے ہی بس اڈوں کے قریب مسافروں کے لیے خصوصی ریلیف ٹینٹ لگ جایا کرتے جس میں مسافروں کی بجائے زیادہ تر مقامی بے روز نہایت عقیدت و احترام سے گھسے رہتے۔ عموماً گرمیوں کا روزہ ڈیرہ کی عوام کے مزاجوں میں بھی گرمی لے کر آتا تھا۔ بازار میں اگر کوئی تیزی سے سائیکل تیز چلا رہا ہوتا، تیز بھاگ رہا ہوتا یا بات بات پر کسی سے لڑ جھگڑ رہا ہوتا تو لوگ سمجھ جاتے کہ آج اسے لنگڑی روزہ ہے۔ اکثر لڑائیاں سائیکل سواروں کی ایک دوسرے کے ساتھ ہونے والی ٹکر سے جنم لیا کرتی تھیں۔ عموماً بوڑھے اور جوان کے ٹکراؤ اور پھر آپس میں ان کی مڈ بھیڑ کے بعد کچھ اس قسم کے توصیفی الفاظ سننے کو ملا کرتے: ''اوئے تیکوں شرم نی آندی میکوں روزہ ھ تے اوہ وِی لنگڑا، وت وی تیں میڈے وچ سیکل ڈے ماری ھِ''۔ ''اوئے چاچا جھلیج کے گال کر، توں سڑک دے ادھ وِچالے وچ ٹرسیں تاں میں سیکل وت آپنے سر تے چلیساں، باقی توں میڈے واسطے روزہ رکھی ودیں کہ اللہ واسطے؟''۔ چاچے کی طرف داری کرتے ہوئے ہجوم میں سے کوئی بول پڑتا: شرم تے حیا کوئنی اج کل دے چھوراں وچ، ہک تاں اُبالا سیکل چلیندن، ڈوجھا چٹی داڑھی دا لحاظ وی نیں کریندے بِی بختے نہ تھیندے۔ پھر کوئی نہ کوئی بیچ میں دونوں کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے صلح صفائی کروا دیتا: ''چھوڑو یار ویندا کرو، لکھی ما رمضان ھ''۔ اس طرح بات ٹل جایا کرتی اور بے حال ٹریفک دوبارہ سے بحال ہو جایا کرتی۔ عصر کے بعد بازار کی رونقیں اپنے عروج پر پہنچ جایا کرتیں اور ہر طرف سائیکل سواروں

اور پیدل چلنے والے خریداروں کا رش دکھائی دیتا تھا۔کہیں ریڑھیوں پر شکار پوری اچار بیچا جارہا ہوتا تو کہیں ڈھکی کی کھجوروں کو''بصرہ کے تحفے'' بنا کر بیچا جاتا (ایک ریسرچ رپورٹ کے مطابق ڈھکی کی کھجور اپنی انفرادیت، غذائیت اور ذائقے میں بصرہ کی کھجور سے کئی گنا بہتر ہے،لیکن ناقص منصوبہ بندی کے باعث ڈیرہ کا یہ قدرتی میوہ بڑی مقدار میں ضائع ہوجاتا ہے)۔

رمضان کا گرم دن عصر کا رنگ لیے شام پر آن رکتا۔فضا میں دم توڑتی روشنی شفق کے کنارے جمع ہوتے ہی ایک غیر محسوس طریقے سے جسموں میں امیدوں کے دیے جل اٹھتے۔خوشیوں اور چاہتوں کے پل قریب آتے ہی بازاروں میں کاروباری سرگرمیاں عروج پر پہنچ جایا کرتیں۔ ایک طرف پکوڑوں،سموسوں اور کتلموں کی دکانوں پر جم غفیر دیکھنے کو ملتا تو دوسری طرف دودھ دہی کی دکان پر دکاندار کے اردگرد خلقت خدا کا جمگھٹا دکھائی دیتا تھا۔اکثر گھروں میں ثوبت اور دہی بھلوں کا خصوصی اہتمام کیا جاتا۔افطاری کی دعا مانگتے ہی بے قراری کے ساتھ ہاتھ جس چیز کی طرف اٹھتا وہ لیموں کا شربت ہوتا،جس سے تشنگی مٹا کر دلوں کو تقویت دی جاتی تھی۔نماز مغرب کے بعد ڈیرہ شہر انگڑائی لے کر بیدار ہو جاتا خصوصاً توپانوالہ بازار میں چائے کے ہوٹل کھل جاتے اور جمیل ہوٹل کی رونقیں بحال ہوجایا کرتی تھیں پھر شہر کی اکثر آبادی دریا کی سیر کرنے کے لیے ٹولیوں کی صورت میں گامزن ہوجایا کرتی تھی۔

اگلے روزے کی تیاری کے لیے اماں مجھے تین روپے دے کر منڈی پہلوان کی دکان سے ربڑی لینے کے لیے بھیجا کرتیں جو سحری کے وقت بڑے شوق سے کھائی جاتی تھی۔افطار کے وقت مسجدوں میں اکثر باداموں کے شربت سے روزہ داروں کی تواضع کی جاتی،شربت ختم ہونے کے بعد تراویح کے لیے جب سب اکھٹے ہوتے تو افطار میں شربت بانٹنے والے کے پاس کوئی نہ کوئی شخص بیٹھا کچھ اس قسم کا گلہ کررہا ہوتا:''کمال ھ یار،کڈاں میسیت وچ لت نہ رکھن آلے جگاں دے جگ شربت پی گین تے سیکوں ہک گلاس وِی نیں ملا''۔بھاگ بھرے مہینے کے آخری عشرے کی ابتداء ہوتے ہی بندگی،اطاعت اور رحمت ومغفرت کی برکھا پوری آب وتاب کے ساتھ برسنا شروع کردیتی۔عبادات میں تسلسل کے ساتھ خشوع وخضوع اور بڑھ جاتا ،ہر گھر سے کوئی نہ کوئی جوان اپنے محلے کی قریبی مسجد میں اعتکاف کی نیت سے بیٹھ جاتا۔بازاروں میں خرید

وفروخت کا انداز بھی بدل جایا کرتا تھا۔ چونگلہ کے اردگرد گول مارکیٹ، کلاں بازار، رحیم بازار اور توپانوالہ میں پاؤں دھرنے کو مشکل سے جگہ ملتی جہاں درزیوں اور جوتوں کی دکانیں رات گئے تک کھلی ملتیں۔ دکاندار اپنی دکانوں میں پشاوری چپلیوں کی ورائٹیز سجاتے، اس موقع پر جوتوں کے پہلے سے ناپ دے کر اکثر جوتیاں آرڈر پر بنوائی جاتیں: ''بچہ میں تاں پیونال ونج کے کھیڑی جتی دا ناپ وی ڈے آیاں'' (عید والے دن نئی جوتی اکثر لوگوں کے لیے لوہے کی جوتی ثابت ہوتی جو عید نماز سے واپسی تک گٹوں پر چھلوکنوں کی شکل میں اپنا لوہا منوا چکی ہوتی تھی)۔ آخری عشرے میں درزیوں کے نخرے بھی دیکھنے کے لائق ہوا کرتے، اکثر درزی رمضان کے درمیان میں ہی ''ہاؤس فل'' کا بورڈ آویزاں کر کے عزیز میاں اور مقبول صابری کی قوالیوں والی کیسٹیں لگا کر جھوم جھوم کر کپڑے سینے میں منہمک نظر آتے تھے۔ رمضان المبارک کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں لیلۃ القدر تلاش کرنے کے ساتھ ساتھ ہر محلے کی مسجد میں ختم قرآن کا خصوصی اہتمام کیا جاتا تھا۔ اس موقع پر مساجد کو دلہنوں کی طرح سجایا جاتا اور ختم قرآن کے بعد پورے محلے، شہر اور ملک کی سلامتی کے لیے خصوصی دعائیں مانگی جاتیں۔ جمعۃ الوداع کے موقع پر مساجد اہل ایمان سے بھر جایا کرتیں، اس متبرک موقع پر سال کے باقی مہینوں میں غیر حاضر رہنے والے چہرے بھی اکثر دکھائی دیئے جاتے۔ رمضان کے آخری عشرے کے آخری دنوں میں صبح سویرے ایک الوداعی جلوس نکالا جاتا جو باقی ماندہ بازاروں کا چکر کاٹتا ہوا مسلم بازار میں آ کر اختتام پزیر ہوتا تھا۔ اس موقع پر الوداعی کلمات پڑھے جاتے اور انتہائی جذباتی انداز میں ماہ مقدس کو الوداع کیا جاتا تھا۔ عید کا چاند نظر آتے ہی رشد و ہدایت کی مٹھیاں سمیٹنے کی خاطر اعتکاف کی نیت سے بیٹھنے والے خوش بختوں کے گلوں میں خشک فروٹ اور چھواروں کے پروئے ہار ڈال کر انہیں دولہا کی طرح گھروں میں واپس لایا جاتا تھا۔

ڈیرہ اسماعیل خان کی دھرتی پر اپنی رحمتوں کا سایہ کرنے والے ماہ مقدس کی سہانی یادوں کو سوچتے ہوئے آنکھوں کی پتلیاں کچھ ایسی نم ہو گئیں کہ جیسے من کے بیکراں سمندر سے یکا یک ایک چھل سی اٹھے اور کھارا پانی کناروں پر پڑے سیاہ پتھروں کو چوم کر ان پر یادوں کا گیلا لمس چھوڑتے ہوئے کسی نئی آنے والی طوفانی لہر کے استقبال میں واپس پلٹ جائے۔ نہ جانے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ جیسے ہم سب

آسودگی کا تابناک دور کب کا پیچھے چھوڑ آئے اور اب صرف ماضی کو حسین خواب کی صورت کھوج رہے ہیں۔ کہنے کو تو زندگی آج بھی رواں دواں ہے مگر فرق صرف اتنا ہے کہ اجالوں میں اندھیرے گھل سے گئے ہیں، توانائی سے بھرپور جسموں میں کمزوری اور ایک ان دیکھا سا خوف اتر آیا ہے۔ رگوں میں پھیلتے اندھیروں کے ساتھ بڑھتے اس خوف نے دھک دھک کرتے دلوں اور کانپتے قدموں کی چاپوں میں نئی سسکیوں کا اضافہ کر دیا ہے، پتہ نہیں خوشیوں اور چاہتوں کے پل ہم سے روٹھ کیوں گئے ہیں؟۔

.....

میں تھال مہندی دا چئی کھڑی ھاں

روہی، چولستان، تھل اور دامان کے پیاسے سینے پر خواجہ فرید کا کلام گنگناتے بگولے، آواز کی لہروں پر سفر کرتے تلور، پیلو کے درختوں تلے پیلو چنتی اور ''پیلو پکیاں'' جیسے رسیلے گیت گاتی ہیریں، سوہنیاں اور ان کی جھیل سی آنکھوں میں قید سرائیکی وسیب کے خوبصورت مناظر کا عکس لیے چوکڑیاں بھرتے سیاہ غزال، الغرض سرائیکی وسیب خطہءِ زمین پر ایک ایسا حسین گوشہ ہے کہ جسے اگر سانولی محبوبہ سے تشبیہہ دی جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ مصورِ عالم نے جس انداز میں اس کے چپے چپے میں رنگ بھر کے اس کے حسن کی آبیاری کی ہے، ساری دنیا کے مصور مل کر بھی ایسا شاہکار کینوس پر نہیں اتار سکتے۔

ازل سے ہی عشق و محبت کا مسکن چلی آ رہی سرائیکی وسیب میں خالق کائنات نے دریاؤں کے سرگمی پانیوں میں روہی، تھل اور دامان کے سُر یلے سُر ڈال کر محبتوں کی کوملتاؤں کے عکس کو کبھی ہیر کے سانچے میں ڈھالا تو کبھی سوہنی کے من موہنے روپ میں نکھارا۔ سوہنی کی وفا اور ہیر کی عشق و عاجزی میں رچی اس مٹی سے یہاں کے باسیوں کا وجود گوندھا گیا۔ تہذیبوں کو جنم دینے والی سرائیکی وسیب کی مٹی سے جڑی نرالی رسموں کا حال بھی اس کے لازوال حسن کی طرح مستانہ ہے۔ گِلہ دیتے ریشمی لبوں پر ''بے درد ڈھولا، ایویں نیں کریندا''۔ ڈھولے کی آس میں شرم و حیا سے سمٹی بیٹھی ڈھولن اور اس کے اردگرد روشنی کے ہالے میں مستانہ وار جھومر ڈالتے رسم و رواج۔ یہ ان رُتوں کا قصہ ہے کہ جب وسیب کے چپے چپے پر رسم و رواج کی شکل میں محبتوں کا رقص جب دھمالیں مارنے پر آتا تو اس حسین منظر دیکھنے کے لئے چاند دیوانہ وار تاروں کی بارات لیے بادلوں کی اوٹ سے باہر نکل آتا تھا۔ پھر چاندنی رُت میں چنبیلی کی کلیاں چنتے ہوئے رقص کیا جاتا، کہکشاؤں پر نام لکھے جاتے اور سرشار برستے رنگوں کی پھوار میں خوشیوں کی چنریاں

بھگوئی جاتی تھیں ۔آ یئے آج آنگن کی سنہری مٹی میں اگی ٹاہلی کی میٹھی چھایا میں بیٹھ کر مٹھاس میں گھلے شادی بیاہ کے رنگا رنگ رسم و رواج کے نام پر رنگین لمحات کو پھر سے یاد کرتے ہیں۔

شادی بیاہ جیسے معاملات میں قسمت کے ساتھ ساتھ زیادہ تر بڑے بوڑھوں کی دعاؤں کا بھی عمل دخل ہوتا ہے جو نو جوانوں کو اٹھتے بیٹھتے ملا کرتی ہیں۔'' شالا وڈی حیاتی ہووی تے سہرے بدھیں''، شالا تتی ہوا نہ لگی، جندڑی جیوی تے وڈی عمراں ہووی شالا''۔ دعائیں مستجاب ہوتے ہی مائیں اپنے گبھرو جوانوں کے لیے دلہن کی تلاش میں نکل کھڑی ہوتی ہیں۔ پہلے وقتوں میں عموماً گھر کی بڑی بوڑھیاں ہی رشتے طے کیا کرتی تھیں اورلڑکی پسند آتے ہی خواتین کا ایک دوسرے کے گھر میں آنا جانا شروع ہوجاتا تھا ۔لڑکی والوں کی طرف سے ہاں ہوتے ہی موسم کا پہلا پھل مثلاً آموں یا سنگتروں کی پیٹیاں، عید پر سویاں، چوڑیاں، مہندی، کپڑوں کا جوڑا، بقر عید پر بکرے کی ران دلہن کے گھر خصوصی طور پر بھجوائی جاتی تھی (خیر یہ گئے وقتوں کی باتیں ہیں، اب تو الیکٹرانک میڈیا اور سوشل نیٹ ورکنگ ویب سائٹس نے شادی بیاہ کے معاملات کو خاصا آسان بنا دیا ہے۔شادی آن لائن، فیس بک، ٹوئٹر کے علاوہ اب ایک اور سہولت بھی آ گئی ہے کہ ٹی وی پر لائیو کال کر کے اپنا لائف پارٹنر خود سلیکٹ کریں۔جن گھروں میں لو میرج کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا وہاں پر لو میرج کے اوپر ارینج میرج کو کچھ ایسے پینٹ کیا جاتا ہے کہ لڑکا لڑکی چوری چھپے ایک دوسرے کو پسند کر کے سب کچھ اندر ہی اندر ارینج کر کے والدین کو مطلع کر دیتے ہیں اور اس طرح یہ شادی ارینج میرج قرار پاتی ہے)۔

شادی کی تیاریاں: شادی کی تیاریاں شروع کرنے سے پہلے دونوں اطراف سے ختمِ قرآن کا انعقاد کیا جاتا ہے، اس کے بعد دولہا کے گھر والے دلہن کے گھر جا کر دلہن کے لیے انگوٹھی، چوڑیوں اور کپڑوں کا ناپ لیتے ہیں۔ پہلے وقتوں میں دلہن کے لیے سُچی کناری والا سوٹ ضروری سمجھا جاتا تھا مگر اب چونکہ شراروں اور غراروں کا دور ہے اسی لیے گوٹا کناری والا کلچرل سوٹ کہیں دکھائی نہیں دیتا۔اسی طرح پرانے وقتوں میں جب سونا سستا تھا تب ہار، کنٹھالہ، ٹِکا، تاج، جھمر، کنٹھہ، تلسی، گلوبند، نتھ، کنگن، چنبہہ، جھاری والے کانٹے، پازیب اور انگوٹھیاں نمایاں ہوتی تھیں۔دوسری طرف لڑکی کے لیے کپڑے، زیورات اور جہیز کا

سامان تیار کرنے کے ساتھ ساتھ رشتہ دار خواتین سلائی کڑھائی اور گوٹا کناری کا کام بھی سنبھال لیتی تھیں۔ کہیں ویلوٹ کے دوپٹوں پر ستارے ٹانکے جاتے تو کہیں دوپٹے رنگنے یا ٹھپہ لگوانے کے لیے دیئے جاتے تھے۔اب ہر چیز بازار میں ریڈی میڈ دستیاب ہے۔دولہا کی طرف کے کپڑوں کو'وری' بھی کہا جاتا ہے۔اسی طرح دلہن والوں کی طرف سے بھی زیورات، برتن اور کپڑوں کی تیاری شروع کر دی جاتی ہے۔دلہن کی طرف کے سامان کو''داجھ'' کہا جاتا ہے۔اکثر اوقات مائیں اپنے زیورات میں سے کوئی سا ایک بھاری زیور سنار سے دھلوا کر بیٹی کو بطور یادگار تحفہ بھی دیتی ہیں یا پھر ٹھوس زیورات کو تڑوا کر نت نئے جدید فیشنی ڈیزائنوں میں ڈھال کر جہیز میں رکھ دیا جاتا ہے۔دلہن والے دولہا کو بازار لے کر جاتے ہیں جہاں پر اسے خریداری کروائی جاتی ہے عموماً کلائی کی گھڑی، چپلی، کلاہ وغیرہ خریدنے کے بعد درزی کو نئے کپڑوں کا ماپ دیا جاتا ہے۔دلہن کی ماں دولہا کے ماں باپ، بھائی بہنوں اور قریبی رشتے داروں کے لیے بوچھن، رومال اور کپڑوں کے سوٹ خرید کر انہیں شادی کے وقت بطور تحفہ پیش کرتی ہے، ان تحفوں کو ڈیپ کہا جاتا ہے۔ تیاریاں مکمل ہوتے ہی دونوں خاندان آپس میں شادی کی تاریخ طے کرتے ہیں اور اس سلسلے میں اپنے اپنے خاندان والوں کو آگاہ کرنے کے لیے گنڈھیں کی رسم رکھی جاتی ہے۔

گنڈھیں کی رسم: شادی کی تاریخ مقرر کرنے کے لیے دولہا والے اپنے چند قریبی رشتے داروں کے ہمراہ دلہن کے گھر آتے ہیں، جہاں پر ان کی خوب خاطر مدارت کی جاتی ہے اور پھر سہرا بندی و نکاح کے لیے چاندرات کی مناسبت سے تاریخیں رکھی جاتی ہیں۔عموماً چاند کی چودھویں کو ترجیح دی جاتی ہے، جسے دونوں اطراف کی باہمی رضامندی کے ساتھ قبول کر کے دعا مانگی جاتی ہے۔دعا کے اختتام پر دولہا والے اپنے ہمراہ لائی مٹھائی، پھل یا چھوارے سب میں تقسیم کرتے ہیں۔گنڈھیں کی رسم کے بخیر وخوبی انجام پاتے ہی شادی کی باقاعدہ تیاریاں شروع کر دی جاتی ہیں۔ چونکہ سخت گرمی یا سردی میں مہمانوں کو ٹھہرانے کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے اسی لئے کوشش کی جاتی ہے کہ شادی ٹھنڈے میٹھے مہینوں (اکتوبر نومبر یا فروری مارچ) میں رکھی جائے، ہجری مہینوں میں ربیع الاول کو زیادہ فوقیت دی جاتی ہے۔

نویلاں: گنڈھیں کی رسم خالصتاً مردانہ فنکشن ہوتا ہے اسی لیے شادی سے ٹھیک نو دن پہلے دولہا والوں کی

طرف سے عورتوں میں نویلاں کی رسم رکھی جاتی ہے۔اس موقع پرڈھولک والی کو بلایا جاتا ہے،خوب ہلا گلا ہوتا ہے،گانے گائے جاتے ہیں اور دریس ماری جاتی ہے۔نویلاں کی رسم اب تقریباً متروک ہو چکی ہے۔

جوں جوں شادی کے مقررہ دن قریب آتے جاتے ہیں، دولہا کے ہاں خوب گہما گہمی دیکھنے کو ملتی ہے وہاں رات گئے تک اکھٹے ہو کر ڈھولک بجائی جاتی ہے، سہرے گائے جاتے ہیں، مہمانوں کی لسٹیں بنائی جاتی ہیں۔ پہلے وقتوں میں جب شادی کارڈوں کا رواج عام نہ تھا تو اس وقت نائن گھروں میں شادی بیاہ کے سندیسے پہنچایا کرتی تھی، مگر اب شادی کارڈ کو ہی کافی سمجھا جاتا ہے۔ دعوت ولیمہ کے لیے نائی کو بلوا کر اسے مہمانوں کی تعداد بتائی جاتی ہے جو ولیمے کے لیے پلاؤ اور زردے کی دیگوں کا حساب لگا تا ہے ۔اگر نائی پانچ دیگیں بتائے تو چھ پکوائی جاتی ہیں اور ساتھ ہی کہا جاتا ہے ''ھک دیگ زیادہ رکھوں جو کتھیں گھٹ گئی تاں نک نہ کپیجے''۔ڈیرہ شہر میں دعوت کے لیے بہترین قسم کے چاولوں کا پلاؤ پکایا جاتا ہے۔اسی دوران شادی والے گھر کی بیرونی دیواروں کو پیلی زرد بتیوں کی لڑیوں، لٹکتے فانوسوں اور داخلی دروازے پر کیلے کے درختوں سے خوب سجایا جاتا ہے۔گھر کے برآمدے اور صحن خصوصاً حجلہ عِروسی کو دولہا کے دوست احباب بڑی رغبت، چاؤ اور ارمانوں سے سجاتے ہیں۔منقش پلنگ کے گرد بانسوں کو کھڑا کر کے اس کے اردگرد گیندے کی لڑیاں لپیٹ کر کناروں پر ریشمی جھالر اور رنگا رنگ پھول پتیوں سے سیج سجائی جاتی ہے۔ در و دیوار پر ستاروں سی جھلملاتی، ٹمٹماتی نیلی، پیلی، ہری، سرخ اور گلابی بتیوں کے سائے میں'' ساون کن من لائی، چھلا میڈا جی ڈھولا'' اور ڈھول کی تھاپ پر وقفے وقفے سے دریس ماری جاتی ہے۔

مینڈھی اور باٹن: مینڈھی یا زلف کشائی کی رسم پوری سرائیکی وسیب میں شادی کی ایک بڑی عمرانی رسم کے طور پر آج بھی زندہ ہے۔اس رسم کی ادائیگی کے لیے دلہن کی سات مینڈھیاں گوندھی جاتی ہیں۔ دولہا والے دلہن کے لیے باٹن (ابٹن) تیار کرتے ہیں، عموماً نائن ابٹن گوندھتی ہے۔دولہا کی ماں اس موقع پر سب کو بلاتی ہے۔گبھرو دی چاچی، مامی، نانی، ماسی آ ؤ مل کے کُڑی کیتے باٹن تیار کروں۔ باٹن تیار کرنے کے بعد سب بارات کی شکل میں شام کے وقت دلہن کے گھر نکل کھڑے ہوتے ہیں اور وہیں پر پہنچ کر مینڈھی کی رسم ادا کی جاتی ہے۔سب سے پہلے دلہن کے اوپر سات رنگوں والا بوچھن ڈالا جاتا ہے جس

کے چاروں کونوں میں مصری اور پیسے بندھے ہوتے ہیں، پھر سات سہاگنیں دلہن کے بالوں میں گندھی مینڈھیاں یعنی بالوں کے بل کھولتی ہیں۔ اس موقع پر میراثن کہتی ہے میڈے ویلاں کتھاں گین؟۔ کُڑی دی ماں کتھے، بہن کتھے؟۔ ویلاں گھتو ویلاں۔ دلہن کی مینڈھیاں کھول کر بالوں میں تیل رچایا جاتا ہے اور چہرے پر باٹن ملا جاتا ہے۔ چہرے کے نکھار اور رنگت صاف کرنے کے لیے بنائے جانے والے باٹن میں عموماً کیسو پھل، خوشبو کا تیل اور ہلدی شامل کی جاتی ہے، جسے عورتیں دلہن کی گردن، منہ اور پیروں پر لیپ کرتی ہیں۔ باٹن اترتے ہی وجود سے اٹھنے والی سوندھی مہک، نازک سراپے پر ملائم چہرہ اور کھلی کھلی رنگت اسے مکمل دوشیزہ کا روپ دے دیتے ہیں۔ مینڈھی اور باٹن کی رسم کے بعد دلہن کا کسی کے بھی سامنے آنا برا شگون سمجھا جاتا ہے۔ مینڈھی کی رسم کے ساتھ ہی دولہا کلہاڑی یا لوہے کی کوئی چیز جبکہ دلہن چاقو چھری رخصتی والے دن تک اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔

مائیوں بٹھانا: شادی کی ایک رسم مائیوں بٹھانا بھی ہے، اس میں دلہن کو ہلکے پیلے رنگ کا سادہ لباس پہنا کر اوپر پیلا دوپٹہ اوڑھا دیا جاتا ہے، مٹھائی کھلائی جاتی ہے اور خوب ڈھولک بجائی جاتی ہے۔

رسمِ حنا (مہندی): ٹاہلی کی پھننگیوں پر زرد شام کا الوداعی بوسہ پڑتے ہی مہندی کی رنگیلی رسم کا آغاز ہو جاتا ہے۔ دولہا والوں کی طرف سے رنگا رنگ لباس میں ملبوس خواتین مہندی کا تھال اٹھائے دلہن کے گھر کا رخ کرتی ہیں۔ مہندی کی مخصوص بھینی بھینی خوشبو اس قدر جاندار ہوتی ہے کہ لگانے والیوں کا قافلہ جہاں جہاں سے گزرتا ہے وہاں وہاں ایک اچھوتا، مہکتا احساس چھوڑتا چلا جاتا ہے۔ سہیلیوں کے جھرمٹ میں سمٹی بیٹھی دلہن اپنا ہاتھ باہر نکالتی ہے اور سب باری باری اس کے ہاتھ پر مہندی رکھ کر صدقے واری جاتی ہیں۔ چھیڑ چھاڑ اور ہنسی مذاق کی بوچھاڑ میں پیلے دوپٹے اور ہم رنگ لباس میں دمکتے ہونٹوں پر سحر آمیز مسکان سجائے بیٹھے شرمیلے وجود کے گرد ڈھولک کی تھاپ پر ''میں تھال مینڈھی دا چئی کھڑی ہاں، میں تاں پھلا آلی سیج وچھئی کھڑی ہاں''۔ ''جیوے بنرا سہریاں والا مینڈھی لاون آئیاں''۔ ''ساون کن من لائی، اکھیاں چھم چھم وسیاں''۔ جیسے مدھر گیتوں کی لے پر زردی مائل روشنی میں دمکتے پتوں کی طرح رنگ برنگے آنچل اوڑھے

اک بے خودی میں جھومر ڈالتی ہنستی مسکراتی زرد رنگ پریاں، مہندی کے تھالوں سے اٹھ کر روشنی کی فضا میں رچی ہیجان انگیز مہک، پہلو میں مخصوص نشست پر بیٹھی دلہن اور وقفے وقفے سے اس کے سر پر وارے جانے والے نوٹوں کے جھرمٹ میں مہندی کے شگن پورے کیے جاتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر سادہ سے حلیے میں دلہن کے ساتھ جڑ کر بیٹھی نانی، دادی کی سج دھج بھی دیکھنے لائق ہوا کرتی ہے، جو نہ جانے کب سے سنبھال کر رکھی گئی سفید ساٹن کی شلوار اور سر پر اچکن کی سفید چادر میں نکھری نکھری دکھائی دیتی ہے۔

مکھن ماکھی، کھیر پلائی: دلہن کو مہندی لگانے کے بعد سارے لوگ دولہا کے گھر جاتے ہیں۔ اس موقع پر دولہا کے اوپر کناری والی چُنی ڈالی جاتی ہے اور اسے بھی مہندی لگائی جاتی ہے۔ اس موقع پر دولہا کے کسی قریبی عزیز رشتے دار کو سبھالا بنایا جاتا ہے۔ سبھالا دولہا کے ساتھ ٹک کر بیٹھا رہتا ہے اور مطالبہ کرتا ہے کہ اسے بھی مہندی لگائی جائے۔ مہندی لگانے کے بعد دولہے کی سالیاں چاندی کے کٹورے میں مکھن اور خوشنما گلاس میں لایا دودھ دولہا کو پلاتی ہیں، جس میں سے آدھا گلاس سنبھالا چیک کرنے کے بہانے غٹا غٹ پی جاتا ہے اور سالیوں کے شور مچانے پر باقی کا آدھا گلاس دولہا کو دیتا ہے۔ دولہا کو مکھن کھلانے، دودھ پلانے اور مہندی لگانے کے عوض منہ مانگی رقم بھی طلب کی جاتی ہے، اس موقع پر ہنسی مذاق کے ساتھ بارگیننگ بھی اپنے عروج پر ہوتی ہے۔ دولہے کی سالیوں کو خوب ستانے کے بعد سبھالا کچھ رقم ان کی مٹھی میں تھما دیتا ہے۔

گھڑی گھڑولہ: سرائیکی وسیب میں گھڑی گھڑولہ کی رسم اب مکمل طور پر متروک ہو چکی ہے۔ اس رسم میں دولہا کے یار دوست دھوم دھڑکے سے شرکت کیا کرتے تھے اور اس موقع پر دولہا کے سر پر سرخ کناری والی چنی ڈال کر اور ہاتھ میں کلہاڑی تھمائے اسے سبھالے کی آغوش میں پیدل کسی قریبی مسجد یا درگاہ پر لے جایا جاتا تھا۔ گھڑی گھڑولے کی رسم کو مزید پر مزاح بنانے کے لیے کسی قریبی دوست کو ریشمی کپڑے پہنا کر اس کے سر پر گھڑی رکھ دی جاتی تھی۔ جسے دولہا کے ہمراہ مختلف گلیوں میں پھرایا جاتا۔ دوست احباب اس موقعے پر دولہا اور اس کی نقلی دلہن کو حیلے بہانوں سے خوب چھیڑا کرتے اور ہنسی مذاق کر کے انہیں خوب تنگ کیا جاتا تھا، مگر سبھالا اُسے دوستوں کی طوفان بدتمیزی سے بچانے کی حتی المقدور کوشش کیا کرتا تھا اور

دولہا دوستوں کے شر سے بچتا بچاتا محلے کی کسی قریبی مسجد میں پہنچ جاتا۔ وہاں مسجد کے نلکے سے پانی کی گھڑی بھری جاتی اور سب لوگ ناچتے گاتے، جھمر ڈالتے واپس آجاتے تھے۔ گھڑی گھڑولے سے واپسی پر دولہا کے دوست اسے گھیر کر گھڑی اٹھانے کے عوض پیسے بھی بٹورتے تھے۔ یہ ایک بہت دلچسپ مرحلہ ہوتا تھا کہ ایک طرف دوست منہ مانگے پیسے لینے کی خاطر ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے، دوسری طرف دولہا اور اس کا سہالا انہیں کم پیسوں پر راضی کرنے کی پوری کوشش کیا کرتے تھے جس کے نتیجے میں خوب ہنسی ہنگامہ دیکھنے کو ملتا تھا۔ گھڑی گھڑولے سے ایک دن پہلے شادمانے کی رسم بھی خوب ہوا کرتی تھی جس کے فوراً بعد شادی کی گتھیاں بھری جاتیں اور ایک دوسرے کو گتھی بھرے لفافے مارے جاتے تھے، افسوس کہ مسرت بھری یہ معصوم رسمیں اب کہیں دیکھنے کو نہیں ملتیں۔

سرائیکی جھمر (درِیس): وسیب میں بکھرے خوشیوں کے اصل رنگ اس کی جھمر سے وابستہ ہیں جسے عرف عام میں دریس کہا جاتا ہے۔ خوشی سے درِیس مارتے لوگوں کے جھرمٹ کو ایک ردھم اور مٹھڑی تان دینے کے لیے ڈھول، توتیاں، شرناء اور بانسری جیسے موسیقی کے آلات استعمال کیے جاتے ہیں۔ جہاں بانسری نواز ایک طرف ڈھول کے ردھم پر کنپٹی کی رگیں تانے پھڑ پھڑاتے لبوں کے ساتھ ''کیا حال سناواں دل دا'' جیسے کومل سروں کے ساز چھیڑتا ہے وہیں لگے ہاتھوں گبھرو کے سر سے ویلیں بھی اکھٹی کر کے نام پکارتا چلا جاتا ہے ''ویل ویل کریم بخش دی ویل''۔ اس رسم کے لیے نوٹوں کی گڈیاں خصوصی طور پر بھنوائی جاتی ہیں اور نوٹوں کا پنکھا بنا کر دولہا پر نچھاور کی جاتی ہیں۔ خزاں کے پتوں کی طرح ڈولتے نوٹوں کے غبار میں ایک متوازن دائروی حرکت میں مخصوص ردھم کے ساتھ آگے پیچھے، اوپر نیچے ہوتے انسانی عضلات اور تالیوں کی گونج میں دریس مارتے سروں پر پھینٹے گئے نوٹوں کی لہر جب ہوا میں بکھر کر زمین کا رخ کرتی ہے تو ایسے موقعے پر نوٹ چننے کی آس میں کھڑے بالی بلوڑوں اور ڈھولی کی چھینا جھپٹی دیکھنے لائق ہوتی ہے۔

جہاں تک زنانہ دریس کا تعلق ہے تو اس کے رنگ ہی نرالے ہیں۔ نیلگوں روشنی اور مست فضا میں ڈوبے گھر کے آنگن میں نیلے، پیلے، ہرے، کالے، سرخ، سنہری، فیروزی، گلابی، کاسنی رنگی کرنوں میں قید مسرت کے سازوں میں لپٹے نازک گنگناتے وجود ''چھلا میڈا جی ڈھولا۔ اللہ جانے یار نہ جانے میڈا

ڈھول جوانیاں مانے۔ میڈا اچن مسات آ ایویں نیں کریندا۔ ساون کن من لائی''۔ بے خودی سے مسکراتے سنہری جسموں سے روشنی کے پھوٹتے فوارے اور ایک مدھر تان پر فضا میں لہراتی حنائی ہتھیلیوں کی کومل لہر جب ایک دوسرے سے ٹکراتی ہے تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے ان گنت رنگوں سے سجی کائنات کھلکھلا اٹھی ہو، آسمان کے افق پر پھلجھڑیاں پھوٹ پڑی ہوں اور گل رنگ روشنی کے جھماکے میں دامان کی سوہنی دھرتی پرنور میں نہائی حور پریاں اتر آئی ہوں، جن کے مہندی رچے ہاتھوں کی حرارت سے شوخ و چنچل کرنوں کی چنگاریاں ہر رخ، ہر کونے میں ناچتی پھر رہی ہوں۔ واقعی جھمر کے رنگ ہی وسیب کی خوشیوں کے اصل ثقافتی رنگ ہیں۔

سہرا بندی اور بارات: دولہا والوں کے گھر شادی سے ایک دن قبل رشتے دار اکھٹے ہو جاتے ہیں جن کی رہائش کیلئے نزدیکی ہمسائیوں کے گھروں سے چارپائیاں، بستر ے اور دیگر سامان اکٹھا کیا جاتا ہے۔ اس خاص موقع پر ہمسائے خصوصی تعاون کرتے ہیں۔ جن لوگوں کو رات کا بلاوا ہوتا ہے وہ اکثر دور کے رشتے دار ہوتے ہیں، اس لئے وہ سر شام ہی آ جاتے ہیں۔ پہلے وقتوں میں دولہا کو پوری برادری سر پر خوشبودار تیل لگاتی تھی۔ دولہا کے ہاتھ میں تلوار، کلہاری، بندوق، چاقو یا لوہے کی کوئی چیز ضروری سمجھی جاتی تھی۔ اس کے بعد قریبی مسجد میں جا کر دولہے کے ہاتھوں میں اس کا دادا، چچا یا قریبی بزرگ گانا پہناتے تھے۔ یہ لال رنگ کے دھاگوں سے بنا ہوا ہوتا تھا۔ دولہا کو برادری کے درمیان کھڑا کیا جاتا اور درود شریف پڑھا جاتا تھا۔ اس موقع پر ڈھول اور نقارہ پر خاص دھن بجائی جاتی تھی۔ دولہا کو پرانے کپڑوں میں دلہن کے گھر لے جا کر نئے کپڑے پہنائے جاتے تھے جبکہ پرانے کپڑے نائی کو دے دیئے جاتے تھے مگر اب رواج بدل گیا ہے اور دولہا گھر سے ہی تیار ہو کر آتا ہے۔ مگر نکاح والے دن شام ہوتے ہی دولہا کو گانا باندھ کر سہرا آج بھی پہنایا جاتا ہے اور دعائیں بھی مانگی جاتی ہیں۔ دوسری طرف دلہن کو سرخ جوڑے کے ساتھ موتیے کے گجرے، گانا، کنگن اور ہار سنگھار سے خوب سنوارا جاتا ہے۔ آسمان پر ستاروں کی قندیلیں روشن ہوتے ہی بارات دلہن کے گھر کی طرف روانہ ہو جاتی ہے۔ جب موٹر کاریں عام نہیں تھیں تو دولہا کو گھوڑے پر سوار کیا جاتا تھا جس کے پیچھے ایک چھوٹا بچہ بھی بٹھایا جاتا اور تو تیوں، شہنائیوں اور ڈھولیوں کے ساتھ بارات دلہن

کے گھر چل پڑتی تھی۔ راستے میں وقفے وقفے سے گھوڑا روک کر ساتھ چلتے باراتی ڈھول کی تھاپ پر جھمر ڈالتے اور ریوڑیاں پھینکی جاتیں جنہیں چھوٹے بچے چن چن کر کھاتے تھے۔ دلہن کے محلے میں بارات داخل ہوتے ہی شور مچ جایا کرتا تھا: ''جنج آ گئی ھ، جنج آ گئی ھ''، پھر دولہا کو مسجد میں لے جایا جاتا جہاں نکاح خوانی کی رسم ادا کی جاتی تھی۔ پرانے وقتوں میں جب بارات دور جانی ہوتی تو دلہن کے لیے کجاوے کا انتظام کیا جاتا جس میں دولہا بارات کے ساتھ پیدل چلتا جبکہ عورتوں کو اونٹوں پر سوار کیا جاتا تھا۔ اونٹوں کے پاؤں میں گھنگھرو باندھ کر سجائے جاتے اور ساتھ ہی عورتیں خوشی کے گیت گاتی چلی جاتیں، آگے آگے ڈھولی اور شہنائی نواز چلتا جس کی مدھر دھنوں میں باراتی جگہ جگہ رک کر جھمر ڈالتے جاتے۔ وقت بدلتے ہی کجاوے کی جگہ پالکی اور پالکی کی جگہ اب موٹر کار نے لے لی ہے۔ اب دولہا کے لیے خصوصی طور پر کار سجائی جاتی ہے، جس کے اندر بیٹھ کر وہ باراتیوں کے ہمراہ نکاح کے لیے دلہن کے گھر پہنچتا ہے۔ نکاح خوانی کے بعد مبارکاں ہوون کے شور وغوغا میں دولہے کے دوست اور عزیز واقارب اس کے گلے میں نوٹوں کے ہار ڈالتے ہیں۔ دولہے کے والد کو سب لوگ مبارک بادیں اور سلامیاں دیتے ہیں۔ ایک آدمی رقم وصول کر کے کاپی میں اندرج کرتا جاتا ہے۔ دولہا کو اس کے بعد سبھالے کی ہمراہی میں دلہن کے گھر لے جایا جاتا ہے، جہاں پر ساس اسے انگوٹھی پہناتی ہے اور پھر تھوڑی دیر کے لیے دولہا دلہن کو ایک ساتھ بٹھایا جاتا ہے۔ دونوں پر ویلیں نچھاور کی جاتی ہیں اور اس کے بعد رخصتی کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ قرآن پاک کے سائے میں دلہن کو آنسوؤں کی جھالر میں ''ساڈا چڑیاں دا چنبہ'' جیسے غمگین گیت گائے جاتے ہیں اور وچھوڑے کا درد دل میں لیے دلہن گندم کی بھری تھالی سے مٹھ بھر بھر کر اپنے سر کے اوپر اچھالتی بابل کا گھر چھوڑ کر اپنے سر کے سائیں کے حوالے کر دی جاتی ہے۔ گندم کو چونکہ وسیب میں خوشحالی کی علامت سمجھا جاتا ہے اس لیے گندم اچھالنے کی رسم سے یہ تصور کیا جاتا تھا کہ اب دلہن کا اس گھر سے دانہ پانی اٹھ چکا یا پھر یہ کہ باپ کا گھر چھوڑنے کے بعد بھی یہاں سدا خوشحالی رہے۔ بارات دولہا کے گھر پہنچتے ہی دوست احباب گاڑی روک کر اپنی خدمات کے عوض سلامی کا تقاضا کرتے ہیں اور پیسوں کے معاملے میں سبھالے سے بحث وتکرار اور ان کا مصنوعی طور پر روٹھنا شادی کی خوشیوں کو دوبالا کر دیتا ہے۔

موہاڑی پکڑائی: دلہن کے سسرال پہنچتے ہی سب سے پہلے قربانی دی جاتی ہے، جس کے بعد دلہن کو گھر میں داخل کیا جاتا ہے۔ گھر کے اندر قدم رکھنے کے بعد دلہن اپنے دروازے کو پکڑ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ اسے موہاڑی پکڑوائی کہتے ہیں۔ دیہاتوں میں اس موقع پر دلہن کا سسر یا خاوند دلہن کو کہتا ہے فلاں گائے یا بھینس تمہاری ہے، بعض جگہوں پر نقد رقم یا سونے کی انگوٹھی دینے کا رواج بھی عام ہے۔ دلہن کے گھر میں قدم رکھتے ہی گھر میں چاندنی سی بکھر جاتی ہے اور پھر اسی چاندنی میں باقی ماندہ رسمیں ادا کی جاتی ہیں۔

پُھل چنائی: پھل چنائی کی رسم بھی کافی دلچسپ ہوتی ہے۔ اس رسم میں دلہن کی گود میں ہر قسم کا خشک میوہ رکھا جاتا ہے، جسے سرائیکی میں ''گڈ'' کہتے ہیں، اس کے بعد خاندان کے سب سے چھوٹے بچے کو دلہن کی گود میں بٹھایا جاتا ہے اور ہر طرف سے دعائیں دی جاتی ہیں۔ شالا اللہ جلدی بال ڈیوی۔ اس کے بعد شرم وحجاب کے خول کو توڑنے کے لیے کپاس کے پھول یا گلاب کی پتیوں کو سات بار ایک عورت دلہن کے سر پر رکھتی جاتی ہے اور دولہا اسے باری باری چنتا چلا جاتا ہے، پھر وہی پھول دولہا کے سر پر رکھے جاتے اور دلہن چنتی ہے، ساتھ ہی خوشی کے گیت بھی گائے جاتے ہیں۔

مُٹھ کھلائی: اس رسم میں دلہن کے ہاتھوں میں گلاب کی پتیاں دے کر اس کی مٹھی مضبوطی سے بند کر دی جاتی ہے، پھر دولہا سے کہا جاتا ہے کہ وہ بند مٹھی کو کھول کر دکھائے۔ اس موقع پر باقی لڑکیاں بھی شوخی کے ساتھ دلہن کی مٹھی پر اپنی گرفت رکھتی ہیں تاکہ دولہا اسے کھول نہ سکے اور اسے مجبور کر دیا جائے کہ وہ دلہن کی اہمیت کو تسلیم کر لے۔ آخر کار جب دولہا تھک ہار کر اپنی ہار مان لیتا ہے تو دلہن اپنی مٹھی کھول دیتی ہے۔ اس کے بعد دولہا مٹھی بند کرتا ہے مگر دلہن کے حنائی ہاتھوں کا لمس چھوتے ہی اکثر اپنی مٹھی کھول دیتا ہے۔

شیشہ ڈکھائی: یہ سب سے آخری رسم ہوتی ہے جس میں دولہا اور دلہن کے سروں پر ایک چادر ڈال کر درمیان میں ایک بڑا سا شیشہ رکھ دیا جاتا ہے۔ شیشے میں دونوں پہلی بار ایک دوسرے کا عکس دیکھتے ہیں، اس موقع پر بھی سہرے کے گیت گائے جاتے ہیں۔ نصف شب کی اس اختتامی رسم کے بعد نئے جیون کی اٹھان ہوتی ہے۔ پنڈولم کی طرح ڈولتے سناٹے، روشنی کے ہالے اور رنگ برنگی کاغذی پھولوں کی لڑیوں کے جھرمٹ میں گلاب و موتیے سے سجی سیج پر مہندی اور ابٹن کی خوشبوؤں میں لپٹی، موتیوں کے

گجرے، کنگن اور چوڑیوں سے سجی کلائیوں کے نرم وگرم حصار میں مستقبل کے خوشبودار جھونکوں کو سہلاتی۔ ارمانوں سے مہکتی حنا سے رچی ہتھیلیوں پر ابھرتی لکیروں میں دل، دماغ، زندگی اور قسمت کی لکیروں کو کسی کے نام کیے شرمگیں خیالات میں پور پور بھیگتی۔ گوٹے کناریوں سے سجے ریشمی غرارے میں گرما کی گیلی چڑیا کی مانند اپنے آپ میں سمٹی چھوئی موئی سی سورج مکھی کا پھول بنی شب عروسی کی دلہن۔ دروازے پر اٹھتی آہٹ اور قدموں کی چاپ سے سحر انگیز خیالات کے ٹوٹتے طلسم، شرم وحیا کی شدت سے بھاری پلکیں، کجراری مدہم روشنی میں نظروں کی شناسائی سے طلسمی ہونٹوں کی پھڑ پھڑاہٹ، نیم باز آنکھوں اور جامنی لبوں کے امرت دھارے میں مٹتی سہانی رات۔ سیاہ چمکیلی آنکھوں اور گھنی پلکوں کی چلمن میں عہد و پیمان کی بارشیں اور سانسوں کی بے ترتیب شرمیلی پھوار میں گم ہوتے زندگی کے یادگار لمحات۔ چاند کی نقرئی چاندنی تلے بادلوں کے سرمئی فرش پر نیند کے خمار میں پھڑ پھڑاتے کبوتروں کا جوڑا جو سورج کی نارنجی کرنیں پھوٹنے سے پہلے ہی اپنا آشیاں بنا چکا ہوتا ہے۔

دعوت ولیمہ: ڈیرہ شہر میں یہ رواج عام ہے کہ دعوت ولیمہ والے دن دلہن کی طرف سے حلوہ پوری اور چھولوں کا ناشتہ پہنچایا جاتا ہے۔ پھر دعوت ولیمہ کے وقت دلہن کے رشتے دار اس سے گھر پر ملنے آتے ہیں، سلامی دیتے ہیں اور وہیں سے ولیمے پر چلے جاتے ہیں۔ دعوت ولیمہ کی رسم میں ایک بار پھر دونوں گھرانوں کے عزیز و اقارب اور دوست احباب اکھٹے ہوتے ہیں۔ اس دعوت کا اہتمام حسبِ توفیق کیا جاتا ہے۔ عام طور پر روٹی سالن، ساگ، پلاؤ اور زردا پکایا جاتا ہے۔ قصائی سے جانور ذبح کروانا، دیگیں پکوانا اور کھانا تقسیم کرنا، یہ سب کام دلہا کے دوست احباب مل جل کر کرتے ہیں۔ عموماً کھلے میدانوں میں ٹینٹ اور شامیانے لگا کر کرسیاں رکھ دی جاتی ہیں' جوں جوں مہمان آتے جاتے ہیں انہیں عزت واحترام سے بٹھا کر کھانا پیش کیا جاتا ہے۔ ڈیرہ میں یہ رواج بھی عام ہے کہ دعوت ولیمے کی سہ پہر دلہن کی ماں، چچی، پھوپھی اور ممانی سب مل کر دلہن کے گھر پکوڑے لے کر جاتی ہیں اور وہاں پر چائے کے ساتھ سب کو پکوڑے کھلائے جاتے ہیں۔

ست واڑہ: پہلے وقتوں میں شادی کے ساتویں دن دلہن کا باپ یا چچا اپنے گھر کی رشتے دار عورت کے ہمراہ

شام کے وقت دلہن کے گھر آتا اور اسے اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔اس رسم کو ست واڑہ کہتے ہیں،لیکن آج کل یہ شادی کے دوسرے یا تیسرے دن کر دیا جاتا ہے۔مشہور شاعر جناب عبداللہ یزدانی ست واڑے کے بارے میں کیا خوب لکھتے ہیں:''چنگا تھی گے ماڑا تھی گے۔اِیویں سمجھ کباڑا تھی گے۔جیہڑی کُڑی تے میں ڈُھکدا ہام۔اُوندا اَج ست واڑہ تھی گے''۔

جوتا چھپائی: ست واڑے والے دن جب دولہا دلہن کے گھر جاتا ہے تو یہ رسم وہیں پر ادا کی جاتی ہے۔دولہا کی سالیاں دولہا کا جوتا چوری کر کے چھپا لیتی ہیں اور واپسی کے مطالبے پر اس سے رقم طلب کرتی ہیں،یہ بڑی دلچسپ رسم ہے اور ابھی تک مقبول عام ہے۔ست واڑے کی رسم شادی کی اختتامی کاروائی ہوتی ہے۔اس کے بعد آنے جانے اور میل ملاپ کا سلسلہ تاحیات جاری رہتا ہے۔

وقت کے زہریلے اژدھے نے جہاں ہماری سماجی،معاشی،ثقافتی اور تہذیبی رواداریوں کو نگل لیا ہے وہیں ہمارے ظاہر و باطن میں کنڈلی مارے بیٹھے پھنکارتے روکھے پھیکے خشک رویوں سے لے کر سندھ دریا کے خالص امرت دھارے تک سب کچھ زہریلی کثافتوں کی نذر ہو چکا ہے۔جس قدر ظلم وزیادتی وسیب کی سُچی ثقافتوں اور رسم و رواج کے ساتھ ہوئی ہے،کسی اور کے ساتھ نہیں ہوئی۔کتنی خوش رنگ،دلکش اور دل رُبا رُتیں قصہ پارینہ بنا دی گئی ہیں۔

سرائیکی وسیب کے بے مثل شاعر جناب سعید اختر سیال خوب لکھتے ہیں:

تیڈا وسبہ، سکوت سانگھے ☆ تیڈی بُدھ مت، پرم پریت
تیڈے جن دھن، کھیڈ اں میلے☆ تیڈی مَد قدیم دی رِیت
تیڈے جھمریں، ڈھول ڈھمکے☆ تیڈے نچدے ٹپدے مِیت
تیڈے سہرے، مینڈھیاں باٹن☆ تیڈے گھڑی گھڑولے گیت
آکھ ڈِتو نے سب پلیت

مذہب کی جامد فکر میں سماجی اور روحانی فرق کی گہرائیوں سے ناواقفیت کی بنیاد پر گانا باندھنا،سہرا بندی،گھڑی گھڑولہ،کپڑوں پر رنگ چھڑکنا،منہ دکھلائی اور شیشہ دکھلائی جیسی ثقافتی رسموں کو شخصیتوں کی انا

کا مسئلہ بنا کر ہندوؤں کے سر تھوپتے ہوئے یکسر ختم کر دیا گیا ہے۔مگر حقیقت یہ ہے کہ خوشی کی ان ریتوں کا کسی بھی دھرم سے دور تک کا واسطہ نہیں ہے بلکہ یہ تو ہماری اجلی ثقافت کی میراث تھیں۔

سرائیکی وسیب کی شناختی علامتیں اگرچہ اب آہستہ آہستہ مٹتی جا رہی ہیں لیکن دھرتی کے سینے پر عشق کے دائرے میں سر پر گھڑا رکھے جھمر ڈالتی، روشن ماتھے پر سہرا باندھتی، کلائیوں میں گانا اور کپڑوں پر رنگ چھڑکتی رسمیں اپنی مٹی سے ناآشنا لوگوں کو آج بھی یہی کہہ رہی ہیں کہ ان کا کسی دھرم سے کوئی لینا دینا نہیں بلکہ وہ تو سرائیکی قوم کی میراث ہیں۔ایک ایسی میراث، ایسی شناختی علامت، ایسی منفرد اکائی جو ثقافتی بنیادوں پر کبھی ہماری انوکھی پہچان ہوا کرتی تھی۔اس سے پہلے کہ ان ثقافتی خوبصورتیوں کو کسی میوزیم کا سرد شوکیس نگل لے، آیئے ہم سب سن آف سائل ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے آگے بڑھیں اور اپنی شناختی علامتوں کو مٹنے سے بچالیں کیونکہ زندہ قوموں کا یہی شیوہ رہا ہے۔

.....

ثوبت

جس طرح عربیوں کا ہریسہ اور شوآرما، بنگالیوں کی چاول مچھلی، بلوچیوں کی سجی اور پنجابیوں کی مکئی کی روٹی پر سرسوں کا ساگ وغیرہ ان کی تہذیبی اور ثقافتی روایتوں کی عکاسی کرتا ہے اسی طرح ڈیرہ اسماعیل خان کا مشہور و معروف پکوان یہاں کی لاثانی ثوبت ہے، جسے ڈیرے کا من وسلویٰ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ثوبت دراصل ڈیرہ کی ثقافت کا وہ مشہور کھانا ہے جو خوب ڈٹ کر جوش و جذبے سے کھایا جاتا ہے۔ ہمارے وسیب کی ثقافتی پہچان، ہمارے کلچر کی جان اور ہمارے رسم ورواج کی ترجمان یہ لذیذ، سدا بہار، ذائقے دار اور پر لطف دیسی ڈش کسی بھی موسم کی محتاج نہیں۔ جب کبھی کوئی عزیز یار دوست یا پھر مہمان آ جائے ثوبت بنالو، محلے کی کوئی آوارہ مرغی ہاتھ آ جائے یا پھر اپنی دیسی مرغی بیمار پڑ جائے ثوبت بنالو، مہینے کی پہلی کو تنخواہ ملے یا پھر ایسے ہی موڈ بن جائے تو ثوبت بنالو۔ اکثر ماہ رمضان میں افطاری کے وقت اسے بڑے اہتمام سے پکایا اور مزے لے لے کر کھایا جاتا ہے۔ بھلا برگر کنگ، میکڈونلڈ، کے ایف سی اور پیزا ہٹ کلچر کے ماروں کو کیا پتہ کہ ثوبت کس اڑن کھٹولے کا نام ہے؟۔

ثوبت بنانے کے ماہر رمضو نائی کے مطابق: ''ثوبت تیار کرنا میڈا خاندانی پیشہ ہِ، اے فن اگر کیں دے ہتھے آونجے تاں لوک انہاں ہتھاں کوں چُمدے ہن''۔ واقعی ثوبت تیار کرنا بھی ایک آرٹ ہے جو ہر ایک کو نہیں آتا مگر ہمارے دیہی علاقوں کی سگھڑ خواتین اس میں کافی حد تک مہارت رکھتی ہیں۔ اس کو تیار کرنے میں اصل مشقت پتلی روٹی بنانا ہے، جسے سرائیکی میں ''مانے'' کہا جاتا ہے اور یہی مانے ہی ثوبت کے ذائقے اور تیاری میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ثوبت بنانے کا طریقہ انتہائی ٹیکنیکل ہے۔ اسی لیے اس کی تیاری میں کافی صعوبتیں برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ ثوبت بنانے کی خاطر سب سے پہلے دیسی

مرغی کا پتلا شوربہ تیار کیا جاتا ہے، جبکہ ساتھ ہی ثوبت کا مخصوص رائیتہ بھی تیار کر لیا جاتا ہے، جسے مقامی زبان میں مٹھا کہا جاتا ہے۔ مٹھا بنانے کے لیے پیاز گولائی میں باریک کاٹنے کے بعد پھر نمکین پانی سے خوب دھو کر کڑواہٹ دور کی جاتی ہے، پھر پانی نتھار کر پیاز کو کسی برتن یا پیالے میں ڈال کر اوپر سے دہی مکس کر کے نمک، مرچ اور دوسرے مصالحے ملائے جاتے ہیں۔ کوشش کی جاتی ہے کہ ہر چیز حسب ذائقہ ہو تاکہ نمک مرچ زیادہ ڈالنے سے کہیں مٹھا تِکھا نہ ہو جائے، اس کے بعد اوپر سے ٹماٹروں کی قاشیں کاٹ کر اسے سجا دیا جاتا ہے۔ لو جی رائتہ یعنی مٹھا تیار ہو گیا۔ اب اصل مشقت بھرا پر ابلمیٹک کام مانے بنانا ہے، جس کا سوچتے ہی اہل خانہ کا سر چکرانے لگ جاتا ہے اور وہ جان چھڑانے کے بہانے خاوند پر الٹا احسان جتائے کہتی ہیں۔ ''نِکے دے پیو! اج کل اٹا اِیویں آندا پے کہ توے تک روٹی مجال ھِ جو ونجے، بھلا مانے کیوں پکیساں؟ ۔ بھلا تھیوی ہِک کم کر چا، اسلامیہ کلونی دے سِرے تے ماناں آلے کھڑے ہن، اے کنڈوری پکڑ، زرا بھجد ابھجد اونج تے کُجھ مانے تاں گِدی آ، میں اے تک شورمہ تیار کر گھناں''۔ بیوی کی بات سن کر خاوند شکایتی لہجے میں کہتا ہے۔ ''تُوں اصلوں بےعمل رَن ھیں، ڈے کنڈوری میں گھن آواں مانیں''۔ خاوند منہ بسورتے ہوئے مانے لینے چلا جاتا ہے۔ لو جی مانے تو باہر سے آ گئے اور شوربہ اہل خانہ نے کسی نہ کسی طریقے سے تیار کر ہی لیا۔ شوربہ، مانے، تھال، رائیتہ ۔۔ سارے اسپئیر پارٹس دستیاب ہو چکے، اب صرف اسمبلنگ رہتی ہے۔ ابھی شوہر اپنی تھکان نکال رہا ہوتا ہے کہ پھر حکم نامہ جاری ہوتا ہے۔ ''نِکے دے پیو! زرا مانے تاں کُٹ کے تھال وِچ گھتو ہا چا میں ذرا نِکے کُوں کھیر (دُدُو) ڈے ڈیواں''۔ اب شوہر ایک گول تھال میں مانوں (روٹی) کے ٹکڑے کر کے اوپر سے تیار شدہ شوربہ ڈالے مرغی کے ٹکڑوں کو بڑے قرینے سے سجائے سائیڈ میں رائتہ رکھے، للچائی نظروں سے تھال کو دیکھتے ہوئے بیوی سے مخاطب ہوتا ہے۔ ''آ ونج ثوبت تیار ھِ''۔ لو جی پر تکلف ثوبت تیار ہو گئی۔

ثوبت بڑے اہتمام اور جذبے کے تحت ہم نوالہ و ہم پیالہ ہو کر کھائی جانے والی ڈش ہے جس پر ہر کوئی اپنے اپنے مورچے بنا کر حملہ آور ہوتا ہے۔ ثوبت کے طے شدہ اصول وضوابط پر ہمیشہ سختی سے عمل کیا جاتا ہے۔ کوئی بھی بھوکا حملہ آور یا گھُس بیٹھیا اپنی باؤنڈری کراس کر کے کسی دوسرے کی حدود میں داخل

نہیں ہوسکتا اور نہ ہی کسی دوسرے کی سپلائی فورس کونشانہ بنا سکتا ہے، کیونکہ مجلسی آداب سے عاری ایسے بدذوق انسان کو نا صرف اخلاقاً برا سمجھا جاتا ہے بلکہ ثوبت کی مجلس شوریٰ متفقہ طور پر آئندہ کے کسی بھی پروگرام سے اسے بلیک لسٹ قرار دے کر اس کے بھوکے عزائم کو ناکام بنا سکتی ہے۔

ڈیرہ کے مشہور لُندھے اور ہبلا سے کے مارے حاجی صدیق ثوبت کھانے کے اصولوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ ثوبت کھاتے وقت عموماً بولنے سے کھانے کی تخلیقی صلاحیتیں متاثر ہونے کا خدشہ لاحق ہوتا ہے لہٰذا اسے چپ چاپ کھانا چاہیے اور کھانے کے بعد ہضم کرنے کی خاطر میزبان سے سبز چائے کا تقاضہ ضرور کرنا چاہیے۔

آج سے کچھ سالوں پہلے ثوبت ایک ڈومیسٹک پکوان ہوا کرتی تھی، مگر کمرشلائزڈ ہونے کے بعد اب یہ شہر بھر کے ہوٹلوں میں آرڈر پر بھی باآسانی دستیاب ہے۔ ڈیرہ میں جگہ جگہ ثوبت کے کھلے ہوٹل اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ یہاں ثوبت کتنے شوق سے کھائی جاتی ہے۔ مگر کمرشلائزڈ ہوتے ہی وہ ذائقہ اور وہ مزہ ختم ہوگیا جو کبھی گھریلو ثوبت میں ہوا کرتا تھا۔

مجھے پہلی بار اس لذیذ ڈش سے روشناس ہونے کا موقع اس وقت ملا جب میں اپنی خالہ کے ہاں موضع حسام میں ہونے والی ایک شادی کی تقریب میں والدین کے ہمراہ چپک کر گیا تھا۔ وہاں بہت سی عورتیں لکڑیوں کا ایک الاؤ جلائے اس کے اوپر ایک لوہے کی لمبی چادر رکھ کر انتہائی مہارت کے ساتھ پتلی روٹیاں بنا رہی تھیں، جبکہ قریب ہی دو دیگیں چڑھائی گئی تھیں جن میں سے ایک میں پتلا شوربہ ابل رہا تھا جبکہ دوسرے میں میٹھے چاول پک رہے تھے۔ دیگوں کے قریب ہی نائی دھوتی پہنے حقہ پینے کے ساتھ ساتھ وقفے وقفے سے کف گیر بھی چلا رہا تھا۔ اس وقت چونکہ ٹینٹ، قناتوں اور کرسیوں کا رواج نہیں تھا اسی لیے گھر کے صحن میں یا کھلے میدان میں مٹی کی بڑی بڑی پاتریوں میں چاول اور ثوبت کھلانے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ کچھ افراد بڑے بڑے پرات اٹھائے باراتیوں کے اردگرد گھوم پھر کر خالی نظر آنے والے تھالوں میں چاول اور ثوبت کا سالن ڈالتے جاتے اور یہ عمل اس وقت تک بند نہ کیا جاتا جب تک کھانے والا خوب سیر ہوکر ہاتھ کا اشارہ نہ کر دیتا، اس کے باوجود بانٹنے والا کھانے والے سے دوبارہ پوچھتا: ''حال ڈے بشکُو

رَجاوِی ہیں کہ نیئں ؟''۔ڈیرہ کے ماہر غذائیات ڈاکٹر بگو کے بقول ''ثوبت کی وجہ سے دوقسم کے لوگ موت کو گلے لگاتے ہیں ایک وہ جو اسے کھانے کی خاطر ترس ترس کر مر جاتے ہیں جبکہ دوسرے وہ جو اس کی زیادتی سے بدہضمی میں مبتلا ہو کر اوپر چلے جاتے ہیں''۔ ہمارے ایک محلے دار صوفی سعید کا تعلق بھی اسی دوسرے بگھیلے گروپ سے ہے۔ بتانے والے بتاتے ہیں کہ جب وہ ثوبت کھانے بیٹھتے ہیں تو بس کھاتے ہی چلے جاتے ، یہ نہیں سوچتے تھے کہ سانس کی آمدورفت کے لیے بھی تھوری بہت جگہ چاہئے۔ جب کھاتے ہیں تو صرف کھاتے ہی ہیں ، پیتے کچھ بھی نہیں ، یہاں تک کہ پانی بھی نہیں۔ پوچھنے پر سانس روک کر بتاتے ہیں ''ثوبت کھانے کی دعوت ہے تو صرف ثوبت ہی کھاؤں گا، پانی گھنٹے دو بعد کہیں سے بھی پی لوں گا اور اگر کھانے سے پہلے پانی پی لیا جائے تو بھوک مر جاتی ہے''۔ ہر دعوت کے بعد لوگ اسے ریڑھے رکشے پر ڈال کر حکیم شمس الدین کے مطب پر پہنچا آتے ہیں، جہاں کی آب حیات پی کر گیسیاں کرتے ہوئے وہ واپس گھر پہنچ جاتے ہیں۔

کافی عرصہ ہوا ڈیرہ کے مضافاتی علاقے دھُپ سڑی میں ایک بُکھالُندھا، اندھا اللہ وسایا عرف وسُو کانڑاں رہا کرتا تھا اس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ چرند پرند تک کا کھانا بھی ہضم کر جاتا ہے۔ ایک دن بھولے سے قریبی گاؤں کے ملک رانجھو نے اسے شادی کی دعوت پر مدعو کر لیا چونکہ دیہاتوں میں ان دنوں ثوبت کا رواج تھا اسی لیے وسو اندھا دل ہی دل میں بڑا خوش ہوا۔ مگر دوسرے لمحے سوچنے لگا کہ دعوت میں پہنچوں گا کیسے؟ اسی سوچ میں گم صم بیٹھا تھا کہ قریبی ہمسایہ آن پہنچا، وسو نے اپنا مدعا بیان کیا، ہمسائے نے تسلی دی، فکر نہ کرو میں تمہیں ساتھ لے کر جاؤں گا۔ مسئلہ حل ہوتے ہی اللہ وسایا خوشی خوشی مطلب کی بات پوچھنے لگا: ''تم جانتے ہو کہ میں اندھا ہوں اگر ثوبت شروع ہو گئی تو مجھے پتہ کیسے چلے گا''؟ ہمسائے نے جواب دیا: ''میں جب تمہیں کہنی ماروں تو اسے گرین سگنل سمجھ کر شروع ہو جانا''۔ اندھا زبان منہ پر پھیرتے ہوئے بولا وہ تو ٹھیک ہے لیکن مجھے خدشہ ہے کہ کہیں لوگ تیز تیز کھانا شروع کر دیں اور میں بھوکا نہ رہ جاؤں؟۔ فکر نہ کرو اگر میں دو تین کہنیاں متواتر ماروں تو تم بھی تیز ہو جانا۔ اور اگر وہ مجھ سے بھی تیز ہو گئے تو؟'' اوہ خدا کے بندے میں تجھے متواتر کہنیاں ماروں گا تم جتنا تیز کھا سکتے ہو کھا لینا''۔ ہمسایہ بیزار

ہوتے ہوئے بولا جبکہ اندھے نے رال ٹپکاتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا۔وقت مقررہ پر دونوں دعوت میں پہنچ گئے اور محلے دار دوست نے اللہ وسائے کو بھی اپنے ساتھ بٹھالیا،اتنے میں ثوبت کے تھال آ گئے اور سب لوگ دائرے بنا کر اپنے اپنے تھالوں کے گرد بیٹھ گئے۔ابھی ثوبت شروع بھی نہیں ہوئی تھی کہ سامنے والے آدمی سے بات کرتے ہوئے ہمسائے کی کہنی اللہ وسائے سے جاٹکرائی۔بس پھر کیا تھا،اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ کھانا شروع کر دیا۔ہمسائے کو بڑی شرمندگی ہوئی کہ انجان گاؤں ہے،پرائے لوگ ہیں،کیا کہیں گے؟ وہ شرم کے مارے بول بھی نہیں سکتا تھا چنانچہ اس نے اللہ وسائے کی اسپیڈ کو روکنے کی خاطر ایک دو کہنیاں اور جڑ دیں۔بس پھر ثوبت کا تھال تھا، پسینے سے شرابور اللہ وسایا تھا اور دیکھنے والی خلقت۔ہمسائے نے لُندھے وسائے کو روکنے کی خاطر مسلسل کہنیاں مارنے کے بعد جب تنگ آ کر ایک زوردار دھکا دیا تو وسایا کھانا روک کر جلدی جلدی اپنی شلوار ٹخنوں تک اوپر چڑھائے تھال کے اندر کھڑا ہو کر چیختے چلاتے ہوئے بولا:''بھراوَ! اِتھاں واقعی لُٹ مچ گئی اے تے ہُن اے منہ تے ہتھ دا کم نئیں، کئی کُھن آوَ تے بیلچہ''۔(بھائیو! یہاں اب واقعی لُٹ مچ گئی ہے اور اب یہ ہاتھ منہ کا کام نہیں رہا،کوئی کسّی یا بیلچہ لے آئے،تو میں اس سے ثوبت کھاؤں)۔

....

ڈاکٹر بگُو اور اُس کے مریض

آج سے کچھ سال پہلے جب مجھے اپنے آبائی شہر ڈیرہ اسماعیل خان جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں پہنچتے ہی موسم اور پانی کی تبدیلی کے باعث مجھے دستوں کی بیماری نے آلیا۔ اس موقع پر کچھ سیانوں نے مشورہ دیا کہ بار بار بیت الخلاء کی زیارت کرنے سے بہتر ہوگا کسی ڈاکٹر کو دکھا آؤ، جبکہ میرے ایک قریبی دوست نے کچھ اس انداز میں ڈاکٹر بگو کی مارکیٹنگ شروع کر دی: ''یار بگو بہوں تکڑا ڈاکٹر ہوِی' میں تاں آ کھداں اُوکُوں ڈِکھا چا''۔ دوست کے مخلصانہ مشورے اور بار بار کی اٹھک بیٹھک سے تنگ آ کر مجبوراً سائیکل اٹھائی اور ڈاکٹر بگو کے مطب کی طرف نکل کھڑا ہوا۔ ڈاکٹر بگو، ڈاکٹر ناصر، ڈاکٹر قاسم اور ڈاکٹر امان اللہ ڈیرہ اسماعیل خان کے بہت قابل، نامی گرامی اور عوامی ڈاکٹر ہیں۔ ڈاکٹر بگو کو چھوڑ کر باقی سب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں لیکن بگو ابھی بقید حیات ہیں۔

ڈاکٹر بگو کے مطب کا راستہ انتہائی آسان ہے، اگر کوئی بیمار جاننے کا متمنی ہو تو میں سمجھائے دیتا ہوں۔ سب سے پہلے آپ چونگلے کے بیچ میں آ کر کھڑے ہو جائیں، پھر اپنے آپکو سائیکل، موٹر سائیکل اور چنگ چی رکشوں سے بچاتے ہوئے مشرقی سمت کلاں بازار کی طرف چلنا شروع کر دیں۔ مگر ٹھہریئے۔ چادر لپیٹ کر ایسی مدہوش چال بھی نہیں چلنی کہ لوگ آپکو پھٹُو سمجھ کر ڈر کے مارے آپکے آگے سے دوڑنا شروع کر دیں اور نہ ہی اتنا سست چلنا ہے کہ سم پو کی طرح چار قدم چل کر دو منٹ ستانے کے بہانے گھنٹوں کسی دکان کے پھٹے پر بیٹھ کر اونگھنے لگیں اور اس وقت تک اٹھنے کا نام نہ لیں جب تک دوکاندار یہ نہ کہے ''لالہ تھمن مہانگے، اٹھ ونج میڈی گاکی خراب نہ کر''۔ لہٰذا درمیانی چال چلیں تو جلد ہی بائیں ہاتھ ایک چھوٹی سی گلی آئے گی اس گلی کو کسی بھی خاطر میں نہ لاتے ہوئے گھوڑے کی طرح منہ اٹھائے اپنا سفر جاری

رکھیں اور اسی طرح سے چلتے جائیں پیچھے نہ مڑیں۔ دو تین منٹ کی مسافت طے کرنے کے بعد بائیں طرف ایک کھلی گلی آئے گی، اسے گلی پونگراں والی کہا جاتا ہے، یہ اندرون شہر کی معروف ترین گلیوں میں سے ایک گلی ہے۔ اس گلی میں داخل ہوتے ہی پندرہ بیس قدم اپنے لاغر دھڑ نگے کو گھسیٹنے کے بعد دائیں طرف ایک کوچہ دکھائی دیتا ہے۔ اسے کوچہ سلیمانی یا عرف عام میں بگو والی گلی کہا جاتا ہے۔ اسی تاریخی گلی کے اندر ہی ڈاکٹر بگو کا مشہور و معروف مطب واقع ہے۔ یہ ہدایات صرف اس بیمار کے لیے ہیں جو اندرون شہر کے گلی کوچوں سے واقفیت نہ رکھتا ہو ورنہ چوگلے تک کا پندھ مارنے کی بجائے مسلم بازار سے ہوتے ہوئے غلمی والی گلی سے شارٹ کٹ مار کر بھی ڈاکٹر بگو تک پہنچا جا سکتا ہے۔ میں کچھ اسی روایتی راستے سے گزرتا ہوا گلی کی نکڑ تک آ پہنچا۔ دکان کے قریب ہی دوائیوں کی بو کیساتھ مریضوں کے اُبڑاک، کھٹے ڈِکار اور کھنگاروں کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ میں جیسے تیسے مطب کے اندر داخل ہوا، وہاں ڈاکٹر کی بجائے مریضوں کا گول دائرے میں سمٹا ایک ہجوم دکھائی دیا۔ ایک بیزار مریض سے پوچھنے پر کہ ڈاکٹر صاحب کہاں ملیں گے، اس نے ہجوم کی طرف اشارہ کیا اور کہا ان میں سے خود تلاش کر لو۔ ہجوم کے نزدیک پہنچ کر پتہ چلا کہ یہاں کوئی حلیم نہیں بانٹی جا رہی، نہ ہی کوئی خیرات تقسیم ہو رہی ہے بلکہ ڈاکٹر صاحب کی میز کے چاروں کونوں کے گرد شہد کی مکھیوں کی طرح چمٹے مرد، عورتیں اور بوڑھے حضرات دراصل مریض ہیں۔ میں نے جیسے تیسے کوشش کر کے دو مریضوں کی کمر کے درمیان راستہ بناتے ہوئے اپنی گردن اندر گھسائی اور ڈاکٹر بگو کو بالآخر دریافت کر ہی لیا۔ ڈاکٹر صاحب قبض کے مریض کے ساتھ حالتِ جنگ میں تھے۔ ڈاکٹر کے استفسار پر مریض نے بتایا کہ مجھے کل سے شدید قبض ہے۔ ڈاکٹر بگو نے اچھا کہا اور تفصیل پوچھنے لگے: ''اے ڈسا، ٹٹی کُھل کے آندی وی یا چیک کے؟۔ ڈاکٹر کے سوال پر مریض نے شرم کے مارے ادھر ادھر دیکھا اور پھر انتہائی نقاہت سے بولا: ''ڈاکٹر صیب میکوں قبض ھ، ٹٹی سخت آسی کولی کتھوں آسی''۔ اچھا اچھا میں تاں ایویں پچھدا پیا ہام ورنہ کیا میکوں پتہ کوئنی۔ چل آپڑا ناں ڈسا؟ ملک فرازو۔ کتھوں کول آئیں؟ موضع حسام کول۔ توں بہوں پروں کول آئیں، اس واسطے ترے ہفتاں دی دوائی گدی ونج۔ اسی دوران ڈاکٹر صاحب جمگھٹے کو ہٹا کر سراج کمپاؤنڈر سے بولے۔ ہک روح افزا دی خالی بوتل کڈھ۔ کمپاؤنڈر کو حکم

نامہ جاری کرنے کے بعدوہ دوبارہ مریض کی جانب متوجہ ہوئے۔ بوتل دے ڈاہ روپے الگ ہوسن۔ٹھیک ھ ڈاکٹر صیب۔سُوا (انجکشن) لویسیں؟۔ہاں جی۔ٹھیک ھ سب کجھ ملا کے ایک سو پنجھاہ روپے تھیسن۔ مریض نے اپنی شلوار کے نیفے سے پیسے نکال کر ڈاکٹر صاحب کو تھمائے اور پرچی لے کر دوائی لینے کمپاؤنڈر کے پاس چلا گیا۔کمپاؤنڈر کی ٹیبل پر پہلے سے تیار شدہ پڑیاں پڑی تھیں۔ ہر پڑی میں ایک پین کلر، ایک نیند کی گولی، دستوں کی، زکام اور بخار کی گولی وغیرہ۔سب مریضوں کے منہ میں ایک ہی تھرمامیٹر ٹھونسنے کے بعد سب کو مساوات کی بنیاد پر یہی پڑیاں تقسیم کی جاتی تھیں۔کوئی زیادہ حجت کرے تو گلوکوز کا انجکشن اسی سرنج سے گھونپ دیا جاتا تھا جو مختلف بازوؤں میں پہلے سے چبھوئی جا چکی ہوتی تھی۔

قبضی مریض کے ہجوم سے نکلتے ہی خلا کو پر کرنے کے لیے ایک پوندہ کمزور مریضوں کو دھکا دے کر بالکل اسی طرح آگے بڑھا جس طرح روس افغان جنگ کے دوران یہ لوگ ڈیرہ میں آن گھسے تھے۔ڈاکٹر صاحب پوندے سے آگے کھڑے مریض کو اس کی باری پر دیکھنے لگے۔ہاں بھئی کیا مسئلہ ھ؟ ڈاکٹر صاحب موسمی نزلہ زکام تھی گے میں بی بخشے کُوں تے ویندا نیں پیا۔ پوچھنے پر کہ لم پتلی آندی ھ یا گھاٹی۔مریض نے بتایا کہ آنکھوں اور ناک سے مسلسل پانی بہہ رہا ہے۔ڈاکٹر صاحب فوراً نتیجے پر پہنچ گئے اور کہہ دیا کہ زکام کچا ھ، میں کالی دوا لکھ ڈیندان، چالی روپے کڈھ۔زکام والے مریض کے نکلنے سے ایک اور جھٹکا لگا جس نے خوش قسمتی سے مجھے آگے اچھال دیا، مگر اب باری خواتین کی تھی۔ہجوم میں سے ایک باپردہ زنانہ اپنے چھوٹے بچے کو لے کر آگے بڑھی، ڈاکٹر بگو نے پوچھا ''ہاں بی بی کے تکلیف ھِ تیڈے بچڑے کُوں''؟۔اس باپردہ خاتون نے سب سے پہلے بچے کو ڈاکٹر کے سامنے میز پر لٹایا اور پھر سرائیکی زبان میں دلچسپ کیفیت بیان کرنے لگی۔''ڈاکٹر صیب میڈے بال کُوں پیٹ اِچ رتو کی مروڑ ھِ تے درد کول شودا بکاندا ویندے۔پچھلی رات تاں اُکے تے سمن وی نِس دِتا، ساری رات بلئی بیٹھارے میکوں وی تے پیو کُوں وی نال''۔اپنے کانوں میں ماں بولی کی رس بھری پرنم پھوار اور معصوم بچے کے حرکات وسکنات خصوصاً روتے روتے اچانک پوندے کو دیکھ کر خوف کے مارے چپ کر جانا اور پھر اسے گھورنے لگنا۔بچے کے اس فطری انداز پر بیحد پیار آیا۔قبض، زکام، دست اور مروڑ سے کوسوں دور میں ابھی تک ماں بولی کے

سروراور بچے کی معصوم حرکات میں ڈوبا ہوا تھا کہ یکا یک ڈاکٹر بگو کے ان الزامیہ الفاظ نے مجھے بیدار کر کے ہجوم کے حصار میں واپس لا کھڑا کر دیا، وہ بچے کی ماں سے مخاطب تھے: ’’بی بی وِیَم (ڈیلیوری) دے بعد چاول کھادے ہوسنی ھا، یا ساگ کھادا ہوسی ھا، یا وت کوئی گند بلاں۔ڈیکھ تاں سئی بال دا پیٹ آ پھرا پے۔کتنی دفعہ منع کیتے کہ لیس آلے شیئاں نہ کھادے کرو،لیکن مجال ھِ کہ تُساں زالیاں منع وی تھیوو‘‘۔اس دلچسپ گفتگو میں ڈاکٹر کے بھائی سراج الدین نے بھی اپنا حصہ ڈالنا ضروری سمجھا اور ڈاکٹر صاحب کی طرف داری کرتے ہوئے شکایتی لہجے میں بولا۔ ڈاکٹر صاحب اے آپڑے مسالاں دی نیں منیند یاں،توڑی کتھاں منیسن ۔ یہ کہہ کر اس نے مریض عورتوں کو ہدایات دینا شروع کر دیں ۔تھولا نذیک تھی کے باؤ،سیڑے کول ھکو بینچ ھ تے تساں ایویں بیٹھیاں وے جیویں پیر شاہ عیسیٰ دے عرس تے آیاں ہوو۔عورتیں بیچاری شرمندہ سی ہو کر ایک ساتھ جڑ کر بیٹھ گئیں۔ بچے کی ماں کو پیٹ درد کی پر چی تھما کر ڈاکٹر بگو نے پوندے سے اس کی بیماری کا حال احوال پوچھا۔اس بے چارے کو آنکھوں کی الرجی لاحق تھی۔ڈاکٹر نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ فکر کی کوئی بات نہیں یہ عموماً گرمیوں میں ہو جایا کرتی ہے۔

ڈاکٹر بگو نے اسکے لیے دوائی کیساتھ ساتھ صفائی بھی تجویز کی اور پھر باقی کھڑے ہوئے مریضوں کی طرف متوجہ ہوئے۔میری مسکین صورت دیکھ کر ڈاکٹر بگو نے مرض کا پوچھا۔میری طرف سے دستوں کی شکایت پر انہوں نے تنبیہی انداز میں کہا: ’’تُساں لوک گند کھا سوتاں وت دست تاں لگسن‘‘۔ڈاکٹر صاحب دراصل دہی بھلوں، گول گپوں اور دوسری مصالحہ دار بازاری چیزوں کو گند سے تشبیہ دیتے ہیں۔میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا کہ شاید یہ سب کچھ پانی کی تبدیلی کی وجہ سے ہوا ہے،مگر وہ ماننے کے لیے قطعاً تیار نہ تھے۔بہر حال ڈاکٹر بگو نے مجھے دستوں والی دوائی دی جس سے مجھے کافی افاقہ ہوا اور میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ڈاکٹر بگُو موسمی بیماریوں سے نمٹنے کا کافی تجربہ رکھتے ہیں۔اللہ انہیں ہمارے سروں پر سلامت رکھے (آمین)۔

....

پانی کا ڈِبہ

چھوٹی سفید داڑھی، بھولی سی آنکھیں جن میں کوئی بھید بھاؤ کوئی اسرار پنہاں نہیں تھے۔ نہ کوئی ناپسندیدگی نہ ہی کوئی بھول بھلیاں۔ تسبیحات میں گم لبوں کے ساتھ بہت ہی پیارے اور مانوس نقوش کے مالک ماما مٹھو ایک پرنور انسان تھے۔ مسلم بازار میں ان کی سبزی کی دکان ہوا کرتی تھی۔ بتانے والے بتاتے ہیں کہ عہدِ شباب میں کبھی ان کی شادی بھی ہوئی تھی لیکن جوان سالہ بیوی کی موت کے بعد انہیں چپ سی لگ گئی تھی۔ انہوں نے اپنے کھُو والے گھر کو خیر آباد کہا اور صرف دکان تک ہی محدود ہو کر رہ گئے، بلکہ زندگی کی آخری سانسوں تک کرائے کی دکان ہی ان کا واحد ٹھکانہ رہی تھی۔

ماما مٹھو چونکہ بازار کے ایک کونے میں اپنی دکان کے سامنے چارپائی بچھا کر کھلی فضا میں سویا کرتے تھے اسی لیے اجالا ہونے کی بشارت سب سے پہلے انہی کو ملا کرتی تھی۔ ابھی فضا میں نیم روشنی اور نیم اندھیرے کا دھندلکا سا چھایا ہوتا کہ وہ اپنی گدلی آنکھوں کو رگڑتے ہوئے کچھ ادھورے خواب اپنی پلکوں سے جھاڑتے اور بھیگتی اوس میں نچڑے نم آلود بستر سے اٹھ کر چارپائی کے نیچے سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر اپنی چپل برآمد کرتے ہوئے سیدھا نلکے کی طرف چل دیا کرتے تھے۔ اُن کی چال میں غنودگی کی ہلکی سی لڑکھڑاہٹ نمایاں ہوا کرتی تھی۔ عین اسی وقت صبح کا حلوہ پوری بنانے کے لیے مجھے بھی بیدار ہونا پڑتا تھا۔ اکثر وہ میرے اٹھنے سے پہلے ہی اپنا بوریا بستر سمیٹ کر دکان کے اندر رکھ چکے ہوتے تھے۔ وہ بان کی چارپائی کو اٹھاتے اور اسے چاچے حقنواز کے گھر کی دیوار سے ٹکانے کے بعد رمضان عرائض نویس کی دکان کے سامنے بنے سرکاری نل پر جا کھڑے ہو جاتے۔ نلکے سے نکلنے والی جل دھارا اور اس دھارے کا

تریڑ مارتا، مچلتا، بل کھاتا، پتھر کی سل پر مختلف چھوٹے موٹے دائرے بناتا، چھینٹوں کی صورت واپس اچھلتا پانی، غرض فرش پر تڑ تڑ گرتے پانی کے بے شمار چھینٹوں سے وہ اپنی آنکھوں میں بسی کچی نیند بہاتے اور منہ پر دو تین چھپاکے مارنے کے بعد وضو کر کے واپس اپنی دکان پر آ کر بیٹھ جایا کرتے تھے۔ ازل سے خاموش اور سائیں سائیں کرتے بازار میں سب سے پہلا مکالمہ ہم دونوں کے درمیان ہی ہوا کرتا تھا۔ ''السلام علیکم ماماں''۔ چاروں اطراف چھائی خموشی اور پنڈولم کی طرح ڈولتے سناٹے کو میرا خمار زدہ سلام اکثر چیر دیا کرتا تھا۔ ماما مٹھو سلام کا بھرپور طریقے سے جواب دینے کے بعد اکثر خاموش ہو جایا کرتے تھے۔ پتہ نہیں مجھے ان کی خاموشی، لاتعلقی اور بے زاری میں بھی ایک عجب و غریب قسم کی کشش محسوس ہوا کرتی تھی۔ جب تک میرا حلوہ اختتامی مراحل تک پہنچتا اتنے تک مامے کا منہ بولا بیٹا امام بخش اس کا ہاتھ بٹانے کی خاطر اپنا ریڑھا رکشہ لیے دکان پر پہنچ جایا کرتا تھا۔ حلوے کو فائنل ٹچ دینے کے لیے میں اسے بڑے بھائی کے سپرد کر کے مسجد کی طرف دوڑ لگا دیا کرتا جبکہ ماما مٹھو دکان کے اندر ہی نماز کی نیت کر کے سجدہ ریز ہو جایا کرتے تھے میری مسجد سے واپسی تک ماما حقے کے دو چار بھرپور کش لگانے کے بعد امام بخش کے ریڑھے میں بیٹھے سبزی منڈی کی طرف روانہ ہو چکے ہوتے۔ یہ وہی وقت ہوتا تھا کہ جب پرندے اپنے خالق کی حمد و ثناء کے بعد دانے دنکوں کی تلاش میں گھونسلوں سے باہر آ چکے ہوتے تھے۔ سرمئی آسمان پر مشرقی جانب نارنجی روشنی کے آثار پھیلتے ہی ماما مٹھو سبزی سے بھرے ریڑھے میں ایک طرف دبکے بیٹھے واپس آتے دکھائی دیتے۔ امام بخش سبزی اتار کر دیہاڑی لگانے نکل جاتا جبکہ ماما مٹھو سبزی سجانے میں منہمک ہو جایا کرتے تھے۔

مامے کی دکان اپنے وقتوں کی ایک بوسیدہ دکان ہوا کرتی تھی۔ چر چراتے لکڑی کے سال خوردہ دیمک لگے دروازوں میں مقید چھوٹی سی چوکور دکان کہ جس کی سیم زدہ دیواریں، اندر ٹوٹی پھوٹی اینٹوں کے فرش کو ڈھانپتی پٹ سن کی کھردری بوری، چھت سے لٹکتا زرد آلود فیوز بلب، ایک کونے میں گرد سے اٹا گھر گھر کی بے سری آوازیں نکالتا پیڈسٹل پنکھا اور چھت کی کڑیوں سے پھوٹتی، پنکھے کی سرسراہٹ کے ساتھ پوری دکان میں چکراتی پھرتی تاریکی۔ اس کے علاوہ ایک حقہ، جست کا ایک پرانا ڈبہ اور ایک عدد مٹی

کا پیالہ جس میں ماما رات کو سونے سے پہلے دن بھر کی بچی کھچی روٹیوں کے ٹکڑے بھگو کر رکھ دیا کرتے تھے ۔صبح سویرے تازہ سبزی ترتیب دینے کے بعد ان کا دوسرا کام یہی ہوتا کہ رات کے باسی روٹیوں کے بھیگے ٹکڑوں سے بھرے پیالے کو ایک کونے میں رکھ دیا کرتے جسے وقتاً فوقتاً لالیاں، چڑیاں اور کوے چگتے رہتے تھے۔

لوہے کی آہنی سلاخوں پر سرعت سے پھسلتی سڈنی ایکسپریس کے اندر بیٹھے کھڑکی پر پڑتی بارش کی شفاف بوندوں کے رقص میں پلکوں نے جونہی آنکھوں کا پھاٹک بند کیا تو سوچوں کی برق رفتار ٹرین کو ذہن کی پٹڑی پر سے گزرنے کا موقع مل گیا۔انہی سوچوں کے حصار میں آج جب مامے مٹھو کی قناعت بھری زندگی کا تجزیہ کرنے بیٹھا تو فہم کی گتھیاں ایک ایک کر کے سلجھنے لگیں۔آج ٹرین کی کھڑکی سے باہر بوجھل بادلوں نے جو سماں باندھ رکھا ہے،اس وقت کی برسات میں بھی سب کچھ بالکل ایسا ہی لگا کرتا تھا۔ویسے کالے بادل، وہی چھتیں،دریچے ، درو دیوار اور ان پر ہولے سے دستک دیتی بارش کی بوندیں۔وہی گھر کا دروازہ اور سامنے مامے مٹھو کی خستہ حال دکان۔اس جگہ کی خاص بات تو مجھے معلوم نہیں مگر پتہ نہیں کیوں جب بھی بارش برسنے لگتی، پہلا قطرہ گرتے ہی میرے دل کے تار جھنجھنا اٹھتے اور میں بے اختیار سا ہو کر گھر سے نکل کر باہر کھڑا ہو جایا کرتا تھا۔کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ جیسے میں نے وہیں کھڑے کھڑے اپنی زندگی کے ماہ و سال گزار دیئے ہوں۔اتنا لمبا عرصہ گزر جانے کے باعث شاید میری یادداشت کے خانے میں کچھ دھندلا سا گیا ہو مگر وہ جیتا جاگتا منظر میری آنکھوں میں آج بھی تر و تازہ ہے۔ مجھے ایسے لگتا ہے کہ جیسے آج بھی میں ہمیشہ کی طرح اپنے گھر سے باہر نکل آیا ہوں۔میرے ارد گرد زوردار بارش برس رہی ہے اور میں بہتے پانی میں گزرتے راہگیروں کو دیکھ رہا ہوں۔مامے مٹھو کی دکان کے خستہ حال چھپر پر گرنے والی بوندوں کا مچلتا رقص میرے سامنے ہے۔بوند سے بوند کا مل کر ایک قطار کی شکل میں نیچے آنا اور ایک ایک کر کے چھپر سے ٹکرا کر سڑک پر پاش پاش ہو کر بکھر جانا۔بارش کی بوندیں اپنے انجام سے بے خبر ایک دوسرے سے کچھ ایسی چمٹی چلی آ رہی ہوتیں کہ انہیں ٹوٹ کر بکھرنے کا قطعی خوف لاحق نہ ہوتا۔بارش میں تیزی آتے ہی مامے مٹھو کی دکان کی چھت کے اندر سے پانی ٹپکنے کا منظر اسے کسی حد تک

پریشان اور متحرک کر دیا کرتا تھا۔ وہ اٹھ کر پانی کے ٹپکتے قطروں کو اکھٹا کرنے کے لیے نیچے جست کا ایک خالی ڈبہ رکھ دیا کرتے تھے۔ اسی ڈبے سے وہ اپنی سبزیوں پر چھڑکاؤ، دھول مٹی جمانے کے لیے سڑک پر چھڑکاؤ اور بوقت ضرورت وضو کا فریضہ بھی سرانجام دیا کرتے تھے۔ بارش کے پانی سے ڈبہ بھرتے ہی وہ اٹھ کر اسے باہر سڑک پر انڈیل دیا کرتے۔ خالی ڈبے میں دوبارہ سے بوندوں کا رقص شروع ہو جاتا اور جست کا ڈبہ پھر سے بھرنے لگتا۔ جب پانی لبالب بھر جاتا تو پھر اس کے ساتھ وہی عمل دہرایا جاتا۔ اس وقت میری عینک کے فریم کے سامنے کا منظر کتنا عجیب ہوا کرتا تھا۔ رنگوں کا رنگوں کے ساتھ ملنا اور پھر سب کچھ دھندلا جانا۔ نمی کے باعث عینک کا فریم دھندلاتے ہی آنکھوں کے سامنے پھیلے منظر کا خراب ہو جانا۔ عینک اتار کر شیشے کو صاف کرنا اور پھر سب کچھ ویسے کا ویسا ہو جانا۔ ایک آس پر مامے مٹھو کا ڈبے کو تکتے رہنا اور پھر ڈبہ بھرتے ہی ایک جھٹکے سے اٹھ کر اسے فوراً خالی کر دینا۔ پھر سب کچھ ویسے کا ویسا ہو جانا۔ بارش کا واچھڑ میں تبدیل ہوتے ہی مامے کا اپنے جھریوں زدہ ہاتھوں کو پیالہ بنا کر دعائیہ انداز میں ہونٹوں کو جنبش دینا اور مسلسل چھت کو تکتے رہنا۔ کیا عجب زمانہ تھا کہ اس وقت کی دعائیں بھی مستجاب ہو جایا کرتی تھیں۔ بادل لوٹ جایا کرتے تھے، بارشیں تھم جایا کرتی تھیں۔ پرانے موسموں کی باتیں اور پرانے دنوں کی یادیں بھلا کب تک ٹھہری ہیں۔ منظر بدل گیا، پس منظر بدل گیا۔ کسی بھی لفظ میں ن یا نون غنہ کا اضافہ کر کے کوثر کو کونثری، کراچی کو کرانچی اور مطلب کو مطبل بولنے والا سیدھا سادا ماما مٹھو اپنے حصے کے ڈبے بھر کر اس دنیا سے کب کا رخصت ہو چلا، اب اس خستہ حال دکان کے نئے کرائے دار بشیر لوہار کو زندگی کے بقیہ ڈبے بھرنے ہیں۔

شاید ہماری زندگی بھی کچھ ایسی ہی ہے ایک من پسند تصویر۔ ایک من چاہا خواب۔ ایک خوشگوار منظر یا پھر جست کا وہی خالی ڈبہ۔ خنک فضا میں رچی نمی جہاں ہماری زندگی میں بکھرے لش گرین لینڈ اسکیپ کو دھندلا سکتی ہے وہیں بارش کی ٹپ ٹپ کرتی بوندیں خالی ڈبے کو بھر بھی سکتی ہیں۔ مگر پھر زرا سی کوشش اور ہمت کے بعد سب کچھ ویسے کا ویسا ہو جاتا ہے جیسا کہ ہم دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہم پانی سے لبالب بھرے ڈبے کو سڑک پر انڈیل کر خالی تو کر سکتے ہیں لیکن باوجود لاکھ کوشش کے اسے بھرنے سے نہیں روک

سکتے کیونکہ یہ ہمارے اختیار میں نہیں ۔گو یا زندگی ہمیں کبھی بھی آن آف سوئچ نہیں دیتی ۔اگر دیتی ہے تو صرف ایک آس،ایک امید،ایک احساس،ایک انتظار،ڈھیر سارا حوصلہ،تھوڑا صبر اور پھر تھوڑی سی کوشش ۔ کیا پتہ اگلے لمحے سب کچھ ویسا ہو جائے جیسا ہم نے سوچا تھا،جیسا ہم نے چاہا تھا۔

ماضی میں برستی بارشوں کی ننھی بوندوں کی سریلی ہنسی مجھے کیا کچھ سکھا دے گی یہ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا؟۔ مامے مٹھو کا پانی سے لبا لب ڈبے کو سڑک پر انڈیل کر ایک آس،ایک امید سے چھت کو تکتے رہنے سے زندگی کا یہی فلسفہ سمجھ میں آتا ہے کہ ہر زمانے میں ہر عہد کے لوگ شاید ایسے ہی جدو جہد کیا کرتے ہیں،ایسے ہی جیا کرتے ہیں۔ ہر شام گزرے دن کی موت آتی ہے۔ ہر صبح نئی امید، نئی نوید لے کر آتی ہے۔زندگی کا نئے سرے سے آغاز ہوتا ہے اور یہ سفر اس وقت تک جاری وساری رہتا ہے جب تک حیاتی کا ڈِبہ بھر نہیں جاتا۔

....

ڈیرہ میں آنے والے عفریت کا قصہ

یہ ستمبر 2006ء کے موسم گرما کا ذکر ہے جب ڈیرہ میں شوہر حضرات اپنی بیویوں سمیت مچھروں سے لڑتے جھگڑتے، دستی پنکھا ہاتھ میں لے کر جھلتے، واپڈا کو کوستے، اپنی بدقسمتی اور بدنصیبی کا رونا روتے نیند کی وادی میں اترنے لگتے تو آدھی رات کے پچھلے پہر کوئی عفریت نما چھلاوا شہر کے کسی گلی کوچے سے نکل کر گھروں میں گھس جایا کرتا اور اہل خانہ کو خوف زدہ کیا کرتا تھا۔

اُس وقت کے ایک خبری کے مطابق: ''یہ کوئی چڑیل ہے جس کے پاس شہر کی تمام زبان دراز عورتوں کی ڈیٹا بیس ہے جو اپنے شوہروں خصوصاً سسرال والوں کو گاہے بگاہے ستاتی رہتی ہیں''۔ ایک انجانے خوف کی وجہ سے عورتیں گرمی کی پروا کیے بغیر حبس زدہ کمروں میں سونے لگیں جبکہ دن بھر کے تھکے ہارے مرد ہاتھوں میں ڈنڈے لیے جاگ کر راتیں گزارنے لگے، مگر اتنی سخت سیکیورٹی کے باوجود دہشت کی علامت بنی چھلاوا نما بلاں کو کہیں نہ کہیں تواتر سے دیکھا جانے لگا۔ زیادہ تر یہ اندرون شہر مثلاً محلّہ جوگیا نوالہ اور چوک سیٹھ اشرف کے اردگرد نظر آنے لگی، بہت سی عورتوں اور بچوں نے اسے گھروں میں گھس کر عورتوں پر حملہ آور ہوتے بھی دیکھا۔ چوک سیٹھ اشرف کی ایک متاثرہ خاتون نے صبح اٹھ کر محلے کی عورتوں کو کچھ اس قسم کا دلچسپ واقعہ سنایا: ''میں رات کُوں سُتی پئی ہام کہ اَوتری بلاں میڈے سر تے آ کھڑی تھئی، تے ول کُجھ دیر بعد میڈے چُونڈے پٹّن لگ گئی، میڈے شور مچاون نال رمضان دا پیو سُجا گ تھی گیا، تے اُوں وت بلاں کُوں ھَکلا، تاں ئبھئی بلاں ٹلی، میں ول کڈاں بیر نہ سمساں''۔ اسی قسم کے دوسرے واقعے میں اندرون شہر کے ایک مظلوم شوہر نے کچھ اس طرح کا چشم دید واقعہ سنایا: ''رات کو سوتے ہوئے تقریباً دو بجے کے قریب کسی کھٹکے سے اچانک میری آنکھ کھلی تو دیکھا کہ کوئی سات آٹھ فٹ جسامت کی کالی سیاہ اور خوفناک چہرے والی مخلوق میری زوجہ کے پہلو میں کھڑی ہے، بلاں نے آناً فاناً اس کا گلا دبانا

اور بال نوچنا شروع کر دیئے۔ میری بیوی کی چیخ و پکار سے گھبرا کر بلا پلک جھپکتے دیوار پھلانگ کر نظروں سے ایسے اوجھل ہوئی جیسے الیکشن جیتنے کے بعد سیاستدان''۔ اس قسم کے واقعات سن کر محلے کے مولوی حضرات نے فوراً فتویٰ ٹھوک دیا: ''بھائیو بس قیامت آیا چاہتی ہے سو ہمیں اپنے اپنے گناہوں کی اجتماعی معافی مانگ لینی چاہیے''۔ بلاں کے خوف سے مسجدیں بھر گئیں اور ڈیرہ شہر کی عورتیں دل و جان کی بجائے فقط اپنی جان بچانے کی خاطر خاوندوں کی خدمت کرنے لگیں تا کہ وہ بلاں کی گڈ بک میں آ جائیں۔

رمضان کے آخری عشرے اور عید الفطر کی آمد سے چند روز پہلے بلاں نے یک طرفہ سیز فائر کا اعلان کرتے ہوئے شہر کی دیوارں پر خوفناک پیغام لکھا ''خوش نہ تھیوؤ، میں عید دے بعد ول آساں''۔ بلاں کی وال چاکنگ اور الیکٹرانک و پرنٹ میڈیا کی بھرپور کوریج نے اسے شہرت کی بلندیوں تک پہنچا دیا، مگر اسے بین الاقوامی سطح پر متعارف کروانے کا سہرہ ''اپنا ڈیرہ ڈاٹ کام'' (Apnadera.com) کے سر جاتا ہے۔ ہماری اس ویب سائٹ کے مقامی نمائندے وقتاً فوقتاً بلاں کے بارے میں بریکنگ نیوز دیتے رہے اور موصول ہونے والی تازہ خبروں کی روشنی میں ڈیرہ سے وصی شاہ، اقبال کروڑی، دوبئ سے عظمت خاکوانی، محمد ابراہیم اور محمد رمضان، آسٹریلیا سے فاروق میانہ اور ڈیرہ وال نگر (دہلی) سے مکیش اسیجا سمیت ہم سب اپنی اپنی ماہرانہ رائے دیتے رہتے۔ کوئی اسے شعبدہ باز، کوئی جن بھوت، عفریت، کوئی سائنس فکشن، کوئی نظری سراب، کوئی کونسلر، کوئی ایم این اے، کوئی مارشل آرٹ کا ماہر، کوئی ہتھوڑا گروپ کا دوسرا جنم تو کوئی قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی شمار کرنے لگتا۔ کچھ پڑھے لکھے ڈیرے والوں کے مطابق یہ کوئی جن، بھوت، چڑیل یا جادوگرنی نہیں بلکہ خفیہ کا کوئی تربیت یافتہ بندہ ہو سکتا ہے، بہر حال جتنے کمپیوٹرز اتنے کی بورڈ۔ شہر بھر کی عورتوں کے ساتھ بلاں کے نازیبا اور غیر انسانی سلوک کے تناظر میں ہم سب ویب سائٹ کے ڈسکشن فورم میں پہلے دن ہی اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ عفریت جو کوئی بھی ہے کرتوتوں سے شادی شدہ ہے اور جنس کے لحاظ سے نر لگتا ہے۔ ستمبر کا پورا مہینہ ویب سائٹ کی سب سے ہاٹ نیوز'' ڈیرہ میں نظر آنے والی بلاں اور اس کی کارستانیاں'' چھائی رہی۔ جب پولیس اس عفریت نما چھلاوے کو پکڑنے میں ناکام ہو گئی تو عوام کا منہ بند رکھنے کے لیے انہوں نے ڈیرہ کے روڈ ماسٹر اور جیمز بانڈ

007اختر طوفان عرف ''اختر دا گریٹ'' کو حوالات میں بند کر دیا۔ اس واقعہ کے کچھ ہی عرصہ بعد جب مجھے ڈیرہ جانے کا اتفاق ہوا تو میں اختر طوفان سے خصوصی طور پر ملا، چونکہ وہ میرا ہائی سکول کے زمانے کا دوست رہا ہے، اسی لیے اس نے کھل کر سارا ماجرا من وعن سنایا۔ بقول اختر کے: ''میں سارے دن کی مٹر گشت اور روڈ ماسٹری کے بعد اپنی سائیکل اسٹینڈ پر کھڑی کیے، اپنا آفیشیل اور پروفیشنل ڈریس ''وگ، عینک اور مونچھیں'' اتارے تھکا ہارا گھر کے صحن میں چارپائی پر لیٹے خراٹے لے رہا تھا کہ ان ظالم داتریوں (پولیس) نے میرے گھر کی عقبی دیوار پھلانگ کر میرے اوپر ایک میلی بدبودار چادر ڈال دی۔ چادر سے نکلنے والی گوبر کی قدرتی کلوروفارم بو نے مجھے ہوش وخرد سے بیگانہ کر دیا، پھر ان ظالموں نے مجھے ٹنگا ٹوری اٹھایا اور پولیس کی ڈاٹسن میں پٹخ دیا، پولیس نے مجھے اتنی مہلت بھی نہ دی کہ میں اپنی طوفانی اشیاء مثلاً وِگ، عینک، سائیکل وغیرہ اپنے ساتھ لے لیتا۔ تھانے پہنچتے ہی سب سے پہلے ایک سپاہی کسی ٹیلر ماسٹر کی دوکان سے اٹھایا ہوا فیتہ ہاتھوں میں پکڑے میری قد کاٹھ، گردن اور دوسرے جسمانی اعضاء ماپنے لگا۔ میں دل ہی دل میں بڑا خوش ہوا کہ شاید مجھے پولیس میں بھرتی کیا جا رہا ہے، لیکن میری خوشی اس وقت کافور ہو گئی جب ایک سپاہی نے چہکتے ہوئے تھانیدار کو بتایا: ''سر جی قد کاٹھ، حرکات وسکنات اور کرتوتوں کے حساب تو مجھے اختر ہی چھلاوا نما بلاں لگتا ہے''۔ میں نے سنتری سے کہا: ''یار خدا کا خوف کرو، میں اپنی ماں کے خوف سے رات نو بجے کے بعد گھر سے باہر نہیں نکلتا، بھلا اتنی رات گئے کسی اور کے گھر کیسے گھسوں گا؟''۔ میں نے تھانیدار سے التجائی انداز میں پوچھا: بادشاہو مجھے کس جرم میں پکڑا گیا ہے؟ وہ الٹا مجھے گھورتے ہوئے بولا: ''تم نے جو نظریاتی نعرے کی تختی ''مجھے لڑکیوں سے نفرت ہے'' اپنی سائیکل پر لگا رکھی ہے وہی تمہیں تفتیش کے دائرے میں لے آتی ہے کیونکہ بلاں کو بھی عورتوں سے شدید نفرت ہے۔ خیر پولیس نے تفتیش کے بہانے اختر بیچارے کی خوب گرم ٹکور کی، دوسری صبح اسے دریا کنارے بنی چاند ماڑی پر چڑھا کر نیچے چھلانگ لگانے کا حکم دیا گیا تاکہ اختر کے پھرتیلے پن کا اندازہ لگایا جا سکے۔ اس غیر انسانی سلوک پر اختر طوفانی انداز میں کُرلاتے ہوئے بولا: جناب مجھ غریب پر رحم کریں، چھلانگ لگانے سے آپ کا تو کچھ نہیں بگڑے گا مگر ٹانگ ٹوٹنے کی صورت میں میری واحد بے بی سائیکل یتیم ہو

جائے گی باقی مجھ سے کوئی سی بھی قسم اٹھالیں، میں بلاں نہیں ہوں۔ اختر نے اپنی ناک پر انگلی رکھتے ہوئے اپنے دونوں نتھنوں کو سختی سے بھینچا اور دریا میں گرنے والے گندے نالے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''مجھے قسم ہے دریا میں گرنے والے اس گندے نالے کی اگر میں جھوٹ بولوں تو اللہ مجھے سیاست دان یا کسی قریبی پولیس چوکی کا تھانیدار بنادے، جناب میرا بلاں سے دور دور تک کا واسطہ نہیں، بلکہ اُس ذلیل نے تو میری شہرت کو بھی داغدار کیا ہے۔ اتنی بڑی قسم اٹھانے پر پولیس بھی سوچنے پر مجبور ہوگئی دوسرا اختر کی گرفتاری کے دوران بھی بلاں نے اپنی نازیبا اور مذموم حرکات جاری رکھی تھیں تب کہیں جا کر پولیس کا اختر پر شک ختم ہوا اور اسے باعزت بری کردیا گیا۔ اس واقعے کے تقریباً ایک ہفتہ بعد پولیس نے بڑے ڈرامائی انداز میں بلاں کو پکڑ لیا، اسی دن ہی اپنا ڈیرہ ویب سائٹ پر یہ خبر جھلملا رہی تھی: ''بھراوَ! بلاں پکڑی گئی ہے''۔

بلاں کے پکڑے جانے پر عورتوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ اس موقع پر ایک مظلوم شوہر نے کچھ اس قسم کا بیان دیا: ''میرے لیے تو بلاں رحمت کا فرشتہ بنی ہوئی تھی، ستمبر کا پورا مہینہ میری بیوی نے نہ صرف سیر وشکر ہوکر کاٹا بلکہ میری ماں کی بھی دل کھول کر خدمت کی مگر افسوس کہ بلاں کے پکڑے جانے کی خبر سنتے ہی میری زوجہ کے رویے نے یکسر پلٹا کھایا اور یوٹرن لیتے ہوئے اس نے حسب عادت اپنے دیرینہ مطالبے ''الگ گھر، نئی تاں تلی تے طلاق'' کی رٹ پھر سے لگانا شروع کردی ہے۔

خفیہ ایجنسیوں کی تحقیق سے پتہ چلا کہ: ''وہ کوئی بلاں وَلاں نہیں تھی بلکہ بیویوں کے ہاتھوں تنگ آئے تیرہ عدد شادی شدہ افغانیوں کا ایک گروہ تھا، جن کا مقصد خواتین کو ڈرانا دھمکانا، شہر بھر میں خوف وہراس پھیلانا اور خوف ودہشت زدہ ماحول کا فائدہ اٹھاتے ہوئے سیدھے سادے ڈیرے والوں کو تعویز گنڈوں کے بہانے لوٹنا تھا۔ ایجنسیوں نے اس سے زیادہ کچھ نہ بتایا اور ہمیشہ کی طرح یہ دلچسپ کیس بھی سردخانے کی زینت بنادیا گیا۔

....

چھوڑ آئے ہم وہ گلیاں

دھند کی شناسا خوشبو میں لپٹی سردیوں کی رات قطرہ قطرہ بھیگتی چلی جا رہی تھی۔ بس نے جونہی شیخ یوسف اڈہ کراس کیا، میں ننھی زینب کو گود میں لٹائے کھڑکی کا پردہ سرکائے پیچھے کو بھاگتے دوڑتے مناظر دیکھنے لگا۔ درخت، مکانات، دکانیں ہر چیز پیچھے کی سمت دوڑ رہی تھی جبکہ سفر آگے کی جانب رواں دواں تھا۔ اس لمحے میرے احساسات بہت عجیب تھے، آنسوؤں کی دھند بار بار میری آنکھوں پر چھا کر سامنے کا ہر منظر دھندلا رہی تھی۔ ہر شے کو میری نظر عقیدت اور محبت سے چوم رہی تھی۔ ہماری گاڑی ڈائیو واڈے پر بریکیں لگا چکی تھی۔ سامان کے ہمراہ سفر کی تھکان کو عزیز و اقارب نے آپس میں بانٹ لیا اور ہم ان سب کے جھرمٹ میں آگے بڑھ آئے۔ میں اگرچہ ساڑھے تین سال کے بعد آسٹریلیا سے واپس لوٹا تھا مگر مجھے پردیسی ہوئے چودہ سال پورا ہونے کو آئے تھے۔ مجھے 1997ء کی وہ سرد رات کبھی نہیں بھولتی جب نیو خان کی لاری میں کپڑوں کے ایک چھوٹے سے بیگ کے درمیان کمپیوٹر سائنس کی ڈگری رکھے روٹی رزق کی تلاش میں لاہور کے لیے روانہ ہونے لگا تو اڈے تک پہنچتے ہی پردیسی ہو چکا تھا۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی جہاں دھرتی ماں نے قدموں سے لپٹ لپٹ کر میرا استقبال کیا وہیں کسی بھی قسم کی نظر نہ آنے والی مثبت تبدیلی نے میری مونجھ میں اضافہ کر دیا۔ یہاں کچھ بھی نہ بدلا تھا۔ وہی کچے پکے مکانات، تنگ بل کھاتی گلیاں اور دھول اڑاتے ناہموار راستے۔ کچھ مکانات اگرچہ پختہ ضرور ہوئے تھے لیکن گلیوں کی حالت پہلے سے بھی بدتر تھی۔

کافی عرصہ بعد ڈیرہ کی مخصوص گرم رضائی میں بھرپور نیند کا مزہ لینے کے لیے جیسے ہی گھسا تو نیند کی دیوی نے بازو پھیلا کر اپنی آغوش میں بھر لیا۔ ایک بھرپور نیند کا مزہ لینے کے بعد صبح سویرے اٹھ کر ناشتہ

کیا اور پھر کسی کو بتائے بغیر چادر میں اپنے خاکی وجود کو لپیٹے، مصلےٰ پر بیٹھے اللہ سائیں کا ذکر کرتی، ریاضت کاڑھتی، یا حی یا قیوم اور ورد کے موتی چنتی آواز کے تعاقب میں نکل کھڑا ہوا۔ وہ نور بھرا چہرہ کہ جس پر وضو کا پانی بڑی دیر تک موتیوں کی طرح چمکتا رہتا تھا، وقت سے پہلے ادھوری خواہشوں کی قبر میں جا لیٹا تھا۔ یہ ہستی اب مجھ سے قیامت کی مسافتوں پر تھی۔ اپنے اردگرد منڈلاتی ساری سوچیں، تفکرات، سینے میں دبا سالوں کا غبار اور ملن کے سارے روٹھے موسم اُس ہستی سے شیئر کیے جس کے بغیر میرا اپنا وجود بے معنی اور میرے الفاظ و احساسات بے وقعت ہیں۔ ماں بھی کیا عجب رشتہ ہے؟۔ دنیا کی سب سے نادر و نایاب ہستی، گلوب کی سب سے بڑی سچائی۔ ایک ایسا وجود کہ جس کے پاؤں چھونے سے جنت ملے، جو دھرتی پر ساتھ چلے تو دھرتی امبر بن جائے اور جو گود میں سمیٹے تو کائنات سے بھی بسیط تر ہو جائے۔ جنت کیا چیز ہے؟۔ ماں تو دنیا میں خدا کا دوسرا روپ ہے۔ قبرستان سے سیدھا گھر آ کر سائیکل کے دونوں ٹائروں کو انگوٹھے دبا کر ہوا چیک کی۔ مڈگارڈ پر جھاڑن پھیرا اور از سرِ نو شہر کا جغرافیہ کھوجنے نکل کھڑا ہوا۔ اسلامیہ کالونی کی تنگ ترین گلی جسے مین اسٹریٹ کہتے شرم آتی ہے، جہاں ہمیشہ ایک طرف پانی نالے سے نکل کر سڑک پر بہہ رہا ہوتا ہے تو وہیں کوئی نہ کوئی رکشہ کار کے سامنے اٹکا نظر آتا ہے، آج بھی وہاں حسبِ معمول ایک آٹو رکشہ آف وائٹ کلر کی چھوٹی سی کار کے سامنے سینہ تانے پھڑ پھڑا رہا تھا۔ رکشہ کے پیچھے لکھی عبارت "کراس کر یا برداشت کر" پڑھ کر میں نے اس آرکیٹیکٹ کو کوسنے دیئے جس نے حقوق العباد کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے مین اسٹریٹ کو تنگ ترین ڈیزائن کر کے اوپر اسلامیہ کالونی کا لیبل چسپاں کر دیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اسلامیہ کالونی کا نقشہ کسی مستند نقشہ نویس کی بجائے ایک کرپٹ پٹواری نے ترتیب دیا تھا، خیر میں کسی نہ کسی طرح سرکلر روڈ پر آ پہنچا اور وہاں سے پولیس کے سیکورٹی بیریئر کو کراس کرتا مسلم بازار کی طرف بڑھنے لگا۔

میرے دائیں طرف ڈگری کالج، پولیس چوکی اور پھر پرائمری سکول نمبر 3 کا داخلی دروازہ تھا۔ بچوں کو سکول جاتا دیکھ کر یادداشت کی مٹھی سے ایک ایک منظر نکل کر میرے سامنے آنے لگا۔ بچپن کی حسین یادیں، لڑکپن کے ادھ ادھورے جذباتی قصے اور کہانیوں کا ایک ہجوم مجھے گھیرے ہوئے تھا۔ یک لخت میری سائیکل کے پہیے جام ہو گئے۔ میں سکول کے بچوں کے سنگ سبک روی سے کسی ندی کی مانند الٹی سمت بہنے

لگا۔سکول وہی تھا لیکن عمارت نئی تھی۔قریشی بک سنٹر کے قریب کرائے کی بلڈنگ والی پرانی عمارت اٹھ کر کب کی پولیس چوکی نمبر 4 کے عقب میں منتقل ہو چکی تھی۔ میں بڑی دیر تک نئی عمارت کے خدوخال میں جانے کیا کھوجتا کیا تلاشتا رہا۔ مجھے اپنے سکول کی عمارت میں کھگل کا تناور درخت کہیں دکھائی نہ دیا۔میرا وہ سکول کہ جس کے کچے فرش پر ٹاٹ بچھائے سارا دن دھوپ میں بیٹھے رہنا، ہر صبح باقاعدگی سے لب پہ آتی ہے دعاء بن کے تمنا میری۔۔معنی و مفہوم سے بے نیاز خوب زوروشور سے بہ آواز بلند پڑھنا اور پھر یک دونے دونے، دو دونے چار خوب لہک لہک کر پہاڑے پڑھنا نہیں بھولتا۔خوش خطی کے خیال سے استاد سعید ہم سے سارا دن تختیاں لکھواتے، ہم تختیاں دھوتے جاتے،''سُکی اے سُکا ڈے چالی بٹالا ڈے'' کہہ کر سکھاتے جاتے اور پھر تواتر سے لکھتے چلے جاتے تھے۔میرا دوست قیصر زیب ہم سب سے خوش خط ہوا کرتا تھا۔جب کبھی ہیڈ ماسٹر ہماری کلاس میں ٹیسٹ لینے کی غرض سے تشریف لاتے تو استاد صاحب ماجد اقبال، قیصر زیب، غلام سرور، عبداللہ جان اور مجھے اُن کے روبرو کھڑا کر کے فخر یہ کہا کرتے:''اے میڈی کلاس دے چوٹی دے لڑکے ہن''۔قیصر زیب کے والد اورنگزیب خان ڈیرہ کے جانے مانے وکیل تھے، ماجد اقبال کے والد غلام قاسم قریشی پولیس میں ڈی ایس پی تھے، عبداللہ جان غلہ منڈی میں کام کرنے والے مزدور صاحب جان کا بیٹا، غلام سرور کا باپ ریڑھی فروش اور میں ایک عام سے دکاندار کا بیٹا، لیکن ہم میں کوئی کلاس ڈیفرنس نہ تھی۔گھر سے باہر ہم سب یار دوست تھے، ہم میں مساوات تھی، محبت تھی۔ہم میں کسی دکاندار، پانڈی، وکیل، ریڑھی فروش اور پولیس آفیسر کی اولاد میں کوئی تفریق نہ تھی۔ ہماری مشغلے ایک تھے، کھیل ایک۔ہم سارا دن سکول میں اکھٹے بیٹھ کر پڑھتے، اکٹھے گلی محلوں میں گھومتے اور ایک ہی قسم کے کھیل کھیلا کرتے تھے۔آدھی چھٹی پر بُور، دال ٹانگری، قلفیاں، آلو موٹھ، مکئی کے بھٹے، چورن، پتیسہ، جگر ٹھار، فالودہ، برف کے گولے اور مرونڈے۔ہمارے چَو سے اور چسکے تھے کہ ختم ہونے کا نام نہ لیتے تھے۔

ایک یاد آتی ہے اور بس پھر یادوں کے ہجوم لگ جاتے ہیں۔ بدلتے موسم کا سندیسہ دیتی خوشگوار آہٹ جیسے ہی چہار سو خوشیوں کے رنگ بکھیرتی، اسلامیہ کالونی سمیت ڈیرہ کے مضافاتی علاقوں میں سرسوں پھولنے لگتی اور پورا علاقہ چنبیلی کی مسحور کن خوشبو سے مہک اٹھتا۔چھتر کے اخیر میں فصلوں کی کٹائی کی

خوشی میں میلہ اسپان۔ وسیب کے مضافاتی علاقوں بھکر، دریا خان، پہاڑ پور، میانوالی، رنگ پور، پروآ، شور کوٹ، حسام اور درابن کلاں سے ڈاٹسنوں کی ڈاٹسنیں اور ٹانگے بھر بھر کر شہر پہنچتے۔ پولو گراؤنڈ پر لگے میلے کے اسٹالوں پر بکنے والی شیریں جلیبیاں، ڈوکل بیر اور رس بھرے لمبوترے شہتوت۔ موسم ذرا سا پلٹا کھاتا تو ہم پتنگیں لے کر چھتوں پر چڑھ دوڑتے۔ بڑے اہتمام کے ساتھ ڈوروں پر مانجھے لگائے جاتے اور گڈیوں کے رنگین پیراہنوں سے آسمان سجایا جاتا۔ ہر آگہی سے پاک کسی خوش رنگ تتلی کی طرح زندگی کے وہ بڑے سہانے دن تھے جنہیں چاہ کر بھی بھلانا ممکن نہیں۔

1985ء سے 2011ء تک، پچیس، چھبیس برسوں میں کوئی چیز بھی تو اپنی جگہ پر نہیں رہی تھی۔ ہرے بھرے پتوں سے لدا پھدا زندگی کا شجر بوڑھا ہو چلا تھا۔ ماہ و سال کی تیز دھوپ نے سبز پتوں کو جھلسا کر بے جان کرتے ہوئے وقت کی رنگین بہاروں پر زرد خزاؤں کا پہرہ بٹھا دیا تھا۔ وقت دھیرے دھیرے سرکتا رہا تھا اور شجر سے ہر سال ایک پتہ کم ہوتا چلا گیا تھا۔ استاد صادق، استاد خورشید، استاد سرور، استاد رزاق، استاد مجید اور ہیڈ ماسٹر شیر زمان کی صورت سایہ دار درختوں کا جو ایک جھنڈ سایہ فگن تھا وہ باقی نہیں رہا۔ کوئی کہیں تو کوئی کہیں، کسی کی شاخوں کو زمانے نے جدا کر دیا اور کسی کا تنا بوسیدہ ہو گیا۔ استاد سعید بھی بالآخر خزاں کے آخری پتے کی مانند نئی کونپل کو جگہ دینے کے لیے حال ہی میں ٹوٹ کر بکھرے ہیں۔

آنکھ کے پردے سے مانوس چہروں کا محو ہوتے ہی بھول جانا، یاد نہ رہنا اور یادداشت سے اتر جانا۔ لمحہ بہ لمحہ گزرتے پل کی ڈھیریاں اور اس کے نیچے دبتی، گم ہوتی یادیں۔ دھندلے اور ماند پڑتے جانے پہچانے چہرے، مانوس لب و لہجے۔ وقت بہت ظالم ہے، یہ انسانوں کو اسی طرح نگل جاتا ہے جس طرح درختوں کو گھن کھا جاتا ہے۔ استاد سعید کے انتقال کی خبر سن کر ریڑھ کی ہڈی میں ٹھنڈی لہر سی دوڑ گئی۔ دنیا فانی ہے۔ بھلا کون یہاں ہمیشہ رہتا ہے؟۔ میرا اب یہاں کیا کام، جو لوگ مجھے جانتے تھے وہ تو کب کے چلے گئے، اب مجھے اس عمارت میں کوئی نہیں پہچانتا۔ میں بوجھل قدموں کے ساتھ سکول کی عمارت سے باہر نکل آیا۔ راستے میں کسی نے سفیدے کے پتوں کو اکھٹا کر کے جلانے کے لیے رکھ چھوڑا تھا، جس میں سے ثقیل سا دھواں آسمان کی طرف اٹھتا دکھائی دیا۔ مجھے یکا یک استاد سعید کا جملہ یاد آ گیا۔ درختوں کے پتے جب

خشک ہو کر ٹوٹنے، جھڑنے اور بکھرنے لگیں تو سمجھو خزاں کا موسم آ گیا۔ استاد کے کہے گئے الفاظ ہوا میں ٹھہر سے گئے تھے، جسے تحلیل ہونے سے پہلے میں نے اپنے اندر اتار لیا۔ واقعی خزاں کا موسم ہے ہی ایسا ظالم، جدا کر دینے والا۔ کہیں خشک پتے بکھر کر پیروں تلے آ کر چرمراتے ہیں تو کہیں ان کے جلنے سے دھواں سا اٹھتا دکھائی دیتا ہے۔ خزاں اداسی کی، ملن کے روٹھے موسموں کی افسردہ نشانی ہے۔

سکول سے باہر آتے ہی میں دائیں کروٹ لیتا شمالی سرکلر روڈ پر چڑھ آیا۔ ہلکی سی دھند اور کہر میں لپٹا روڈ اداس سا دکھائی دیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اسّی، نوے کی دھائی تک اس روڈ پر درختوں کی لمبی قطاریں ہوا کرتی تھیں۔ انگریز دور کے لگائے گئے انہی درختوں کی چھایا میں تپتی دوپہروں میں ہم سب ماانجھے لگایا کرتے، لیکن جنوری 2011ء کی ٹھٹھرتی صبح دھند کے پار درختوں کا سلسلہ اب باقی نہیں رہا۔ ماحولیات کے دشمنوں نے ان سب درختوں کو بڑی بیدردی سے کاٹ کر بیچ ڈالا۔ اس موقع پر مجھے انگریز مصنف میجر ہربرٹ ایڈورڈ کے وہ الفاظ یاد آ گئے جو اُس نے ڈیرہ، بنوں اور لکی مروت میں ایک سالہ قیام کے دوران اپنی یاداشتوں پر مبنی مشہور کتاب ''A year on the punjab frontier'' میں لکھے تھے کہ '' بکری، اونٹ اور مسلمان درختوں کے سخت ترین دشمن ہیں''۔ قارئین کو شاید میجر ایڈورڈ کے الفاظ گراں گزریں لیکن بدقسمتی کی حد تک یہ بات حقیقت کے قریب تر ہے۔ میں سرکلر روڈ پر سائیکل دوڑاتا کنیر انوالہ گیٹ کو پیچھے چھوڑتا امامیہ گیٹ سے صدر بازار اور وہاں پر چنگ چی کے شور و غوغا سے نکلتا محکمہ موسمیات والی سڑک سے سندھ کنارے آن کھڑا ہوا تھا۔

میرے سامنے سندھو دھیرے دھیرے بہہ رہا تھا۔ ہر آن متحرک وقت کے تند و تیز دھارے میں بہنے والا یہ وہی شیر دریا تھا جو آج سے چار ماہ پہلے ہزاروں سالوں پر پھیلی انسانی تاریخ کو ملیا میٹ کر کے بستیوں کی بستیاں نگلتا شوکتا، چنگھاڑتا جب سمندر کا پیٹ بھرنے نکلا تو اپنے پیچھے بھوک، مفلسی، بدحالی کی ڈھیروں داستانیں اور آنسوؤں کا نہ رکنے والا سیلاب چھوڑ گیا تھا۔ آج 2011ء نئے سال کے ابتدائی مہینے کے پہلے ہفتے کا چوتھا دن چل رہا تھا۔ سندھ کنارے رینگنے والی زندہ لاشوں نے نئی صدی کا پہلا عشرہ اپنے آپ کو گھسیٹتے جیسے تیسے مکمل کر ہی لیا تھا۔ جدید دنیا کا انسان اینالاگ دور کو پھلانگ کر ڈیجیٹل دور میں

داخل ہو چکا تھا۔دنیا کے ہر کونے میں دو ٹانگوں پر چلنے پھرنے والی مخلوق کو وقار ملا تھا اور اس نے ترقی کی کئی اور منازل طے کر لی تھیں مگر افسوس کہ یہ عشرہ بھی یہاں پر امن،انصاف،خوشحالی اور تحفظ کو ترسی عوام کی زندگیوں میں کوئی خوشگوار تبدیلی نہ لا سکا۔سرائیکی قوم اس سال بھی اچھے دنوں کی صرف راہ تکتی رہ گئی۔مفلسی،ناانصافی،بدامنی،بے روزگاری اور محتاجی پہلے کیا کم تھی کہ اس بار سندھو کی قاتل لہروں نے ان غریبوں کے سروں سے آشیاں اور قدموں تلے سے زمین سرک لی تھی۔بنیادی ضروریات سے محروم خطے کی ترسی عوام کو آسائشیں کیا میسر آتیں زندگی کی بقا اور سروائیول ان کے لیے اب ایک بہت بڑا سوالیہ نشان بنے منہ چڑا رہی ہے۔پتہ نہیں اسے حادثہ کہیں،امتحان،آزمائش کی گھڑی یا پھر قہر الٰہی۔سب کی اپنی منطق،سب کی اپنی لاجک۔ہاں مگر یہ جو کچھ بھی تھا اپنی آزمائش کرا گیا۔اگر اہلِ دانش اسے حادثہ سمجھیں تو اس ہلا دینے والے حادثے نے زیست کو مشکل تر بنا دیا،جہاں پر ہر کوئی اپنی شناخت سنبھالے،اپنا حوالہ اٹھائے آگے بڑھا اور اگر اسے اللہ سائیں کی طرف سے آزمائش کا نام دے کر توبہ استغفار کی تسبیح پڑھیں تو پھر اگست 2010 کا سیلاب واقعی سرائیکی وسیب کے انسانوں کی کڑی آزمائش ثابت ہوا۔نہ جانے کتنے گھر اجڑے،کتنی عمارتیں پانی میں بہہ گئیں؟۔کتنی بیماریاں پھیلیں،کتنی اموات ہوئیں؟دکھوں کا حساب رکھنا ناممکن۔بے مکانی،بے سروسامانی،تہی دامن اجڑے ہوئے انسانوں کی کہانیاں۔جن کی خواہشیں،جن کے خواب،جن کی امیدیں سب کچھ پانی بہا کر لے گیا۔ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں لوگ دربدری کے کڑے عذاب سے گزرے۔جہاں خوراک کے وسیلوں کے انتظار میں کئی آنکھیں بند ہوئیں وہیں نقل مکانی بھی ان کے لیے ایک امتحان بن گئی۔گلی محلوں سے کھیتوں،کھلیانوں،میدانوں اور سڑکوں تک کا سفر سب سے زیادہ تکلیف دہ تھا۔

قاتل سندھو قیامت کا حشر برپا کیے اب ندامت سے کسی بل میں منہ چھپائے میرے سامنے بہہ رہا تھا۔چند ایک پرندے اس کے گدلے پانی پر اڑانیں بھر رہے تھے۔جنوری کے اوائل دنوں کی میٹھی سمٹی سمٹی دھوپ جب بادلوں سے چھن کر سندھو کے سینے پر پڑتی تو اس کی گدلی جلد چمکنے لگتی۔میرے قدموں تلے وہی تاریخی پشتہ تھا جسے بگائی سیٹھ نے تعمیر کروایا تھا اور اسی پشتے نے ڈیرہ شہر کے باسیوں کو مکمل غرق آبی

سے بچایا تھا۔شیر دریا کونتھ ڈالنے والے بگائی سیٹھ وہ پہلی اینٹ تھے کہ جس سے ایک عمارت کی تعمیر ہوتی ہے۔ایک ایسی اینٹ کہ جسے اگر بیچ میں سے نکال دیا جائے تو عمارت ڈھیر کے سوا کچھ نہیں رہتی ۔کہا جاتا ہے کہ اپنی ذات کی نفی کر کے دونوں ہاتھوں سے محبتیں بانٹنے اورعلم کے دیپ جلانے والے اس شخص کے ساتھ سندھو نے کچھ اچھا نہ کیا تھا۔میں نے سرشاری سے سڑک پر کھڑے ہو کر بگائی کو Tribute پیش کرتے ہوئے اُس سوچ کی نفی کی''دیرے وال آیاں دے ہن جایاں دے نیں''۔آتے جاتے اِکا دُکا لوگوں نے نہ جانے کیا سوچا کیا سمجھا ہوگا لیکن اگر وہ مجھ سے اس سیلوٹ کی وجہ پوچھتے تو میں انہیں ضرور بتاتا کہ میں اپنے اجداد کا پچھلی ایک صدی کا قرض اٹھائے پھر رہا تھا جو آج میں نے لوٹا دیا۔اس سیلوٹ نے میرے اندر ایک نئی توانائی بھر دی، میں اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔اسی اثنا میں کہیں دور سے سناٹے کو چیرتی آواز نے میرے اندر حیرت آمیز مسرت جگا دی۔یہ کسی کشتی کی آواز تھی جو نارمل رفتار اور تسلسل کے ساتھ بہتی چلی آ رہی تھی۔میں آواز کے تعاقب میں واپس پلٹا اور سر دیاب شادی ہال کے پہلو میں بنے ایک ہوٹل پر آن رکا۔ہوٹل کے آگے بچھی چار پائیوں پر چند لوگ بیٹھے تھے جبکہ ڈھلوان کی طرف اترتے کچے راستے پر پڑی چار پائیاں اور ہوٹل کب کے اجڑ چکے تھے۔دریا کے کنارے کھڑے کچھ درختوں کی جڑوں کو بھی سیلاب کی طغیانوں نے کھوکھلا کر دیا تھا۔کچھ گر گئے، کچھ کی شاخیں کٹ گئیں اور کچھ ٹنڈ منڈ سے درخت اپنا بوجھ اٹھائے کھڑے اب بھی دکھائی دے رہے تھے۔شادی ہال کے سامنے سینہ تانے سب سے الگ اور منفرد کھڑا، پھولوں، پتوں اور سبزے سے عاری ٹنڈ منڈ ٹیڑھا سا درخت ہر دیکھنے والی آنکھ کو فیسی نیٹ کر رہا تھا۔اگر اس درخت کی شاخیں ہری بھری ہوتیں تو کوئی نہ کوئی مسافر اس کی چھاؤں میں ستانے کو ضرور رکتا لیکن مسافر تو راستہ بھول گئے تھے۔

چاند ماڑی کے قریب پتھروں کی بنی سیڑھی پر ہاتھ میں موٹا سا ڈنڈا لیے ایک چرواہا دنیا و مافیہا سے بے نیاز نیم وا آنکھوں سے ہلکی دھوپ میں مدہوش سا دکھائی دیا۔اس کے اردگرد پانچ، چھ موٹی بھینسیں چر رہی تھیں اور وہ خود اینچیوں کی طرح آنکھیں بند کیے اپنے آپ میں گم رانجھے کی طرح بے فکری سے سڑک کی جانب پشت کیے کسی ہیر کے انتظار میں بیٹھا تھا۔کچھ فاصلے پر دریا کنارے پیپل کا ایک بہت بڑا درخت

زمین میں اپنے پنجے گاڑھے ایستادہ نظر آیا۔ واقعی ایک ہی جگہ ٹکے رہنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ چلتے چلتے مڈ وے ہوٹل کے عقب میں بنے آموں کے باغ پر نظر پڑی۔ باغ کے اندر بنے پگڈنڈی نما رستے میرے دیکھے بھالے تھے میں کبھی کبھار پڑھنے کے بہانے ذہنی سکون کی خاطر یہاں چلا آتا تھا۔ گزرے موسموں کے کئی گم شدہ لمحات اوران میں سے ایک وہ فرصت بھرا لمحہ جب کسی پیڑ کے تنے پر ایک چاہت بھرا نام کھرچا تھا۔ کافی تگ ودو کے باوجود مجھے وہ درخت نہ مل سکا۔ شاید میں اسے ڈھونڈ نہ پایا یا پھر شاید اس کے قریب پہنچ کر اسے پہچان نہ سکا۔ بھلا پہچانتا بھی کیسے؟ درمیان میں کتنے ماہ وسال، کتنے موسم ٹھہر ٹھہر کر گزرے تھے۔ پرت پرت لباس بدلتے درخت اپنے جسموں پر لکھے نشانات کتنی جلدی مٹا دیتے ہیں۔ ایک لمبا سفر اور سفر سے واپسی پر اگر درختوں پر کھرچی تحریریں بھی مٹ چکی ہوں تو مسافت کی تھکان اور بڑھ جاتی ہے۔ بھلا درخت بھی کیا کریں؟۔ خاموشی سے ایک جگہ ٹکے رہنا، ٹھہر جانا، پرت پر پرت بدلنا ان کی فطرت ہے مگر انسان تو ایک جگہ نہیں ٹھہر سکتا، اسے تو بس چلتے جانا ہے کیونکہ جینا اسی کا نام ہے۔

دریا کنارے چلتے ہوئے بالو تھلے سے ذرا پہلے دریائے سندھ کی مشہور ''ڈیرہ لانچ'' زنگ آلود شکل میں کھڑی تاریخ کا منہ چڑا رہی تھی۔ اپنے وقتوں کی خوبصورت ترین لانچ جس پر پاکستانی فلم ''دلہن ایک رات کی'' شوٹ کی گئی تھی۔ مجھے صرف ایک بار اس لانچ پر سوار ہو کر کچھ دوستوں کے ہمراہ کچے تک جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ مگر اب بہت کچھ بدل گیا تھا۔ زندگی، ذہن، سوچ، وقت، حالات اور حتیٰ کہ انسان بھی۔ حقیقت کتنی کڑوی، کتنی تلخ ہوتی ہے اس کا اندازہ تو حقیقت میں رہتے ہوئے لگایا جا سکتا ہے۔ واقعی زندگی فلموں، ڈراموں اور کہانیوں سے ہٹ کر بڑی کھٹن، بڑی سنگین ہوا کرتی ہے۔ ماضی خواہ کتنا ہی سہانا کیوں نہ ہو جب حال بھیانک ہو تو آنکھ کھلتے اور سندر سپنے ٹوٹتے دیر نہیں لگتی۔ دریا کنارے ریت میں دھنسی لانچ، بالو کا تھلہ اور اس پر پیالے کی مانند دھرا زنگ آلود آہنی کونٹا ہماری بے حسی اور بے بسی کی نشان دہی کر رہا تھا۔ میرے تصورات نے دریائے سندھ کی جو صورت گری کی تھی وہاں وسعت کے ساتھ ساتھ کسی حد تک لامحدود طلسم اور رومانیت شامل تھی۔ برف پوش پہاڑوں سے نکل کر موٹے بل کھاتے سانپ کی طرح بہتا، مار دھاڑ کرتا یہ دریا جب وسیب میں داخل ہوتا تھا تو اس کی سج دھج دیکھنے لائق ہوا کرتی

تھی۔ وسیب کے اندر گھس کر اور اسے تر کر کے بحیرہ عرب کے پانیوں میں گم ہو جانے والا شیر دریا وقت کے بے رحم ہاتھوں گھائل، سکڑا، سمٹا اور آلودہ دکھائی دیا، جیسے شہر کے درمیان میں سے کوئی ندی نکل کر دھیرے دھیرے بہہ رہی ہو۔ تواتر کے ساتھ گرتے گندگی کے نالوں اور آس پاس اٹھتی باس سے پرے کھڑے ہو کر جب ہم میں سے کوئی سندھ کے پوتر پانیوں پر نظر ڈالے تو اسے کہیں بھی اپنا چہرہ دکھائی نہ دے۔ اس منظر نے مجھے خاصا مایوس کیا۔ کہتے ہیں کہ اکیسویں صدی پانی کی صدی ہے اور مستقبل کی جنگیں نیلے سونے یعنی بلیو گولڈ کے حصول کی خاطر لڑی جائیں گی۔ اسے وسیب واسیوں کی بدقسمتی کہیے کہ وہ قدرت کی بے پناہ فیاضیوں کے باوجود اپنے نیلے سونے کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ نہ لگا سکے بلکہ اپنی بے حسی اور نالائقی کے سبب ہم لوگوں نے دنیا کے قدیم ترین دریا کو ہر ممکنہ طریقے سے آلودہ کرنے میں بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی ہے۔ دنیا میں آسٹریلیا کی طرح کئی ایسے ممالک ہیں کہ جہاں دریا نہ ہونے کے باعث وہاں کے لوگ میٹھے پانی کو ترستے ہیں اور مجبوراً سمندر کے کھارے پانی کو فلٹر کر کے یا پھر بارش کے پانی کو پیوریفائی کر کے پینے کے قابل بنایا جاتا ہے ایک ہم ہیں کہ ایشاء کے سب سے بڑے دریاؤں میں سے ایک عظیم دریا کو آلودہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ شہر کے ہر علاقے سے نکلنے والا گندا پانی، فضلہ اور زہریلا کیمیکل براہ راست دریا میں گرتا ہے جس کی وجہ سے دریا میں کثافتیں بڑھ گئی ہیں اور اس کا سارا پانی آلودہ ہو چکا ہے۔ دریا کے میٹھے پانی میں زہریلا مواد شامل ہونے سے آبی حیات کو بھی خطرات لاحق ہیں۔ پانی زہریلا ہونے کے سبب مچھلیاں اور دیگر آبی حیات مر رہی ہے اور دریا کے کناروں پر رہنے والے مقامی لوگوں میں اس گندے پانی کی نکاسی کی بدبو کی وجہ سے زندگی اجیرن بن گئی ہے۔ سیوریج کے آلودہ پانی کی فلٹریشن کیلئے اگرچہ 1992ء میں ہی عالمی بینک کے تعاون سے مریالی کے مقام پر ٹریٹمنٹ پلانٹ منظور کیا جا چکا ہے لیکن بعض سیاسی وجوہات کی بناء یہ پراجیکٹ اپنے پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکا ہے۔ بدقسمتی سے ڈیرہ شہر کے اس اہم ترین مسئلہ کی جانب ابھی تک کسی عوامی نمائندے نے بھی کوئی توجہ نہیں دی۔ یہ سچ ہے کہ سوکالڈ جمہوری مگر اصلیت میں ہر پانچ سال بعد بدلتے کرپٹ ٹھیکے داری نظام میں ٹریٹمنٹ پلانٹ کا قیام اور سیوریج واٹر کی ری سائیکلنگ اور پیوری فیکیشن ممکن نہیں مگر کم از کم ہم اپنے دماغوں کی پازیٹو ٹریٹمنٹ کر کے اسے

اتنا فائن ٹیون تو کر سکتے ہیں کہ جب ہمارے اندر کی سوچ کو باہر کا راستہ ملے تو ایک انوائرمنٹ فرینڈلی معاشرہ جنم لے سکے۔ درختوں کی بے دریغ کٹائی، معصوم جانوروں اور پرندوں کا وحشیانہ شکار، کوڑے کرکٹ کے سلگتے ڈھیر، فیکٹریوں کا فضلہ، گاڑیوں اور بسوں سے نکلنے والی کاربن، سمندروں، نہروں اور ندی نالوں میں فیکٹریوں کا بہتا زہریلا کیمیکل نہ صرف فضائی اور آبی آلودگی کا سبب بن رہا ہے بلکہ ہم خود سب کچھ جانتے بوجھتے اپنے ہی ماحول کو آلودہ کرنے اور اپنے آپ کو مرنے مارنے پر تلے بیٹھے ہیں۔ ایک طرف ہم اپنے ہاتھوں سے آکسیجن پیدا کرنے والی فیکٹریوں (درختوں) کو کاٹ کر فضائی آلودگی میں اضافہ کر رہے ہیں تو دوسری طرف اپنے پاخانوں اور گندے نالوں کا رخ دریا کی سمت کر کے آبی حیات کا مکمل خاتمہ کر رہے ہیں۔ آخر ہم آلودگی پھیلا کر کرہ ارض سے کن جنموں کا بدلہ لے ہے ہیں؟۔ کیا ہمیں خوبصورتی سے پیار نہیں؟۔ کیا ہمیں اپنی زندگی بھی عزیز نہیں؟۔ ہم نفرتوں کی ہائے وے پر سرپٹ دوڑتے اُس دور کو بھی اوورٹیک کر آئے ہیں کہ جب گھروں کے آنگن میں ٹاہلی، جامن اور بیری کے درخت ہوا کرتے تھے۔ بہار آتے ہی سکھ چین کی گھنیری شاخوں والے یہ درخت ہرے بھرے سرسبز ہو جایا کرتے تھے، جن کے اوپر چڑیوں کا بسیرا ہوتا اور جن کی شاخوں پر لدے پھدے میٹھے میٹھے بیر اور جامن جب پک کر گرنے لگتے تو شاخ در شاخ پھدکتی ننھی چڑیاں نیچے اتر کر اسے اپنی نازک چونچوں سے چن کر کھانے لگتیں۔ پرندے اور انسان سب مل کر اپنے اپنے نصیب کا پھل کھاتے، تھالیاں بھر بھر کر ہمسائیوں کو بھی موسمی سوغات بھیجی جاتی۔ کیا عجیب نفسانفسی کی ہوا چل پڑی ہے۔ لوگ ایک دوسرے سے لاعلم نہ بھی ہوں تب بھی لاعلم ہونے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ دیوار کے اس پار کون آباد ہے؟۔ کسی کو کسی کی کوئی پرواہ نہیں مانا کہ ہم میں منشی شیوشاہ کی طرح تھوک کے حساب سے درخت لگانے کی سکت نہیں مگر سال میں ایک بار کسی نہ کسی جگہ اپنے نام کا ایک پودا ضرور لگا سکتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ہماری یہ چھوٹی سی کاوش مستقبل میں نہ صرف تناور درخت کی شکل میں فاسد مادوں اور پولیوشن کو نگل کر آکسیجن اگلنا شروع کر دے بلکہ کسی مسافر کے لیے گھنیری چھاؤں بن جائے۔ یہی اصل صدقہ، انسانیت کی معراج اور اصل اسلام ہے۔

دور پار اپنی شناخت سے محروم اذیت ناک زندگی گزارتے چلے آ رہے تل وطنیوں کے

جھونپڑوں پر نظر پڑی۔ وسیب کی قدیم ترین تاریخ اور اس کی صدیوں پرانی تہذیب یہاں پر بسنے والی تل وطنی (کیہل) قوم کے بغیر ادھوری رہے گی۔ جہاں سندھو کی اہمیت مقدم ہے وہیں اس کے اصل وارث تل وطنی اس کا دل و جان ہیں۔ جہاں قوموں، تہذیبوں کی مار دھاڑ اور انسانی غلبے کی خواہشات نے اس دھرتی کا کچومر نکالا وہیں ان لوگوں نے عروج و زوال کے المیے، جنگ، خون ریزیاں اور معرکے دیکھے اور یہ سب اس لوٹ مار کے چشم دید گواہ بنے۔

میں بند سے نیچے اترتا دھپا نوالی بستی میں داخل ہو گیا۔ بستی کے کسی کچے گھر کے آنگن سے دھواں سا اٹھ رہا تھا۔ گھروں سے اٹھتا دھواں زندگی کی علامت ہے، جسے دیکھ کر ایسے لگتا ہے کہ جیسے زندگی ان گھروں کے اندر ہی کہیں بھڑک رہی ہو۔ اگر کوئی تصور ہی تصور میں ان دھواں اٹھتے گھروں کے اندر جا کر دیکھے تو وہاں اکثر نرم و گرم حدت میں لپٹے کسی کونے میں چولہے کے سامنے چوکی پر بیٹھی جنت، آس پاس کھانے کے انتظار میں بیٹھے بچے اور کھانا پکاتے گاہے بگاہے پیار بھری نظر بچوں پر ڈالتی مامتا دکھائی دے۔ یہ منظر اتنا پرفیکٹ اتنا جاندار ہوتا ہے کہ انسان گھنٹوں اس کے سحر سے باہر نہیں نکل سکتا۔ ایک گھر کے باہر پڑی چارپائی پر بازوؤں کا تکیہ بنائے بزرگ بڑے مزے سے لیٹے دھوپ سینک رہے تھے۔ مجھے گرمیوں کی وہ طویل راتیں یاد آ گئیں جب راتوں کو چھتوں پر سونے کا رواج عام تھا۔ جیسے ہی چاند آسمان کے ایک سرے سے اپنا سفر شروع کرتا، گھر کے سارے افراد کے لیے ٹھنڈا ٹھار دودھ تیار کیا جاتا۔ بچوں میں اکثر دودھ بناتے وقت لڑائی ہو جایا کرتی۔ کوئی کہتا: اماں رتی بوتل کھیر وچ پاویں، کوئی ساوی (کریلے والی بوتل) کا رسیا ہوتا تو کوئی روح افزاء ڈالنے کی فرمائش کیا کرتا۔ ایک ترتیب کے ساتھ بچھی چارپائیوں پر سب باتیں کرتے کرتے اونگھنے لگتے، قریب ہی یونس فین کا پیڈسٹل پنکھا روبوٹ کی طرح رک رک کر گردن گھمائے اپنی گراری سے ٹک ٹک کی آوازیں نکالتا اپنی اپنی قسمت کی ہوا سب پر پھینکتا رہتا۔ رات کے کسی پہر گرمی کی شدت سے حلق خشک ہوتے ہی نیند کے خمار میں چارپائی کے نیچے سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر چپل برآمد کی جاتی اور گھڑے کے قریب بیٹھ کر کسی پیاسے اونٹ کی طرح خوب سیر ہو کر پانی پیا جاتا۔ برسات کی حبس والی راتوں میں چھت پر سونے کا اپنا الگ مزہ ہوتا تھا۔ بارش کا پہلا قطرہ سر پر

پڑتے ہی ساری چیزیں سمیٹ لی جاتیں۔ ہر کوئی اپنا اپنا بستر اٹھائے نیچے بھاگ رہا ہوتا۔ ہمارے جیسے کئی آلسی اٹھنے کی بجائے چارپائی پر بچھی تڈی نیچے سے کھینچ کر اپنے اوپر تان لیا کرتے اور حبس زدہ کمروں میں گھسنے کی بجائے برستی بارش میں اسی اسٹائل سے چھت پر پڑے رہنے کو ترجیح دیتے تا آنکہ بارش کھل کر واچھڑ نہ بن جاتی۔ برسات کی اکثر راتیں اسی بھاگ دوڑ میں گزر جاتیں اور جب نیند آنے لگتی تب تک رات ختم ہو چکی ہوتی۔

جب موسم پلٹا کھاتا تو سونے کے مقامات بھی اسی حساب سے بدلنے لگتے۔ سرما رت چھاتے ہی لمبے بانسوں پر کپڑا لپیٹ کر کمروں کے جالے اتارے جاتے۔ موبائل باورچی خانہ جو آٹے کے جستی تھال، چھری، پیالیاں، دیگچی، مگے، چینی، پتی، گھی کے ڈبوں، چولہے اور توے پر مشتمل ہوتا صحن کے کسی سرد کونے سے اٹھ کر برآمدے میں منتقل ہو جایا کرتا اور برآمدے کو آگے سے کانہوں کی چکیں تان کر بند کر دیا جاتا تھا۔ سردیوں میں صبح سویرے پراٹھے بنائے جاتے۔ وَلاں والا پراٹھا بنانا اپنی طرز کا ایک آرٹ سمجھا جاتا تھا۔ جب گُندھے آٹے کو ہتھیلی پر رکھ کر اور اسے آرٹسٹک ہاتھوں سے کئی بل دے کر تھپکا جاتا تو خوشبودار خستہ پراٹھا تخلیق میں آ جاتا تھا۔

اَسّی، نوے کی دھائی جس میں ہماری نسل شعور کی سیڑھی پر قدم رکھے پروان چڑھ رہی تھی، اس وقت کی زندگی فریج، رنگین ٹی وی، ٹیلیفون، اے سی، الیکٹرک موٹر اور واشنگ مشین سے بے نیاز یکدم سادہ اور پرسکون سی تھی۔ اگر اس دور کا موازنہ موجودہ دور سے کیا جائے تو وہ ایک شاہکار الف لیلوی سا دور لگتا ہے۔ ٹین میں پانی گرم کر کے اس میں کھار ڈالی جاتی اور اس میں کپڑے بھگو کر انہیں لکڑی کے سوٹے سے خوب کوٹا جاتا۔ آخر میں کپڑوں پر نیل لگایا جاتا، جس سے کپڑے لش پش کر اٹھتے تھے۔ اسی دوران گھر کے کسی چھوٹے بچے سے ''پوُکھو'' دلوایا جاتا، کسی کا پوکھو بھاری ہوتا تو کہا جاتا: توں پوُکھو نہ ڈے، تیڈا پوکھو بھارا ہے، کپڑے جلدی نیں دھوویندے''۔ اسی زمانے میں جب مارکیٹ میں سبز رنگ کا صابن متعارف ہوا تو کھار کا استعمال بند ہو گیا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے پوری دنیا میں ترقی کا ایک دور چل پڑا۔ نیشنل جاپان کی استری آتے ہی کوئلوں کی بھاری بھرکم استری دہکا کر کپڑے پریس کرنے سے جان چھوٹی۔ واشنگ مشین

آئی،لکڑی کا سوٹہ گیا۔سرف آیا صابن کا استعمال کم ہوا،کھار تاریخ کا حصہ بنی۔رنگین ٹی وی،اے سی،پریشر ککر،فریج،ہیٹر،کولر،واشنگ مشین اور ڈرائیر نے معاشرے کو بدل کر رکھ دیا۔مٹی کے چولہے میں جلتی لکڑیوں کے درمیان میں سے سرمئی دبیز دھواں نکالنے والی گیلی لکڑی بھی قصہ پارینہ بنی اور پھک کی آواز سے نیلے اور فیروزی شعلوں میں لپٹی گیس نارنجی رنگت شعلہ اگلتی لکڑیوں پر چھا سی گئی۔

ہماری نسل میں سے کوئی یہ جانتا بھی نہ تھا کہ یہ دور امن،سکون اور چین کی آخری ہچکی ثابت ہوگا یہ وہی زمانہ تھا کہ جب پورا ملک مارشل لاء کے تلخ تجربات سے گزر رہا تھا۔قوم کو شکست اور بدنامی کے گڑھے سے نکال کر ایک نیا نکور پاکستان دینے والا عوامی لیڈر سامراجی طاقتوں کے ہاتھوں تختہ دار پر لٹکایا جا چکا تھا۔معاشرے کی جڑوں کو آہستہ آہستہ دیمک لگنا شروع ہو چکی تھی۔راکھ کے اندر دبی چنگاری سلگنے لگی تھی لیکن دھڑا دھڑ امریکی امداد کی وجہ سے تباہی کے آثار کچھ عرصے کے لیے نظروں سے اوجھل ہو چلے تھے۔یہ ضیاء کا دور تھا،جو اپنے آپ کو مرد مومن اور قوم کا نجات دہندہ گردانتا تھا۔ضیاء کیا تھا؟۔ظلم،طلسم، کالی آندھی،جبر وظلمت کے درمیان کی کوئی چیز یا پھر نجات دہندہ؟۔اُس وقت تک اصل صورتحال واضح نہ تھی،کیونکہ روس افغانستان جنگ کی گرد میں کچھ دکھائی نہ دیتا تھا لوگ یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ یہ ایک شخص نہ جانے ملک کو کتنے بڑے بحرانوں میں ڈال کر چلا جائے گا۔اس وقت لوگوں کو اتنا شعور بھی نہ تھا کہ امریکہ اور یہودی طاقتوں سے ڈالر لے کر ہمارے حکمران اپنی معصوم عوام کو سپر طاقتوں کی جس بھٹی میں جھونک رہے ہیں،آگے جا کر اس کا کیا نتیجہ برآمد ہوگا؟۔دوسری طرف ایران اور سعودیہ کی ایماء اور فنڈنگ سے ایک پرامن معاشرے میں فرقہ وارانہ منافرت کے بیج بونے والے شاید یہ جانتے بھی نہ تھے کہ ان کے اعمال کی فصل نہ جانے کونسی نسل آ کر کاٹے گی؟۔ضیاء ایک ایسا آمر تھا کہ جس کے آگے آئین اور قانون نام کی کوئی چیز نہ تھی بلکہ اس کا آئین بندوق اور قانون سنسناتا کوڑا تھا اور اس کے خیال میں ہر پاکستانی گنہگار اور بدکار تھا اسی لیے کوڑوں کی سزا کا مستحق تھا۔سرعام سوشلسٹوں،سیکولرز اور شخصی آزادی کے متوالوں کو ننگا کر کے اور انہیں لکڑی کے کھانچوں سے باندھ کر ننگی پیٹھوں پر چابک مارنے والے،اپنی ہی عوام کی پشت کو چابک سے داغنے والے جابر سلطان پر کچھ ایسی آہیں اور سسکیاں پڑیں کہ وہ بلندیوں پر

اپنے یاروں سمیت تاریخ کی کالک بن کر رہ گیا۔ ضیاء گیارہ سال تک خودساختہ اسلامی نظام کے نعرے میں ظلم و بربریت کی داستانیں رقم کر کے چلا گیا اور پھر اس کے بعد ایجنسیوں کی لولی لنگڑی بیکارسی جمہوریت نواز شریف، بےنظیر کی شکل میں سامنے آتی رہی۔ ایک طے شدہ وقفے کے بعد کارگل کا بھگوڑا کمانڈو گود میں کتے کے پلے اٹھائے سامنے آیا۔ اس بدبخت شخص نے کچھ ایسی سہولت سے اپنے لوگوں کو بیچا کہ کوئی گاجر مولی بھی ایسے نہ بیچتا ہوگا۔ اپنی طرز کی خبیث ترین اور مضبوط آمریت کی عفریت سے لڑنے کے باوجود بھی کچھ نہیں بدلا۔ ایک طرف آٹا، چینی اور پٹرول کے کشکول تھامے بھوکی ننگی عوام ہیں تو دوسری طرف امپورٹڈ سوٹوں میں ملبوس یو ایس ایڈ کے لیے امریکا کی دوڑیں لگاتے حکمران ہیں۔ بھاٹیہ بازار کی بےہنگم، سست روٹریفک میں گندگی کے ٹرالے کے آگے پھنسا میں سوچ رہا تھا کہ آخر یہ لوگ کیوں آتے ہیں اور انہیں کون آگے لاتا ہے؟۔ ٹرالے نے ٹریفک سمیت میری سوچ میں بھی ڈیڈلاک پیدا کر رکھا تھا۔ سورج کی ہلکی سی حدت اور حبس بھرے ہجوم میں گند سے لبریز اوورلوڈڈ ٹرالہ بڑے ٹیکنیکل انداز سے گزر تو گیا لیکن اپنے پیچھے گرنے والا گند اور اٹھنے والی تعفن آمیز باس چھوڑ گیا۔ آٹو رکشہ کے سائلنسروں سے اردگرد اڑتی دھول مٹی، کہیں کہیں جمی مٹی پر پانی کا چھڑکاؤ کر کے دھول کو وقتی طور پر دبا دیا گیا تھا۔ سڑک اور اس سے ملحقہ گلیاں جگہ جگہ سے ٹوٹی پڑی تھیں، گیس پائپ ڈالنے کے لیے کھودے گئے کھڈوں کو میونسپلٹی والے بھرنا بھول گئے تھے۔ دورویہ تنگ سڑک کے دونوں جانب سواریوں کو آگے پیچھے بٹھائے ایک دوسرے سے گتھم گتھا زُوں زُوں کرتے چنگ چی رکشے۔ جوتوں، ملبوسات، کاسمیٹکس اور کپڑوں کی ان گنت دکانیں اور دکانوں کے آگے ریڑھیوں پر مختلف اسٹال سجائے چپل، ہوزری اور پلاسٹک کے برتن بیچنے والے جن پر خواتین مکھیوں کی طرح رک رک جاتی تھیں۔ 2011ء کا ڈیرہ شہر کسی غیر مہذب شہری کی طرح کینچوے کی رفتار سے رینگ رہا تھا۔ یادوں کا ایک میلہ میرے ہمراہ تھا۔ میرے آگے پیچھے دائیں بائیں زندگی کا ہجوم تھا اور میں اس کے حصار میں قید۔ زمانہ طالبعلمی میں جب میں اپنے دوست زاہد جمال کے ہمراہ سائیکل کے بستر بند پر کتابیں رکھے چونگلہ کراس کرتے ہوئے اسی بھاٹیہ بازار سے گزر کر کالج جاتا تو ریل پیل بہت کم دیکھنے کو ملتی تھی۔ سڑک اگرچہ اس وقت بھی تنگ تھی مگر مٹی دھول نہ تھی۔ علی الصبح کمیٹی

کی گاڑی چھڑ کاؤ کر جایا کرتی تھی۔ان دنوں رش صرف ٹیٹلر، پلازہ سینما کے سامنے یا پھر چونگلہ کے بالکل قریب گول مارکیٹ تک سمٹا رہتا تھا۔مگر پندرہ بیس سالوں کے اندر بہت کچھ بدل چکا تھا۔ پتہ نہیں میں کیا دیکھنے آیا تھا اور کیا دیکھ رہا تھا؟۔شاید میں دیکھنا چاہتا تھا کہ ان جاڑے کے دنوں میں شہر کے مضافاتی کھیتوں پر پھولی سرسوں کے کھیت کیسے لگتے ہیں؟۔کیا اب بھی پیلے سرسوں کو دیکھ کر مایوں بیٹھی دلہن کا گمان ہوتا ہے؟۔کیا اب بھی نور کے تڑکے گھر کے صحنوں سے گاڑھا کثیف سرمئی دھواں آسمان کی طرف اٹھ کر زندگی کا علم بلند کرتا دکھائی دیتا ہے؟۔کیا اب بھی دروازے کی چوکھٹ پر ٹاٹ کا پردہ سرکنے سے برتن دھوتی ، پتیلے مانجھتی مائیں اور بہنیں نظر آتی ہیں؟۔کیا اب بھی ہانڈی پر تازہ مٹی کا لیپ چڑھایا جاتا ہے؟۔کیا اب بھی کٹوی میں سرسوں کا ساگ پکتا ہے؟۔کیا اب بھی تندور میں پکنے والی روٹیوں کی مانوس سی تھپ تھپ، وِشلی اور بیسن والی روٹیاں پکائی جاتی ہیں؟۔کیا اب بھی بہنیں چھوٹے بھائیوں کو ڈھاک پر اٹھائے ان کے نازنخرے اٹھاتی پھرتی ہیں؟۔کیا اب بھی ناک سے بہتی لم نتھنوں میں جمائے ننگ دھڑ نگے بچے گلیوں میں گھومتے پھرتے نظر آتے ہیں؟۔کیا اب بھی حیا سے بوجھل پلکیں نیچی کیے کالی اور سفید چادروں میں لپٹے ریشمی وجود مدہم سرگوشیوں میں بلاوجہ ہنستے ہیں؟۔کیا اب بھی بچے سائیکل کے ٹائر چلا کر اس کے پیچھے بے اختیار دوڑتے ہیں؟۔کیا اب بھی شوق سے مانجھے لگائے جاتے ہیں اور ڈانگیں، سوٹیاں ہاتھ میں پکڑے آم کی گٹھلیوں کی کمندیں بنائے سرشاری سے گڈیاں لوٹی جاتی ہیں؟۔کیا گلی محلوں میں اُچی جکی جھا، پٹھو گرم، کوکلے چھپک، گلی ڈنڈا، لٹو نیاں اور کانچ کی گولیوں کے کھیل اب بھی کھیلے جاتے ہیں؟۔کیا اب بھی نوجوان پھٹوں پر بیٹھ کر لڈو اور قطار گوٹی کھیلتے ہیں؟۔کیا اب بھی روتے ہوئے بچے کو دلاسہ دیتے ہوئے کوئی کہتا ہے:''اُنتے ڈیکھ تاں سہی، پپلی شودی دا اٹّا وِیٹا گے''۔پتا نہیں میں کیا دیکھنا چاہتا تھا۔مگر اب بہت کچھ بدل گیا تھا۔جابجا بکھری ہریالیوں کو نئی آبادیوں نے نگل لیا تھا۔بچے ٹی وی اور کیبل کے عوض اپنا معصومیت بھرا بچپن کب کا بھول چکے تھے۔پہاڑی مٹی سے سر دھونے اور چہروں کی شادابی کے لیے منہ پر مٹی کا لیپ کب کا متروک ہو چکا تھا، اب حسن کو نکھارنے کے نئے لوازمات آ گئے تھے۔بوتھوں پر بلیچ کریم اور منوں کے حساب سے میک اپ کیے، فیئر اینڈ لولی تھوپے مصر کے آثارِ قدیمہ سے نکلتی ممیاں۔۔یہ

دور ڈیٹول سوپ، سیف گارڈ سے منہ دھونے اور بریڈ سے ناشتہ کرنے والی نسل کا دور ہے۔وقت بڑا سنگدل ہے،سب کچھ بدل کر رکھ دیتا ہے۔

وقت واقعی بالکل بدل چکا تھا،شہر چھوٹا ہونے کے باوجود اپنے فراخ سینے میں ہر طرف سے آنے والوں کو سمیٹتا رہا تھا۔اردگرد چلنے والوں کے چہرے میرے لیے نامانوس اور میں ان کے لیے اجنبی،وہ مجھے اور میں انہیں نہیں پہچانتا۔بچپن کے سنگی ساتھی،جان پہچان،میل ملاپ والے سب منتشر ہو گئے تھے۔کچھ دور،بہت دور چلے گئے تھے،کچھ سمندر پار اتر گئے تھے،جو باقی رہ گئے تھے وہ بھی بکھرے بکھرے ملے۔کسی نے سچ کہا ہے کہ جانے والا آتا جاتا رہے تو جان پہچان،شناخت بنی رہتی ہے۔

سچ ہے نقل مکانی اور ہجرت کبھی ایک سی نہیں ہوا کرتی۔جلاوطن لوگوں کا ہمیشہ ایک ہی المیہ رہا ہے کہ لمبا سفر اجنبی دیسوں میں اس آس پر گزار دیتے ہیں کہ کبھی تو وطن لوٹیں گے مگر جب وہ واپس پلٹتے ہیں تو اپنے ہی شہر میں اجنبی ہو جایا کرتے ہیں اور ایک سیاح کی طرح ہر چیز اوپر اوپر سے دیکھ کر اپنا دل وہیں چھوڑے کسی زندہ لاش کی طرح واپس لوٹ جاتے ہیں۔

زمانہ ازل سے انسان خوب سے خوب تر،بہتر سے بہترین کی تلاش میں سرگرداں ہے۔یہ انسانی فطرت ہے کہ جہاں امن ملے،قدر ملے،علم و ہنر کو بہتر طریقے سے آزمانے کا موقع ملے اور سب سے بڑھ کر جان و مال،عزت و آبرو کی ضمانت ملے تو انسان وہیں کا ہو جایا کرتا ہے۔یہی انسانی فطرت اور مجبوری ہے،میں بھی ایک ایسا ہی مجبور انسان ہوں۔

....

آپڑا آپ اُسار ہندِ یرا

یہ بھیگے پنکھوں والے راج ہنس جیسا اجلا شفاف دن تھا۔آدھی رات تک ہلکی پھلکی بوندا باندی کا جھمکا لگا رہا تھا مگر صبح کے قریب آسمان سے بادل کا آخری ٹکڑا تک غائب ہو چکا تھا اور نتھرا نتھرا آسمان کسی تازہ دھلے فرش کی مانند وسعتوں تک پھیلا دکھائی دے رہا تھا۔سعید اختر، طاہر شیرازی، ارشد اور عجب خان کے ہمراہ ہم سب حفیظ اللہ گیلانی کی دعوت پر اُن کے ترتیب دیئے گئے پروگرام کے مطابق ڈیرہ کے جنوب سے چالیس کلومیٹر کی مسافت پر موضع ماہڑہ کے تاریخی مقام (ہندِ یرے کے مقابر) دیکھنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے تھے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ اپنی پہلی ملاقات میں ارشاد حسین کو کہا تھا کہ میرے پاس وقت بہت کم ہے اور میں بہت کچھ دیکھنا چاہتا تھا۔وسیب کی کوئی تاریخی عمارت، کوئی ہستی یا کوئی دانش گاہ وغیرہ۔یہ شاید اسی خواہش کا نتیجہ تھا کہ ڈیرہ کے نامور مؤرخ حفیظ اللہ گیلانی صاحب نے ہم سب کو ہندیرے دکھانے کی دعوت دے ڈالی تھی۔شمالی سرکلر روڈ سے ٹانک اڈہ اور مریالی ٹاور کراس کرتے ہوئے ہم جیسے ہی مریالی موڑ پر پہنچے تو گیلانی صاحب، ارشاد حسین، جمیل گیلانی اور محمد یونس کے ہمراہ ہم سب کے منتظر تھے۔سب سے فرداً فرداً تعارف کے بعد دونوں گاڑیاں ایک دوسرے کے پیچھے چل پڑیں۔ ہمارے راستے میں قریشی موڑ، حاجی مورہ، ملانہ اور چشمہ شوگر ملز کے مقامات آئے۔قریشی موڑ تک آتے ہی سعید اور عجب خان کے موبائیل فون پر ہفتوں کے رکے میسجز کی بھرمار ہونا شروع ہوگئی۔شوگر ملز کے احاطے میں گنے کے ٹرالے دکھائی دیئے جبکہ گنے کی بھری کچھ ٹرالیاں سڑک کنارے کھڑی تھیں۔ یہ سارا گنا سرائیکی وسیب کا تھا ڈیرہ میں اس وقت چار پانچ شوگر ملیں بیک وقت کام کر رہی ہیں۔جب ہماری گاڑی گومل یونیورسٹی کے سامنے سے گزری تو اس کی نئی چاردیواری پر نظر پڑی۔اس چاردیواری کے متعلق کہا جاتا ہے

کہ جب موجودہ ایم این اے نے یونیورسٹی میں عرصہ دراز سے جاری کرپشن میں ملوث افراد کے بارے میں سدھ بدھ لینے کی کوشش کی تو اُن کا منہ بند رکھنے کی خاطر انہیں ساڑھے بارہ کروڑ کا ٹھیکہ دے دیا گیا۔ کروڑوں روپوں کی مالیت کا یہ ٹھیکہ دراصل اسی چار دیواری کی تعمیر تھی جس کے سامنے سے ہم گزر رہے تھے ۔تقریباً چودہ سال کے طویل وقفے کے بعد گومل یونیورسٹی جیسی مقدس علمی درسگاہ کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ ہمارے مسائل کا بیسک حل گراس روٹ لیول تک ایجوکیشن پھیلانے میں ہے۔ یہ وہ نعمت ہے جو ہمیں نہ صرف ایجوکیٹ کرتی ہے بلکہ بہت کچھ سکھاتی، دکھاتی اور سمجھاتی ہے۔ یہ ہمیں 180 ڈگری کا اینگل دکھاتی ہے اور بتاتی ہے کہ باقی دنیا میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ یہ ہمیں اویئر کرتی ہے کہ جب تلک ایک عام آدمی تعلیم یافتہ نہیں ہوگا، تب تک نہ ہی سیاسی شعور آئے گا اور نہ ہی ہم گنڈھ کپ اور دُنی ترو ڑ قسم کے لوگوں کے ملغوبے میں سے باکمال اور باعمل قیادت کو چھان کر باہر لا سکیں گے۔ بدقسمتی سے قیام پاکستان سے لے کر آج تک یہاں کوئی لیڈر پیدا ہونے ہی نہیں دیا گیا۔ سب سے بڑی وجہ عوام میں تعلیم و شعور کی کمی ہے، جس کے باعث اس دھرتی کو کبھی اچھی لیڈرشپ نہیں مل سکی۔ یہاں پر نسل در نسل راج کرتے نا اہل لوگوں کی لاٹریاں نکلتی رہی ہیں اور ہمیشہ وہی لوگ پیدا ہوتے رہے ہیں جو بھیڑ بکریوں کے ہجوم کو کہیں جاتا دیکھ کر بھاگ کر ان کے آگے آ کھڑے ہوئے۔ بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کی درست سمت کا تعین کر کے دانشمندی، اہلیت اور قابلیت سے اُن کا رخ موڑ کر اسے راہ منزل پر ڈال دینے والا اور لیڈر شپ کے بل بوتے پر قوم کو نیا وژن دینے والا صحیح معنوں میں قائد کہلاتا ہے۔ باپ دادا کے بل بوتے پر مولوی ابن مولوی، جاگیردار ابن جاگیردار، سرمایہ دار ابن سرمایہ دار کسی ہجوم کا پیرو کار تو بن سکتا ہے لیڈر کبھی نہیں۔ ہمارے ہاں جمہوریت غلیظ ایجنسیوں کے ہاتھوں چلنے والی بدبودار گاربیج فیکٹری کی طرح ہے جہاں ہر پانچ سال بعد آنکھیں بند کیے گاربیج ری سائیکل کیا جاتا ہے۔ مولوی سے فیوڈلسٹ، فیوڈلسٹ سے سرمایہ دار اور پھر سرمایہ دار سے مولوی نام کی پراڈکٹس تیار کی جاتی ہیں۔ یہ سب کیا ہے؟۔ نرا گاربیج اور گاربیج ہمیشہ گاربیج ہی رہتا ہے اسے چاہے جتنا بھی گرم کر کے کسی بھی شکل میں کیوں نہ ڈھال لیں یہ کبھی پیوریفائیڈ ہو کر سونا نہیں بن سکتا۔ جس دن فیوڈلسٹس اور کٹر بندھی طاقتوں کے آگے کوئی مخلص بندہ آن کھڑا

ہوااس دن جمود کا بادل خود بخود چھٹ جائے گا۔لوگ پوچھتے ہیں کہ یہ سب کیسے ہوگا؟۔دنیا جس نظام کے تحت چل رہی ہے اس میں ہر عروج کو زوال ہے اور ہر ایک نے مکافات عمل کا مزہ چکھنا ہے۔ یہ سب ایک نہ ایک دن ہوکر رہے گا۔تبدیلی کا عمل ہمیشہ نیچے سے شروع ہوتا ہے۔سمندر کی سب سے بڑی موج ہمیشہ نیچے سے اوپر اٹھتی ہے اور پلک جھپکتے میں سونامی برپا کر کے سب کچھ تہس نہس کر دیا کرتی ہے۔ضرورت پہلا قدم اٹھانے کی، پہلی اینٹ رکھنے کی اور بارش کا پہلا قطرہ بننے کی ہوتی ہے،اس کے بعد موسلا دھار بارش کا کارواں خود بخود بندھتا چلا جاتا ہے اور اسی کارواں میں لیڈر بھی نکل ہی آتا ہے۔خرم بہاولپوری نے کیا خوب کہا تھا: تیڈے کیں کوئی کم نیں آونڑاں۔آپڑا آپ اُسار ہندِ یرا۔یعنی غیروں پر تکیہ کرنے سے کہیں بہتر ہے کہ اپنے اپنے تیشے سنبھالیں اور نکل کھڑے ہوں۔ہمت پکڑیں کہ لمبی ہے غم کی شام،مگر شام ہی تو ہے۔اگر وسیب کو اچھی لیڈر شپ مل گئی تو اس خطے کو ترقی یافتہ ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

اسی سوچ میں کئی لمحے خاموشی سے سرک گئے اور ہم سب لنڈہ شریف کے بس اڈے تک آ پہنچے۔ یہاں سے ہمیں معروف سرائیکی شاعر مظہر علی تابش کو ساتھ لینا تھا۔بس اڈے پر ڈاٹسنوں اور چنگ چیز کے شوروغل میں مونگ پھلی اور فروٹ کی ریڑھیوں کی قطاروں کے درمیان بچھی چارپائیوں پر مسافر بیٹھے سستا رہے تھے۔ہمیں فالو کرتی گیلانی صاحب کی گاڑی جیسے ہی لنڈہ شریف پہنچی ، وہیں سے دونوں گاڑیاں دایاں ٹرن لے کر درگاہ کی طرف موڑ دی گئیں۔پیر مظہر علی تابش نے گرم چائے اور انڈوں سے پورے گروپ کی تواضع کی۔سفید شلوار قمیص میں ملبوس مخصوص ہیئر اسٹائل کے مظہر تابش کو پہلی نظر دیکھتے ہی نائنٹین ایٹیز کے ہیرو کا گمان ہوا۔ہم سب نے لنڈہ شریف کے دربار میں حاضری دی ، تابش کو ساتھ لیا اور پھر سے چل پڑے۔مظہر تابش نے گاڑی میں بیٹھتے ہی آداب وتکلفات کا یکسر خاتمہ کرتے ہوئے طاہر شیرازی کی کتاب جاتراں پر اپنے خیالات کا برملا اظہار کرنا شروع کر دیا۔تابش کی ایک خوبی بہت اچھی لگی کہ وہ تیکھے لہجے میں لگی لپٹی رکھے بغیر ہر بات منہ پر کہہ دینے والا انسان ہے،اس کے لہجے میں دل کو موہ لینے والی مٹھاس، اپنائیت اور والہانہ پن چھلکتا ہے جبکہ دوسری طرف طاہر بھائی ہر اختلافی بات کو سن کر اسے پازیٹو لینے کے عادی۔دوستوں میں ویسے بھی فارمل رویے زہر ہوا کرتے ہیں۔جب مظہر بھرپور انداز میں اپنے

تاثرات کا اظہار کر رہا تھا تو اس کے اسٹیریو ٹائپ لہجے کی گھن گرج سے پوری گاڑی سوکھے پتے کی طرح لرز رہی تھی۔سعید اختر بڑے مزے سے سیٹ پر ٹیک لگائے مظہر کی فل والیوم گفتگو کے چسکے لے رہے تھے طاہر کسی ڈری سہمی چڑیا کی طرح دبکے بیٹھا جبکہ ارشد اور عجب خان نے زیرِ لب مسکرانے پر ہی اکتفا کیا ہوا تھا۔باتوں باتوں میں گاڑی انڈس ہائی وے پر پہنچ کر پھر سے دوڑنے لگی۔یہاں سے پروآ کوئی 12 کلومیٹر کی دوری پر تھا۔ہماری دونوں جانب دامان کا علاقہ تھا مگر نہر کی وجہ سے ہر طرف ہریالی بکھری پڑی تھی اور مظہر تابش ایک پروفیشنل گائیڈ کی طرح سب کو اردگرد گزرتے مقامات سے آگاہ کر رہا تھا۔سعید اختر نے پروآ کے دوست مجید بلوچ کو پہلے ہی سے مطلع کر دیا تھا۔جب ہم نائیویلہ ڈرین سے گزرے تو بتایا گیا کہ پچھلے سال سیلاب ساری نہر کو بہا کر لے گیا تھا۔اس کے بعد ہزارے والی ڈرین آئی۔یہاں سے پروآ تین کلومیٹر کی مسافت پر تھا۔پروآ میں حبیب بینک کے سامنے مجید بلوچ، شفقت اللہ، خالد ارشد، ملک شعیب اور پیر صاحب ہمارے منتظر تھے۔پروآ کی جانی مانی سوشل شخصیت، پروآ کے کِنگ مجید بلوچ آف پروآ کو کون نہیں جانتا؟۔وہ روزنامہ اعتدال پروآ کے نمائندہ ہونے کے علاوہ حج وعمرہ کا مقدس کام بھی سنبھالے ہوئے ہیں۔مٹھاس بھرے لہجے کے مالک مجید بلوچ سے میری دوستی عرفان مغل کے توسط سے ہوئی تھی۔ہم سب مجید کی دکان پر تھوڑی دیر سستانے کے لیے بیٹھ گئے، وہیں پر سرائیکی قومی موومنٹ کے روحِ رواں جناب حمید اصغر شاہین بھی موجود تھے۔وقت کی کمی کے باعث ان سے کھل کر بات نہ ہوسکی۔ہم سب نے مجید سے اجازت لی اور آگے چل پڑے۔

تحصیل پروآ: سرائیکی وسیب کی تحصیل پروآ کی اہمیت تاریخ میں مسلمہ ہے۔یہاں پر آباد پروآ قوم کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ سولہویں صدی عیسوی کے وسط میں مغل شہنشاہ اکبر کے عہد میں جب ہندوستان قحط سالی کا شکار ہوا تو بہت سے لوگ زرخیز خطوں اور چراگاہوں کی تلاش میں ہجرت کرنے پر مجبور ہوگئے۔ ملک احمد خان کی سربراہی میں کچھ لوگ دریائے سندھ کے مشہورِ زمانہ ببر گھاٹ کو عبور کر کے یہاں تک آ پہنچے۔اپنی سرسبزی، امن پسندی اور ہریالی کے باعث یہ خطہ اُن کی مستقل رہائش اور ان کے مویشیوں کی چراگاہوں کے لیے انتہائی موزوں تھا ملک صاحب کے ساتوں بیٹوں نے اپنے قبیلے کے ساتھ مل کر محنت

اور لگن سے اس علاقے کی زمینوں کو آباد کیا اور مقامی لوگ انہیں ''دریا پارُوں آیا'' کہنے لگے۔ بعد میں یہی لفظ ان کی شناخت بنا اور پاروں آیا سے پروں آیا بنا جو بگڑ کر آخر میں پروآ بن گیا۔

تاریخی حوالوں اور مختلف شواہد سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ پروآ کا علاقہ ملک احمد خان کی آمد سے پہلے بھی آباد چلا آرہا تھا، جس کا ثبوت اس کے مغرب میں واقع موضع بھڑکی کے مقام پر بھڑکی کا قبرستان ہے، جہاں ماضی میں ایک شہر آباد تھا جو افتادِ زمانہ یا پھر زلزلہ کے باعث زمین میں دھنس گیا تھا اور مکانات کے ملبے نے ایک ٹیلے کی شکل اختیار کر لی تھی۔ ہمارے سامنے موضع ببر کا تاریخی قصبہ تھا۔ موضع ببر انڈس ہائی وے پر پروآ سے کوئی دو کلو میٹر کے فاصلے پر شمال کی جانب واقع ہے۔ عہدِ قدیم میں اہلِ بابل یعنی سورج دیوتا کے پجاری سورج کو ببر کہا کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اہل بابل کے کچھ افراد یہاں آ کر آباد ہوئے تھے اور انہوں نے اس قصبے کی بنیاد اپنے دیوتا کے نام پر رکھی تھی۔ اسی طرح پروآ سے دس کلو میٹر جنوب کی جانب دریائے سندھ کے کنارے موضع کہیری بھی صدیوں سے آباد چلا آرہا تھا۔ قبل مسیح کے زمانہ میں راجپوت راجہ کہیری نے کہیر کوٹ کے نام سے اس گاؤں کی بنیاد رکھی تھی جو بعد میں کہیر کوٹ سے کوٹ کروڑ مشہور ہوا اور پھر اسی راجہ کے نام سے دریائے سندھ کے مشہور گھاٹ کو ''کہیری پتن'' کہا جانے لگا۔ ہندوستان کو لوٹنے والے افغانی حملہ آوروں سمیت رنجیت سنگھ نے بھی اپنی بیشتر مہمات کے دوران کہیری اور ببر گھاٹ سے دریائے سندھ کو عبور کیا تھا۔ ریاست بھٹنڈرا کے راجہ آنند پال کو شکست دینے کے بعد محمود غزنوی نے افغانستان لوٹتے وقت عین اسی مقام سے دریائے سندھ کو پار کیا تھا اور اسی مقام پر غزنوی فوجوں کا پتن کے ملاحوں سے کسی بات پر جھگڑا بھی ہوا تھا جس کی بنا پر غزنوی نے ملاحوں کی تمام کشتیاں جلانے کے بعد انہیں سخت ترین سزائیں دی تھیں اور پھر وہ درہ گومل کے راستے افغانستان واپس لوٹ گیا تھا۔

تحصیل پروآ کی ڈرین، ارد گرد کھڑی گنے کی قد آور فصلیں، بیچ میں کھڑے پراسو اور کھگل کے درخت اور سب سے بڑھ کر مظہر تابش کی شاعری کے چسکے۔

دَھن جیندی سُدھ سوچ دا ارت

دھن جیندا ایمان

کیہاں کوئی ہدایت اُوندی
کیہاں پاک قرآن
بھانویں گل وِچ گھت حمیلاں
بھانویں جوڑ مسیت
اے تئیں کوئی پاک نیں ہوندا
جے تئیں من پلیت !!!

مظہر تابش نے بہت خوبصورت کلام سنایا۔ ٹھیڑ یاں کے نام سے ان کی دلربا سرائیکی شاعری کا مجموعہ بھی چھپ کر منظر عام پر آ چکا ہے۔ موضع ماہڑہ کے قریب پہنچتے ہی گیلانی صاحب نے دونوں گاڑیوں کو رکوایا۔ یہاں پر ان کے کزن غلام شبیر شاہ نے ہم سب کے لیے کھانے کا اہتمام کیا ہوا تھا۔ وہیں سے ہم سب فریش ہوکر ہندیرے کی طرف چل پڑے۔ ہندیرے کا قبرستان میری کالکولیشن کے مطابق ماہڑہ سے کوئی دس کلومیٹر کی مسافت پر ہوگا۔ دامان کے سینے پر بنائی گئی مشہور زمانہ انڈس ہائی وے جو ڈیرہ اسماعیل خان کو ڈیرہ غازیخان سے ملاتی ہے، دراصل یہ وہی سڑک ہے جو عہد قدیم میں ایران اور افغانستان سے ہندوستان جانے والے تجارتی قافلوں کی گزرگاہ ہوا کرتی تھی۔ جسے ہندی راہ یعنی ہندوستان کی طرف جانے والا راستہ کہا جاتا تھا۔ سید حفیظ اللہ گیلانی کی تحقیق کے مطابق چونکہ لال ماہڑہ کے مقبرے اسی مشہور راستے پر تعمیر کیے گئے تھے اسی مناسبت سے انہیں ہندیرا یا ہندیرے کہا جاتا ہے۔ ہندیرے تک جانے والا راستہ کچا، انتہائی دشوار گزار اور دھول مٹی سے اٹا پڑا تھا۔ اتنی بڑی تاریخی نوعیت کی عمارت کے لیے راستے میں کوئی بورڈ یا کوئی نشان دکھائی نہ دیا۔ ارشد زگ زیگ راستوں پر بڑے پروفیشنل انداز سے گاڑی چلا رہے تھے۔ ایک دو جگہ رک کر دیہات کے لوگوں سے پوچھتے پاچھتے کسی نہ کسی طرح ہم سب لال ماہڑہ کے قدیمی قبرستان تک پہنچ گئے۔ اسی قبرستان کے عین سامنے استقبالیے اور خیر مقدمی انداز میں پراسراریت میں لپٹے گنبد نما مقبروں نے ہم سب کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ ہم سب نے تھوڑی دوری پر گاڑیاں کھڑی کیں اور پیدل چل پڑے۔ یہ جاتی سردیوں کے دن تھے۔ دھوپ میں خاصی تپش اور چبھن محسوس ہونے

لگی تھی۔ ہندیرے پہنچ کر سب سے پہلے سایہ دار جگہ ڈھونڈی گئی اور پھر وہیں پڑی چارپائی کے اوپر بیٹھ کر گیلانی صاحب نے سب کو ڈھوڈے، وِشلیاں اور سرسوں کا ساگ کھلایا۔ اسی جگہ پر دیوار کے ساتھ آثار قدیمہ کا ایک بورڈ لگا ہوا تھا۔ بورڈ پر لفظ ادھیرے لکھا ہوا تھا حالانکہ اصل لفظ ہندیرے ہے جو سرائیکی کے لفظ ''ہندیر'' سے نکلا ہے جبکہ ادھیرا پشتو زبان کا لفظ ہے۔ بغیر چھتوں والے ویران مقبروں میں بنی قبروں کے درمیان بدروحوں کی مانند بھٹکتے ہوئے ہر کوئی اپنے اپنے کیمرے سنبھالے جگہ جگہ رک کر فوٹو گرافی کے ذریعے اس سفر کو یادگار بنانے کی تگ ودو میں مصروف تھا۔ کیمرا ہاتھ میں پکڑے سرائیکی وسیب کا نامور مصور عجب خان کبھی ہندیرے پر لگی اینٹوں سے باتیں کرنے لگتا، کبھی مناظر میں کھو جاتا، کبھی حال میں لوٹ آتا، کبھی دوستوں کے جھرمٹ میں قہقہے لگانے لگتا تو کبھی سب کو مسکراتا دیکھ کر صرف مسکرا کے رہ جاتا۔ عجب خان سے میں نے کہا کہ اللہ پاک نے آپ کو بے پناہ شہرت اور اتنا بڑا مقام دیا ہے۔ کیا آپ کے دل میں کوئی ایسی خواہش، ایسی آرزو ہے جو ابھی تک پوری نہ ہوئی ہو۔ عجب خان بولے ہاں بالکل ہے، میں ابھی بھی اپنے آپ کو ادھورا سمجھتا ہوں۔ میرا رول ماڈل ہمیشہ سے کلاچی کے انسان دوست ڈرائنگ ماسٹر مالک رام داس جی رہے ہیں۔ وہ نہ صرف انتہائی اعلیٰ درجے کے آرٹسٹ تھے بلکہ ساتھ ہی انہوں نے یتیموں، مسکینوں اور اپاہج بچوں کے لیے اپنے بل بوتے پر فلاحی ادارہ قائم کر رکھا تھا۔ روشنی مقبرے کے خالی گنبد سے ٹکرا کر اندر آ رہی تھی۔ سورج کی نرم شعاعیں عجب خان کے چہرے کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ عجب خان کی سوچ اس کی شخصیت کی طرح باوقار تھی۔ واقعی جب روشنی بھیتر (اندر) میں ہو تو اس کا عکس چہرے پر نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ ایک مقبرے کے سامنے کھڑے ہو کر سعید اختر نے ہم سب کے علم میں اضافہ کرتے ہوئے بتایا کہ ہِندِیر سرائیکی میں باقی رہ جانے والی، بچ جانے والی یا بچی کھچی چیز کو کہا جاتا ہے۔ ارشاد صاحب اور تابش سمیت حفیظ اللہ گیلانی نے بھی نہ صرف اِس کی تائید کی بلکہ اس موقع پر انہوں نے خرم بہاولپوری کا ایک خوبصورت شعر سنایا۔ تیڈے کیں کوئی کم نیں آونڑاں۔ آپڑا آپ اُسار ہندِیرا۔

اصل لفظ ہندیرا ہے: بدقسمتی سے سرائیکی وسیب کے شہر ڈیرہ اسماعیل خان کی گومل یونیورسٹی میں آرکیالوجی ڈیپارٹمنٹ نہیں بننے دیا گیا اسی لیے دامان پر ریسرچ کا سارا کام تخت پشور سے آنیوالے آرکیالوجسٹس کو

سونپ دیا جاتا رہا ہے۔اسی سوچ کے زیر اثر لال ماہڑہ کے تاریخی مقبروں پر آثار قدیمہ کی طرف سے آویزاں بوڑد پر پشتو کا لفظ ادھیرا لکھ دیا گیا ہے، جو سرئیکی خطے کی تاریخ کے ساتھ کھلواڑ کے مترادف ہے ۔ہندیرا کی بجائے ادھیرا لکھنے پر وسیب کے ریسرچرز اور دانشوروں کو مل بیٹھ کر اس پر بحث و مباحثہ اور مکالمہ کرنا چاہیے۔میرے خیال میں ہندیرے کے اصل لفظ پر مکالمہ، بحث و مباحثہ اور ڈسکشن ایک برین اسٹارمنگ قسم کی پروڈکٹیوا یکٹیوٹی ہوگی اور اسے تنقید برائے تنقید کی بجائے تنقید برائے اصلاح کے معنوں میں دیکھنا ہوگا۔حفیظ گیلانی جیسے محقق اور سعید اختر سیال جیسے دانشوروں کے پاس ہندیرے نام کے واضح ثبوت،ٹھوس شواہد اور اس کے پیچھے مضبوط لاجک موجود ہے۔

ہندِیرے: برصغیر پاک و ہند کے اولین ہشت پہلو مقبرے (ہندِ یرے) اپنے مخصوص فن تعمیر اور تاریخی محل وقوع کے باعث انتہائی اہمیت کے حامل ہیں۔آثار سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں پر کل گیارہ مقبرے تھے جن میں صرف چار باقی بچے ہیں۔ہر مقبرے (ہندیرے) کے اندر کئی قبریں بنی ہوئی ہیں،جیسا کہ مقبرہ نمبر 1 میں بارہ،نمبر 2 میں پانچ،نمبر 3 میں آٹھ اور نمبر 4 میں دس قبریں ہیں۔ان مقبروں کے باہر قبرستان میں بھی کئی ایک قبریں ابھی تک سلامت ہیں،جبکہ اکثر کاشی گری کی ترجمان اینٹوں کا ڈھیرہ کسی پوٹلی کی طرح ایک طرف سمٹا نظر آتا ہے۔ہندیرے کے قبرستان میں سارے مقبرے پختہ اینٹوں سے بنائے گئے ہیں،جن کی شفاف سطح پر سبز اور نیلا روغن ابھی تک اپنی آب و تاب دکھا رہا ہے۔نہایت آرٹسٹک انداز میں کسی ماہر کوزہ گر کے ہاتھوں غضب میں ڈھالے ان مقبروں میں ریت،سیمنٹ،چونے یا کسی بھی قسم کے مصالحے کا شائبہ تک نظر نہیں آتا،اس کے باوجود بھی یہ صدیوں سے ایستادہ ہیں۔اپنے انوکھے طرز تعمیر کی بنیاد پر ان مقبروں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔پہلی قسم گول کناروں والے مقبروں کی ہے،جن پر برجیاں لگی ہوئی ہیں،جبکہ دوسری قسم نوکدار کونے والے مقبروں پر مشتمل ہے۔کچھ مقابر کو دو اور کچھ کو تین مراحل میں تعمیر کیا گیا۔دو مرحلوں والے مقبروں کے پہلے مرحلے میں چیمبر یعنی چوکور کمرے بنائے گئے اور پھر ان پر گنبد لگائے گئے،جبکہ تین مراحل میں پایہ تکمیل تک پہنچے والے مقبروں میں گنبد چوکور عمارت سے منسلک نہیں بلکہ پہلے عمارت کھڑی کی گئی،پھر اس پر ہشت پہلو زون تعمیر کر کے آخر میں گنبد بنایا گیا۔اس

قسم کے مقبرے کی اہم خصوصیت اس کا ہشت پہلو یعنی آٹھ طرفہ ہونا ہے، اسی انوکھی خصوصیت کے باعث ماہرین آثار قدیمہ، محققین اور دانشور دامان میں تعمیر کردہ ہندیرے کے مقبروں کو نہ صرف اس خطے بلکہ برصغیر پاک و ہند کی اوّلین ہشت پہلو عمارت کے طور پر تسلیم کرتے ہیں۔ تاریخی نوعیت کے حامل یہ مقابر درج ذیل خصوصیات کے حامل ہیں۔

1۔ زیادہ تر مقبرے چوکور شکل میں تخلیق کیے گئے، بعض ہشت پہلو بھی تھے، مگر ان کی بلندیاں مختلف رکھی گئی تھیں۔

2۔ ہر مقبرے کے مشرق میں صدر دروازہ رکھا گیا جبکہ شمالاً جنوباً چھوٹے چھوٹے دروازے رکھے گئے تھے۔

3۔ مقبروں کے اندر مغربی جانب محراب بنایا گیا، جس کا جھکاؤ قبلے کی جانب صاف دکھائی دیتا ہے۔

4۔ مقبروں کے اندر لگی بعض اینٹوں پر کچھ ایسے نقوش بھی کندہ ہیں، جن پر کسی تحریر کا گمان ہوتا ہے۔ یہاں سے قرآنی آیات والی ایک اینٹ بھی برآمد ہوئی تھی جسے پشاور میوزیم میں محفوظ کر دیا گیا ہے۔

5۔ اپنے مرکز کے گرد جھکی، پکی اینٹوں کے بنے ان مقبروں میں کئی قسم کی ٹائلیں لگائی گئی ہیں۔ ایک سادہ جبکہ دوسری میں نقش و نگار بنائے گئے۔ کچھ مقبروں کو مستطیل شکل کی نیلی ٹائلوں سے بھی سجایا گیا ہے۔ ٹائلوں کی سجاوٹ زیادہ تر جیومیٹرک انداز میں کی گئی ہے، جن پر پھول پتیوں اور موتیوں کے نمونے، دلکش افقی، عمودی اور متوازی لکیریں کندہ نظر آتی ہیں۔

دامان کی چمکتی ریت اور خشک بیابان و ویرانوں میں سر اٹھائے کھڑے ان مقبروں کے اندر کون سے اجسام خاکی مدفون ہیں، اس بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ایک نظریے کے مطابق سب سے بڑا مقبرہ لال جگاتر کا ہے جبکہ باقی کے مقبرے اس کی ازواج اور اولادوں کے ہیں۔ تاریخ سے جو شواہد ملتے ہیں ان کے مطابق دسویں صدی عیسوی میں دامان کا سارا علاقہ ہندو شاہی سلطنت کے زیر اثر تہذیبی اور ثقافتی بلندیوں کے عروج پر تھا۔ 980ء کے قریب سبکتگین نے ہندوستان کی شمال مغربی سرحدوں کے بعض اہم فوجی مقامات فتح کر کے ہندوستان میں آنے والوں کا راستہ ہموار کیا تھا اور پھر اسی

راستے سے محمود غزنوی نے ۴۰۱ھ بمطابق 1010ء میں ملتان پر حملہ کر کے لاہور سمیت ان سب علاقوں کو غزنی سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔ غزنوی نے جب ہندوشاہی خاندان کا خاتمہ کر کے اس پورے خطے پر غلبہ حاصل کیا تو قلعہ بلوٹ کی مسماری کے بعد یہاں کی ساری آبادی نقل مکانی کر گئی تھی۔ اگرچہ اس وقت کی تاریخ میں ہندیرے کے مقبروں کا تذکرہ نہیں ملتا، لیکن یہی وہ دور تھا جب ان علاقوں میں مذہبی اور فقہی امور میں وسط ایشیاء سے روابط کا آغاز ہوا تھا۔ جب غوریوں نے ہندوستان پر اپنا تسلط قائم کر لیا تو سرائیکی وسیب کی اہمیت میں اور اضافہ ہو گیا تھا، خصوصاً اسلامی ممالک سے جو علمی قافلے ہندوستان میں داخل ہوتے ان کی پہلی منزل ملتان ہوا کرتا تھا۔ ہندیرے کے مقبروں کے بارے میں ایک قیاس یہ بھی کیا جاتا ہے کہ یہ علاؤالدین خلجی عہد میں تعمیر کئے گئے تھے، جہاں ایک اندازے کے مطابق خلجی فوج کے سپاہی مدفون ہیں۔ علاؤ الدین خلجی کے زمانے میں 1296ء سے 1308ء کے درمیان تاتاریوں نے ہندوستان پر سلسلہ وار حملے جاری رکھے تھے۔ تاتاری حملہ آوروں کی شدت سے بچنے کے لیے علاؤالدین خلجی کو کئی احتیاطی تدابیر کرنا پڑیں۔ چنانچہ دفاع کو ممکن حد تک مضبوط بنانے کے لیے پنجاب اور سرائیکی وسیب کے بیشتر قلعوں کی مرمت کی گئی، لیکن اس کے باوجود منگولوں نے 1307ء میں ہندوستان پر دھاوا بول دیا۔ خلجی فوج نے دریائے سندھ کے کنارے ان حملوں کو روکا۔ ہندیرے کے مقام پر دونوں اطراف سے زبردست لڑائی ہوئی جس کے نتیجے میں منگولوں کے سربراہ اقبال مند کو گرفتار کر کے دہلی لے جایا گیا جبکہ مرنے والے خلجی سپاہیوں کو یہیں پر دفن کر دیا گیا۔ عام سپاہیوں کی قبریں بنائی گئیں جبکہ سپہ سالاروں کی قبروں پر گنبد نما مقبرے تعمیر کیے گئے، جنہیں ہندیرے کہا جاتا ہے۔ ایک اور قیاس آرائی یہ بھی ہے کہ یہ جنگ غیاث الدین بلبن کے عہد میں لڑی گئی تھی۔ بلبن نے ہی ان علاقوں میں تاتاریوں کا مقابلہ کرنے کی خاطر قلعے تعمیر کروائے تھے۔ بہرحال قیاس آرائی جو کوئی بھی ہو یہ ایک حقیقت ہے کہ سارے مقبرے شمالاً جنوباً تعمیر کیے گئے ہیں، جن سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہاں پر مسلمان مدفون ہیں۔

لال ماہڑہ کے مقبروں کا باریک بینی سے جائزہ لینے کے بعد تاریخ دان اس سے مشابہہ ایک دوسرے مقبرے کی بھی نشاندہی کرتے ہیں، یہ مقبرہ ترکمانستان سے 25 کلومیٹر کے فاصلے پر علمبردار

المنتصر کا ہے۔ایک اندازے کے مطابق گیارہویں صدی کا تعمیر کردہ ترکمانی مقبرہ ہندیروں سے کافی حد تک مشابہت رکھتا ہے۔دامان میں گیارہویں صدی کے وسط اور بارہویں صدی کے آغاز میں بنائے گئے ہندیروں جیسے مقبرے وسط ایشیاء، ایران اور افغانستان میں بھی دکھائی دیتے ہیں۔

ہشت پہلو مقبروں کی تاریخ کے بارے میں اب تک کئی قسم کی آراء سامنے آ چکی ہیں۔مشہور زمانہ محقق مارشل، پرسی براؤن، وہیلر اور دوسرے اسکالرز کے خیال میں ملتان میں واقع شیخ بہاؤالدین زکریاؒ کا مقبرہ وہ پہلا مقبرہ تھا کہ جہاں سے تین منزلہ مقبروں کی ابتدا ہوئی اور پھر اسی طرز تعمیر کو مدنظر رکھتے ہوئے شاہ رکن عالمؒ کا مقبرہ تعمیر کیا گیا، جبکہ کچھ تاریخ دان 1231ء میں دہلی میں نصیرالدین محمود کے مقبرے کو جنوبی ایشاء کا سب سے پہلا ہشت پہلو، سہ منزلہ مقبرہ شمار کرتے ہیں، لیکن تاریخی حقائق سے ثابت ہوتا ہے کہ جنوبی ایشیاء میں ہشت پہلو، سہ منزلہ مقبروں کا اچھوتا تصور ڈیرہ اسماعیل خان میں لال ماہڑہ شریف کے ہندیروں سے لیا گیا تھا، جو گیارہویں صدی کے وسط اور بارہویں صدی کے اوائل میں تعمیر کیے گئے تھے۔اس سے پہلے پورے برصغیر میں کسی ہشت پہلو عمارت کا وجود نہ تھا۔چونکہ ڈیرہ جات جنوبی افغانستان، ایران، وسط ایشیاء اور وادی سندھ سے جڑا ہوا تھا اسی لیے ایک معروف تجارتی راستہ ہونے کے علاوہ اسی راستے کو ہندوستان پر حملوں کے لیے بھی استعمال کیا جاتا تھا۔محمود غزنوی ملتان کی مہم کے علاوہ کئی باران راستوں کو استعمال کر کے ہندوستان پر حملہ آور ہوا تھا۔المختصر ماہرین آثار قدیمہ، تاریخ دان اور اسکالرز اس بات پر متفق ہیں کہ ورسٹائل ہشت پہلو مقابر کی انوکھی اختراع کا تصور وسط ایشیاء سے دامان پہنچا اور اس وقت کی اس جدید طرز تعمیر کو تصور میں رکھ کر دامان کے لال ماہڑہ میں ہندیرے کی شکل میں پہلا تجربہ کیا گیا۔یہیں سے وسیب کی تہذیبی جہتوں کو نئے زاویے ملے اور پھر یہ فن سبی، خاران، اوچ اور ملتان جا پہنچا۔ملتان چونکہ دبستان علم وعرفان اور صوفیاء کرام کی تبلیغی سرگرمیوں کے باعث مدینۃ الاولیاء کا درجہ حاصل کر چکا تھا، اسی لیے وہاں کی مخصوص کاشی کاری، مینا کاری اور آرائش وزیبائش کے ملاپ سے یہ فن مزید نکھرا اور پھر دامان کے ہندیروں کو ذہن میں رکھ کر حضرت بہاؤالدینؒ زکریا ملتانی کا پہلا ہشت پہلو مقبرہ تعمیر کیا گیا۔

بلاشبہ سرائیکی وسیب کی عظمت اس کی ہزار ہا سالہ تاریخ سے وابستہ ہے۔تاریخی مقامات سے مالا مال اس دھرتی میں تھل، دامان اور چولستان کے نرم و ملائم سینے پر تاریخ کی مالا اوڑھے کھڑے قلعہ دیراوڑ،قلعہ اسلام گڑھ،قلعہ بجنوٹ،قلعہ منکیرہ،قلعہ بل اوٹ،قلعہ تل اوٹ،اوچ شریف، رحمان ڈھیری اور ہندیرے کے مقابر کہ جن کی خستہ حالی دیکھ کر احساس زیاں کے ہاتھوں ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے۔ان سارے مقامات پر زمان ومکان کی صدیاں گزر چکیں۔شکست وریخت کے تسلسل اور ہماری بے توجہی سے نہ ان کی چھتیں سلامت رہیں، نہ دیواریں۔عظمت رفتہ کی ان ساری نشانیوں میں سے بہت کچھ ڈھہہ کر ملیامیٹ ہوچکیں اور کچھ مٹنے کو ہیں۔دامان کی تاریخ کے قصے سناتے بلوٹ،تلوٹ، رحمان ڈھیری اور لال ماہڑہ کے ہندیرے بھی ان بدنصیب عمارات میں سے ایک ہیں کہ جو سرائیکیوں کا سرمایہ افتخار ہیں لیکن آج ان کا کوئی پرسان حال نہیں۔آثار قدیمہ کو بھی ان سے کوئی دلچسپی نہیں۔یہاں پر کل گیارہ مقبرے تھے جس میں سے دو گول اور دو چوکور کونے والے باقی بچے ہیں۔آج بھی ان سارے مقامات کو محفوظ کر کے اور یہاں سیاحوں کے لیے ٹورسٹ پوائنٹس بنا کر لاکھوں کا زرمبادلہ کمایا جاسکتا ہے۔بدقسمی سے ہم میں آج اتنی طاقت بھی نہیں کہ انڈس ہائی وے پر ہندیرے کے نام کا ایک بورڈ لگوا سکیں،تاکہ کم از کم تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے طالب علموں کو یہاں تک پہنچنے میں آسانی ہو۔دامان کے چپے چپے پر آج بھی گزری تہذیبوں کے آثار وافر موجود ہیں، جو اس خطے کی عظمتوں کی دلیل ہیں۔افسوس کہ ان میں سے زیادہ تر کو غیر ملکیوں نے آکر دریافت کیا اور انگریزی میں کتابیں لکھیں۔آج بھی امریکن، برٹش اور آسٹریلین جامعات کی لائبریریاں سرائیکی وسیب کے لٹریچر اور ریسرچ سے بھری پڑی ہیں، جو اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ کسی بھی بڑی تہذیب کے مقابلے میں ہماری تہذیب بڑی زور آور تھی۔لیکن افسوس کہ ہم میں سے کوئی ایسا نہیں جو ان سب حقائق کو سامنے لائے۔

.....

محسن ڈیرہ

نواب اللہ نواز خان سدوزئی

کسی بھی شہر کی ترقی اور خوشحالی جانچنے کے لیے امن و امان، کاروبار، تعلیم اور صحت بنیادی اشاریے ہوتے ہیں۔ آسودگی، خوشحالی اور ترقی انسانی زندگی سے منسلک ٹرینالوجی کا نام ہے جو قوموں کی آنکھوں میں چمکتی ہے اور اُن کے چہروں سے چھلکتی ہے۔ افسوس کہ ماضی کا پرامن شہر ڈیرہ اب وہ ڈیرہ نہیں رہا۔ یہ شہر اب تعصب و فرقہ واریت کے شعلوں میں گھر چکا۔ اس کی صبحیں المناک اور راتیں قہرناک ہو چکیں۔ اس کے نہتے شہری شمشیر بردار لشکریوں کے نرغے سے نکلنے کی تگ و دو میں زندگی کی بازی ہار چکے۔ آج جب ہر طرف آہ و بکا، بین اور شور و شین کی آوازیں ابھر رہی ہیں تو ایسے میں کیوں نہ یاد آئیں وہ ہستیاں کہ جو سرائیکی وسیب کا اصل سنگھار تھیں۔ جن کے وجود سے روشنیاں بکھرا کرتی تھیں۔ جو اس خطے کی حقیقی وارث تھیں اور جو اپنی عوام کے ساتھ سچے اور کھرے رشتوں میں بندھی ہوئی تھیں۔

کچھ لوگ دنیا میں جینے کے لیے آتے ہیں اور کچھ لوگ اِس دنیا کو جینے کے قابل بنانے کے لیے۔ ہمارا راستہ دنیا کو جینے کے قابل بنانے والوں کا راستہ ہے۔ ڈیرہ کی نرم و گداز مٹی میں پیدا ہونے والے نواب اللہ نواز خان بھی اِسی خوشبو بھرے راستے کے راہی تھے۔

جولیس سیزر نے کیا معنی خیز جملہ بولا تھا۔ ''میں آیا، میں نے دیکھا اور فتح کر لیا''۔ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے طالب علموں کے لیے یہ سحر انگیز جملہ رہتی دنیا تک سورس آف انسپائریشن رہے گا۔ ہم نے دیکھا کہ وہ نوجوان کہ جس کا خمیر سرائیکی دھرتی سے اٹھا تھا۔ جس کی باتوں میں تفکر، تدبر اور تہذیب کی خوشبو آتی تھی۔ جو جمہوریت، انسانی حقوق، آزادی اور اپنے وسیب کے لوگوں کو ایک باوقار زندگی دینے کا

متمنی تھا۔ بلاشبہ وہ آیا، اُس نے دیکھا اور اُس نے لاکھوں دلوں کو فتح کر لیا۔ ڈیرے والوں کا یہ مسیحا، ہیرو، الیگزینڈر اور جولیس سیزر کوئی اور نہیں بلکہ اللہ نواز خان سدوزئی تھے۔

ذرا سوچئے ڈیرہ اسماعیل خان کیا تھا؟۔ سرائیکی وسیب کا ایک چھوٹا سا قصبہ۔ رِگ وید کی ایک قدیم بستی۔ ایک ایسا قصبہ کہ جس کی بنیادیں راجہ بل وراجہ ٹل جیسے مہاراجوں نے رکھی تھیں۔ نہ جانے کتنے انسانی لشکر اسے تاراج کرتے ہوئے گزرے اور نہ جانے کتنوں نے اسے پھر سے آباد کیا۔ کتنی بار یہ وقت کی دھول میں اٹ کر گم ہوا اور کتنی بار پھر سے اُبھرا۔ اس شہر بے مثال کی عظمت بھری داستانوں کا چشم دید گواہ ایک طرف رِگ وید کا سندھو دھارا بنا تو دوسری طرف دامان کا ریشمی سینہ کہ جہاں آج بھی اس کا تابناک ماضی چھپا پڑا ہے۔ بے شک ملک سہراب خان بلوچ نے اسے نئے سرے سے آباد کیا مگر اس شہر کو اگر کسی نے وقار دیا، تہذیب وتمدن اور عظمتوں سے روشناس کرایا تو اس کا سہرا سدوزئی نوابین کے سر جاتا ہے۔ آج جب قدیم وجدید زمانے ڈیرہ شہر کے گلے مل رہے ہیں تو ایسے میں اگر کوئی شخص مجھ سے یہ سوال کرے کہ جدید ڈیرہ کا محسن کون شخص ہے تو میں ایک لمحہ توقف کئے بغیر جواب دُوں گا۔ نواب اللہ نواز خان سدوزئی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میرا محض اعتراف کر لینا نواب صاحب کے مجموعی فلاحی کارناموں کے عشر عشیر کا بھی احاطہ نہیں کر سکتا۔ نواب صاحب اپنے شہر کی سیاسی، تعلیمی اور ثقافتی پہچان تھے۔ انہوں نے نہ جانے کتنے بے بس و بے کس دلوں کی دعائیں لیں۔ کتنی اجاڑ ماؤں کے سروں پر چادریں رکھیں۔ خوابوں اور خواہشوں سے خالی نہ جانے کتنے لاوارث بچوں کے ہاتھوں میں کتابیں دے کر انہیں قد آور کیا اور نہ جانے کتنی نسلوں کو اپنے کاندھوں پر اٹھا کر اونچا کیا، انہیں سماج میں پہچان دی، عزت، شہرت، نام اور رتبہ دیا۔ دھرتی کے اس سپوت نے ہمیشہ اپنی ماں دھرتی کی خوشحالیوں کے خواب دیکھے اور وہ ایک با مقصد و باوقار زندگی گزار کر رخصت ہوئے۔ اُن کا نام ڈیرہ میں ایک رہنما کے طور پر ایک داستان طراز حیثیت رکھتا ہے۔

4 دسمبر 1906ء کو نواب سر میجر احمد نواز خان سدوزئی کے ہاں پیدا ہونے والے نواب اللہ نواز خان اپنے وقتوں کی عظیم علمی اور سماجی شخصیت تھے۔ اُن کے والد اعلیٰ تعلیم یافتہ، باصلاحیت اور اپنے عہد

کے اہم سیاستدانوں میں سے ایک تھے۔نواب اللہ نواز خان نے اپنی ابتدائی تعلیم ڈیرہ سے حاصل کی بعد ازاں ہندوستان کی ملکہ کہسار (شملہ) کے کرائسٹ چرچ اور بشپ کاٹن جیسی شہرہ آفاق درسگاہوں سے گریجویشن کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کی خاطر انہیں لندن بھیج دیا گیا۔قانون اور سیاست کے منجھے ہوئے دانشور باپ کی زیرنگرانی تربیت یافتہ،صاحب ثروت گھرانے کا یہ چشم و چراغ جی داری، بے باکی اور حق بات کھڑک کر بولنے کا عزم لے کر گوروں کی سرزمین پر اترا اور مغربی اداروں میں قانون کی تعلیم حاصل کرنے لگا۔ڈیرہ کی زرخیز مٹی سے جنم لینے والے اس ہونہار نوجوان کے خون میں کچھ کر دینے کا جذبہ گردش کر رہا تھا۔چنانچہ اسٹوڈنٹس لائف کے دوران ہی انہوں نے ایک بے باک صحافی کے طور پر اپنی عملی زندگی کا آغاز کر ڈالا۔ادب،فلسفہ،مذہب اور سائنس کے عنوانات سے انہوں نے برطانیہ کے مختلف اخبارات میں بیش قیمت آرٹیکلز لکھے۔نواب صاحب کی عمر اس وقت صرف 22 سال تھی مگر اس عمر میں انہوں نے کئی عالمی شہرت یافتہ شخصیات کے انٹرویوز کر ڈالے۔اسی دوران اُن کی قابلیت کا شہرہ دانش گاہوں کی راہداریوں سے ہوتا ہوا شاہی محل تک جا پہنچا۔جلد ہی اُن کی رسائی بکنگھم پیلس تک ممکن ہوئی اور پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ جب شاہ امان اللہ اور شاہ کابل (والئی افغانستان) برطانیہ کے سرکاری دورے پر لندن آئے تو ڈیرہ کا یہ لعل و گوہر بکنگھم پیلس میں ان کے سرکاری استقبال کے لیے وہاں موجود تھا۔ملکہ برطانیہ نے علاقائی سیاست اور بین الاقوامی تعلقات (انگلینڈ اور افغانستان) پر اظہار خیال کی ذمہ داری نواب صاحب کو سونپ دی۔نواب صاحب نے دونوں اطراف کے لیڈروں کا مسودہ تحریر کیا،منٹس آف دا میٹنگ لکھے اور اسے پیش کرنے کی ذمہ داری بھی سرائیکی وسیب کے اس لائق و فائق سپوت کے سپرد کر دی گئی۔یہ سرائیکی خطے کے لیے کسی بھی اعزاز سے کچھ کم نہ تھا۔

برطانیہ میں اپنے قیام کے دوران جہاں انہوں نے قانون کی حکمرانی،انصاف اور مغربی جمہوریت کا قریب سے مشاہدہ کیا وہیں کتابوں کے وسیع مطالعے،مسلسل غور و فکر نے ان کے شب و روز بدل ڈالے اور اسی فکر و تشویش نے ایک محبّ ڈیرہ اور فرشتہ سیرت انسان کو اپنی قوم اور علاقے کی تعمیر و ترقی کی طرف راغب کیا۔انہوں نے انصاف کے جہنم میں جھلستے،عدل کی بوندوں کو ترستے،معاشی طور پر کمزور،

جہالت اور بے بسی کی تصویر بنے ڈیرے والوں کی بہبود کا بیڑہ اٹھایا اور بار ایٹ لاء کی ڈگری امتیازی نمبروں سے پاس کرنے کے بعد ایک عزم اور مشن لے کر سرزمین ڈیرہ پر اترے۔ یہ 1931ء کی بات ہے کہ جب نواب زادہ کی انگلینڈ سے بیرسٹر بن کر لوٹ آنے کی خبر اہلیان ڈیرہ تک پہنچی تو کیا ہندو کیا مسلمان سارے ڈیرے وال خوشی سے سڑکوں پر نکل آئے۔ جہاں ڈیرہ کی عوام نے انہیں خوش آمدید کہا وہیں یاروں دوستوں نے چشمِ دل فرش راہ کیے اور پھر یہی خلوص اس نوجوان کے لیے پاؤں کی ایسی زنجیر بنا کہ انہوں نے بمبئی ہائی کورٹ میں رجسٹریشن کروانے کے باوجود پریکٹس کا ارادہ ترک کر کے اپنے پسماندہ شہر ڈیرہ کی مٹی کو نم کرنے کا بیڑہ اٹھایا اور وہ سیاست کے خارزار میں اتر گئے۔ یہ وہی دور تھا کہ جب ہندوستان میں تحریک آزادی جڑ پکڑ چکی تھی۔ ڈیرہ کے لوگ اس سے نابلد نہ تھے مگر درحقیقت سیاست سے شغف اور تحریک سے وابستگی اور عملی شمولیت کا تعلق مٹھی بھر پڑھے لکھے افراد تک محدود تھا، جن میں ہندو کمیونٹی نمایاں تھی جبکہ نوے فیصد دیہی آبادی سیاست سے مکمل لاتعلق تھی۔ اُن کی پہلی ترجیح علاقہ میں سیاسی اور جمہوری شعور بیدار کر کے ڈیرہ والوں کی کاہلی اور سستی کا خاتمہ کرنا تھا۔ نواب صاحب سمجھتے تھے کہ اقتصادی خودمختاری اور تعلیمی وسائل پر تمام انسانوں کا یکساں حق ہے جبکہ سیاسی بیداری ہی قوموں کی اصل آزادی اور خودمختاری کی ضامن ہوا کرتی ہے۔ انہوں نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز پرشور انداز میں دیہی علاقوں سے کیا۔ وہ ڈیرہ کے مضافات میں گئے۔ وہ ان جگہوں پر بھی گئے کہ جہاں لوگوں کے ذہنوں میں احتجاج، مسائل، مطالبات اور انسانی حقوق کے الفاظ بے معنی تھے۔ دیہاتی لوگ نواب صاحب کی تقریر کی اطلاع ایک دوسرے کو کچھ اس طرح دیا کرتے تھے: ''سُنو لوکو خدا دے۔ اج نوب زادہ وعظ کریسی''۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ بکنگھم پیلس کے شاہی ایوانوں سے گزرنے والا اور مغربی درسگاہوں میں ناز و نعم سے پلنے والا ہیرا دھرتی کے عشق میں کچھ ایسا گرفتار ہوگا کہ سرائیکی وسیب کے پسماندہ ترین مضافاتی علاقوں میں، کبھی پروآ، کبھی میرن، کبھی درابن، کبھی چھکان، کبھی کھتی، پہاڑ پور تو کبھی ماہڑا کے پسماندہ دھول اڑاتے رستوں پر اپنی عوام کے جھرمٹ میں ملے گا۔ نواب صاحب کہا کرتے تھے: ''میں نے اپنی زندگی غریب عوام کی جدوجہد کے لیے وقف کر دی ہے۔ میں نے ایک آزاد اور جمہوری معاشرے کا خواب دیکھا ہے کہ

جہاں انہیں مساوی حقوق میسر ہوں اور میں اس آدرش کو حاصل کرنے کے لیے اپنی کوششیں جاری رکھوں گا''۔اُن کا خطاب سننے کی خاطر جلسہ گاہیں بھر جایا کرتی تھیں اور ان کے الفاظ کی دھمک دور تک سنائی دیتی تھی۔انہوں نے ڈیرہ والوں کو صحیح معنوں میں زبان دی اور لوگ پہلی بار سوچنے لگے کہ روٹی رزق کے حصول کے علاوہ بھی زندگی کے کچھ تقاضے ہیں۔نواب صاحب کی محنت رنگ لائی اور کچھ ہی دنوں میں سرزمین ڈیرہ سے انقلاب زندہ باد، فرنگی راج مردہ باد کے نعرے گونج اٹھے۔اسی دوران کوٹھی نواب کے دروازے غریب ونادار افراد کے لیے کھول دیئے گئے۔نواب صاحب نے نہ صرف اپنے آپ کو سیاست کا اہل ثابت کیا بلکہ اپنی گوناگوں صلاحیتوں کے بل بوتے پر 1932ء میں وہ صوبہ سرحد کی قانون عاملہ کے سرکاری رکن نامزد ہوئے۔1937ء کے عام انتخابات میں ان کے جلسے جلوسوں نے ڈیرہ اور اس کے مضافات میں ہلچل مچا دی۔ڈیرہ کی عوام کے ووٹوں سے آپ دوبارہ 1946ء کے انتخابات میں سرحد اسمبلی پہنچے تو آپ کو صوبائی اسمبلی کا اسپیکر نامزد کر دیا گیا۔

پاکستان جب دنیا کے نقشے پر نمودار ہونے لگا تو فسادات کے منصوبہ ساز شہر میں گھس آئے۔ایک ایسے وقت میں جب زندگی فرقہ واریت کے زخموں سے چور تھی اور ڈیرہ کی غیر مسلم عوام خوف سے لرزہ براندام تھی یہ نواب صاحب کی ذات تھی کہ جنہوں نے اپنے سوہنے شہر کو خون کے چھینٹوں سے محفوظ رکھا اور آتش انتقام کو رواداری اور عدم تشدد کے فلسفے سے سرد کیا۔ایسے نیوٹرل لوگ اب ہمارے درمیان کہاں موجود کہ جو اپنی طرف کے ظالم کو ظالم کہہ کر مظلوم کی صف میں کھڑے ہو جائیں۔مگر نواب صاحب کچھ ایسے ہی انسان تھے کہ جو انسانوں کو زمین، زبان اور عقیدے سے بالاتر سمجھتے تھے اور رنگ ونسل مذہب کی بنیاد پر کسی کو کم تر اور برتر نہ جانتے تھے۔دھرتی کے اس عظیم بیٹے کے مزاج میں غرور نہیں عجز و انکساری، انتقام نہیں صلہ رحمی تھی۔وہ ایک دردمند دانشور کی حیثیت سے جہاں رواداری کے فلسفے کے قائل تھے وہیں رکھ رکھاؤ، مہمان داری اور تہذیب وشائستگی میں دہلی اور لکھنو والوں کو مات دیتے تھے۔اُن کی شہرہ آفاق کوٹھی کا چرچا دور تک تھا۔بیسویں صدی کی پراثر اور پرکشش شخصیت مہا آتما گاندھی جب 1938ء میں ڈیرہ اسماعیل خان آئے تو کوٹھی نواب میں قیام کیا۔تقسیم کے دوران فسادات کے دنوں میں ان کی کوٹھی

نہ صرف شرناتھیوں کا ٹھکانہ بنی بلکہ فسادزدہ ماحول میں نواب صاحب نے سینکڑوں ہندو ڈیرے والوں کی بحفاظت ہجرت کو یقینی بنایا۔ان کے ہاں اعلیٰ طبقے کے تعلیم یافتہ،روشن خیال اور ترقی پسند سوچ رکھنے والوں سے لے کر متوسط طبقے کے پڑھے لکھے، باشعور مسلم وغیر مسلم دوستوں کا کلیکشن موجود تھا۔ڈیرہ کے مخیرّ،خوش اخلاق ، ہمدرد اور اپنے پیشے میں ماہر، مشہور و معروف ڈاکٹر بہاری لعل اُن کے جگری دوست تھے۔ڈاکٹر بہاری لعل نواب صاحب کے مشوروں سے ضرورت منداور مستحق مسلمان مریضوں کا مفت علاج اور مفت دوائی دیا کرتے تھے(یہ بات صرف ڈاکٹر بہاری لعل اور نواب صاحب کے درمیان طے تھی)اور دونوں اطراف سے دوستی اور وفا کے تقاضے پورے کیے جاتے تھے۔یہاں تک کہ جب ڈاکٹر بہاری علیل ہوئے تو نواب صاحب کے پرزور اصرار پر خاندان سمیت اپنے آبائی گھر سے اٹھ کر قلعہ اللہ نواز منتقل ہو گئے۔صبح سے شام تک ڈاکٹر صاحب کی علالت کے لیے آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا جن کی خاطر تواضع سے نواب صاحب کبھی نہ گھبراتے بالآخر اس ہمدرد صفت ڈاکٹر نے وفات پائی تو اُس کی ارتھی اپنے دوست کی دہلیز سے اٹھی۔ڈاکٹر بہاری کے بعد ان کے فرزند ڈاکٹر جے دیال بھی اپنی پیشہ وارانہ قابلیت اور انسان دوستی کے اعتبار سے اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے نہ صرف غریب و مستحق ڈیرے والوں کا مفت علاج کیا کرتے بلکہ ورثے میں ملی دوستی کی لاج بھی آخر تک نبھاتے رہے۔ڈاکٹر جے دیال تقسیم ہند کے بعد نواب صاحب کے اصرار پر ڈیرہ میں رُک گئے۔وہ اسی دوران اپنے لائق و فائق شاگرد ڈاکٹر امان اللہ کو تیار کرنے لگے اور پھر ایک دن ڈاکٹر امان اللہ جیسا نایاب موتی ڈیرے والوں کے جھولی میں ڈال کر نواب صاحب سے اجازت لے کر رات کی تاریکی میں ہندوستان چلے گئے۔ڈاکٹر جے دیال کا تراشیدہ ہیرا ڈاکٹر امان اللہ بھی خدا ترسی اور سخاوت میں اپنے استاد ڈاکٹر جے دیال کی طرح بے نفس اور بے لوث انسان تھا۔ڈاکٹر دیال اور ڈاکٹر امان اللہ جیسے نہ جانے کتنے پودے نواب صاحب کی نرسری میں پیدا ہوئے تھے۔

نواب صاحب ایک ایسے بالا قامت انسان تھے جو ڈیرہ اور ڈیرے والوں سے اندھا عشق کرتے تھے۔1951ء کے الیکشن میں وہ مسلسل تیسری مرتبہ رکن اسمبلی منتخب ہوئے اور دوبارہ سے اسپیکر

بنائے گئے۔وہ دس سال تک صوبہ سرحد کی اسمبلی کے اسپیکر رہے جبکہ 1957 سے 1961 تک آپ پاکستان پبلک سروس کمیشن کے چیئرمین بھی رہے۔جولائی 1968ء میں آپ کو پاکستان ٹیکسٹ بک بورڈ کے چیئرمین کے عہدے پر فائز کیا گیا۔انہوں نے انجینئرنگ یونیورسٹی ٹرسٹ لاہور کے بطور ایگزیکٹو ڈائریکٹر بھی خدمات سرانجام دیں۔وہ اپنے ہم عصروں میں اس قدر نمایاں تھے کہ ان کو اپنی شناخت کے لیے کسی عہدے کی ضرورت نہ تھی بلکہ بڑے بڑے عہدے اپنی پہچان اور شناخت کے لیے انہیں ڈھونڈتے پھرتے تھے۔وہ نہ صرف اپنی عوام کے دکھ سکھ کے ساتھی تھے بلکہ ان کی شخصیت کی ایک نہیں کئی جہتیں تھیں خدا نے انہیں بہت سارے میدانوں اور کئی شعبوں کے لئے پیدا کیا تھا۔سیاسی اور سماجی امور کی انجام دہی ان کا جیسے مشغلہ تھا۔رہا فلاحی میدان تو انہوں نے اس دشت کی بھی خوب سیاحی کی۔ویلفیئر اور سماجی بہبود کے کام اور تعلیمی میدانوں میں سدوزئی نوابوں کی پس پردہ کاوشیں عرصہ دراز سے جاری تھیں۔ مثلاً ڈیرہ کے کئی نادار طالب علموں کی پس پردہ مالی معاونت، دینی مدارس کی سرپرستی اور مستحق طلباء کی کالجوں تک رسائی ممکن بنانا تاکہ تعلیم کا دائرہ محدود نہ ہونے پائے۔گڑھی سدوزئی کی دونوں مساجد نواب صاحب کی زیرِ کفالت تھیں جبکہ درس حافظ مٹھا صاحب نواب زادہ عبدالرحمٰن کی مکمل کفالت میں تھا۔اسلامیہ ہائی سکول نمبر2 کی اراضی اور اس کا ملحقہ رقبہ نواب احمد نواز خان (نواب ڈیرہ) کی پھوپھی نواب زادی خدیجہ بی بی نے تعلیمی مقاصد کے لیے وقف کر دیا تھا۔اس کے علاوہ کئی رفاعی اور فلاحی پراجیکٹس پر نواب صاحب چپ چاپ مدد کر دیا کرتے تھے،مگر ان سب کے باوجود وہ یہ سمجھتے تھے کہ کچھ ہے کہ جس کی ڈیرہ میں کمی ہے۔وہ ڈیرے والوں کی ترقی کے لیے کچھ ہٹ کر کرنا چاہتے تھے۔چہرے پر طرب اور ترنگ کی روشنی، آنکھوں میں امید کی کرن سجائے وہ نئی نسلوں کے لیے جس میگا پراجیکٹ کے خواب دیکھ رہے تھے وہ اعلیٰ تعلیم سے ہمکنار ہونے کا خواب تھا۔بڑھتے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک جدید سماج کا خواب، سرائیکیوں کو ترقی یافتہ اقوام کی صف میں کھڑا کرنے کا خواب، جہل کے خلاف جنگ کا خواب۔وہ ایک عظیم جامعہ، ایک مثالی یونیورسٹی اور ایک تعلیم یافتہ سماج کا خواب تھا اور یہی خواب بعد میں ان کی پہچان بنا۔انہوں نے عزم و ہمت، حوصلے اور دلیری سے نہ صرف اس میگا پراجیکٹ کی

بنیادیں رکھیں بلکہ سب سے حیران کن بات یہ ہے کہ اتنے بڑے پراجیکٹ کے لیے انہوں نے راکھ بی بی کے مقام پر اپنا گیارہ ہزار کنال کا قیمتی رقبہ بھی عطیہ کر دیا بلکہ اپنے باقی ماندہ مالی وسائل بھی اس پراجیکٹ پر نچھاور کر دیئے۔ ایسا انفرادی کارنامہ پوری سرائیکی وسیب میں نہ پہلے کبھی ہوا اور نہ ہی بعد میں سننے میں آیا۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اگر ایک شخص اپنے مقصد کے ساتھ کمٹڈ ہو تو وہ کتنی بڑی تبدیلی لا سکتا ہے۔ واقعی اس تبدیلی نے ڈیرہ والوں کے مقسوم بدل ڈالے اور گیٹ وے ٹو سرائیکستان میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ ڈیرہ کے نوجوانوں کی زندگیوں کو ایک نیا فلسفہ اور اُن کی سوچوں کو نیا زاویہ ملا۔

جامعہ گومل کی ابتداء کیسے ہوئی۔ اس دوران اس پر کیسے کیسے ستم توڑے گئے؟۔ اس تعلیمی ادارے کو کن کن نامساعد حالات کا سامنا کرنا پڑا اور یہ دانش گاہ انحطاط کے کتنے مراحل سے گزری؟۔ یہ ایک دلخراش داستان ہے جو واقعی پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ سابق وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے 29 مارچ 1974ء کے ایک روشن دن اس عظیم جامعہ کا سنگِ بنیاد کیا رکھا کہ بنوں سے لے کر پشاور اور چارسدہ سے چترال تک نفرت اور بے چینی پھیل گئی۔ بنوں شہر میں فسادات پھوٹ پڑے۔ ڈیرہ تا پشاور انڈس ہائی وے ایک ہفتہ تک کے لیے احتجاجاً بند رکھی گئی۔ ڈیرہ دشمنوں نے ہر قسم کے سیاسی ہتھکنڈے استعمال کر کے اپنی ایڑی چوٹی کا زور لگا کر یونیورسٹی کی راہ میں روڑے اٹکائے۔ صوبہ سرحد کی متعصب صوبائی حکومت کو بھی ہرگز گوارا نہ تھا کہ مقبوضہ سرائیکی خطہ ڈیرہ اسماعیل خان کسی طور ترقی کی دوڑ میں شامل ہو سکے۔ اسی لیے یہاں صحت، تعلیم اور زراعت کے شعبوں کی ہر گنجائش کو کم سطح تک منجمد رکھنے کے لیے کوششیں کی گئیں۔ اللہ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے نواب اللہ نواز صاحب کو جنہوں نے تمام علاقائی، لسانی اور سیاسی مخالفتوں کے باوجود تہیہ کر لیا کہ وہ مادرِ علمی کو کامیاب ادارہ بنا کر دم لیں گے۔ اس مقصد کے لیے وہ تن من دھن سے جت گئے۔ انہوں نے اپنی صحت کا بھی خیال نہ کیا اور اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے تک مسلسل کام جاری رکھا تاوقتیکہ گومل یونیورسٹی ایک مستحکم علمی ادارہ بن کر سامنے آئی۔ انہیں یونیورسٹی کے بانی اور وائس چانسلر کا عہدہ دیا گیا، وہ 1978ء تک اس منصب جلیلہ پر فائز رہے۔ انہوں نے ہمیشہ اپنا در، دفتر اور دل وسیع کیے رکھا۔ اُن کے بعد کئی دانشور اس ادارے کی مشکل حالات میں نگہداشت کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔

گومل یونیورسٹی صحیح معنوں میں سرائیکی معاشرے کی بلندیوں کا وسیلہ بنی ۔ یہ واحد تعلیمی، تہذیبی اور ادبی ادارہ تھی کہ جس سے علم و ادب اور تحقیق کے نئے در وا ہوئے ۔اس ادارے سے فارغ التحصیل طلباء وطالبات ملک وبیرون ملک اپنے شعبوں میں نمایاں کردارادا کرکے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا رہے ہیں۔ گورنمنٹ آف پاکستان کی منظورشدہ ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی ڈگریوں کو دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔اس وقت گومل یونیورسٹی میں 2700 طلباء وطالبات زیورِتعلیم سے آراستہ ہورہے ہیں اور یہ سب نواب اللہ نواز خان کے ذاتی سرمائے اوران کے فولادی اعصاب کی مرہون منت ہے۔

نواب اللہ نواز ہماری نسلوں کی لڑائی لڑے تھے۔ یہ تلوار اور توپ کی بجائے قلم سے ذہنوں کو بدلنے اور سماج کی راہ سے کانٹے چننے کی لڑائی تھی جس میں وہ سرخرو ہوئے تھے۔کسی نے واقعی سچ کہا ہے کہ نواب اللہ نواز سرائیکی وسیب کے سرسید تھے۔آج گومل یونیورسٹی کو قائم ہوئے 38 برس ہونے کو آئے ہیں ،صدافسوس کہ ابھی تک یونیورسٹی میں سرائیکی ڈیپارٹمنٹ قائم نہیں کیا جاسکا۔اس کے ذمہ دار سابقہ وحالیہ ایم این ایز، ایم پی ایز اور افسر شاہی ہیں ۔ سیاسی بنیادوں پر بننے والے سابقہ وائس چانسلروں نے سرائیکیوں کی حق تلفی کرکے میرٹ کی دھجیاں اڑائیں ۔سرائیکی دشمن مافیا کی ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ یونیورسٹی کو مالی بحران میں ڈال کر تباہی کی طرف دھکیلا جائے۔ایک لمبے عرصے کی حق تلفی اور استحصال کے بعد وائس چانسلر ڈاکٹر منصور اکبر کنڈی ایک ایسی شخصیت بن کر ابھرے ہیں کہ جن سے ڈیرے والوں کو کافی توقعات ہیں۔ڈاکٹر صاحب کی قابلیت اور میرٹ پر مبنی فیصلوں کی بدولت گومل یونیورسٹی کا شمار ملک کی ٹاپ فائیو یونیورسٹیوں میں ممکن ہوا ہے۔

آج جہاں ایک طرف دولت، ثروت اور اقتدار کی ہوس میں گرفتار اشرافیہ کی یلغار ہے تو دوسری طرف ہمیں قیام پاکستان سے پہلے کا سماج اور اُس دور کی سیاست یاد آجاتی ہے۔ایسے لگتا ہے کہ جیسے انصاف کی کرسی پر نواب صاحب کی صورت میں کوئی رابن ہڈ آن بیٹھا ہو جو امیروں سے چھینا مال غریبوں میں بانٹ رہا ہو۔ڈیرہ کے موجودہ حکمرانوں اور نواب صاحب کی ذات میں بنیادی فرق بھی یہی تھا کہ نواب صاحب نے یونیورسٹی اور دوسرے خیراتی وفلاحی ادارے اپنی جیب سے رقم خرچ کرکے بنوائے تھے

فیتہ کاٹ کر، افتتاح کر کے یا فنڈ منظور کروا کر اپنے نام کی تختیاں نہیں لگوائی تھیں۔ چار بار الیکشن میں کامیابی حاصل کرنے کے باوجود انہوں نے نہ کبھی ناجائز پرمٹ لیے، نہ سرکاری پلاٹ خریدے، نہ بیگم اور اولاد کے نام پر بینکوں سے کروڑوں کے قرضے معاف کروائے اور نہ ہی کوئی ذاتی انڈسٹری لگائی۔ جامعہ گومل پر اپنی توجہ مرکوز کرنے کے باعث جب وہ سیاست سے سبکدوش ہوئے تو ڈیرہ میں پہلی بار سیاسی خلاء پیدا ہوا۔ اس خلاء کا بھرپور فائدہ طالع آزما لوگوں نے اٹھایا اور ہمارے رہبر و رہنما کا لبادہ اوڑھ کر اپنے اور اپنی آنے والی نسلوں کے لیے دولت و اقتدار کے انبار لگانے کی خاطر ہر گھر کی دہلیز سے روشنی چرا کر اپنے ایوانوں کو بقعہ نور کرنے لگے۔ حکمرانوں نے عوام کے ٹیکسوں کی رقم سے بنائی جانے والی سرکاری عمارات کے نام اپنے اجداد کے نام پر رکھ چھوڑے مگر کسی کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ محسنِ ڈیرہ کے نام سے کوئی عمارت منسوب کر لیتے۔ آج جب میں اصلی، نسلی اور سُچے ڈیرے والوں کی لسٹ بنانے بیٹھا ہوں تو بدقسمتی سے یہ فہرست چند ناموں تک ہی محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ ڈیرہ میں سب سے پہلی لائبریری کھولنے اور اپنی ساری کتابیں وی بی سکول کو دان کر دینے والے شری ٹھاکر دت دھون، ڈیرہ شہر کو جگنو بنانے والے رچی رام کھتر، اپنی چلتی سائیکل سے اتر کر مریضوں کو مفت نسخے تجویز کر دینے والے ڈاکٹر جے دیال، اسلامیہ ہائی سکول کو ذمین دان کر دینے والی نواب زادی خدیجہ بی بی، فری آئی کیمپ لگانے والے ڈاکٹر جگن ناتھ پپلانی، پس پردہ رہ کر کئی غریب طلباء کی مالی امداد اور اکثر مریضوں کو اللہ کے نام پر مفت دوائی دینے والے ڈاکٹر امان اللہ، غریبوں کے ان داتا سیٹھ بگائی اور گریٹ آف دا گریٹسٹ نواب اللہ نواز خان سدوزئی جیسے کتاب دوست، علم دوست، اعلیٰ انسانی اقدار کے حامل مفکر چہرے۔ ان آشفتہ سروں نے صحیح معنوں میں زندگی کے اصل مفہوم کو سمجھا، ظلمت کے اندھیروں کو ختم کر کے سماج میں روشنیاں بکھیریں، زندہ رہنے کا حق ادا کیا اور مٹی کا قرض ادا کر کے تاریخ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے امر ہو گئے۔

خدمت خلق کے پیکر، انسانوں سے بے غرض محبت کرنے والے اصلی، سُچے اور کھرے ڈیرے وال تو یہی لوگ تھے۔ انتہائی حیرت کی بات ہے کہ ان لوگوں کے ناموں سے یونیورسٹی کا کوئی ہال، کوئی باب، کوئی ڈیپارٹمنٹ، کوئی لائبریری، کوئی سڑک، کوئی پریس کلب اور کوئی ہسپتال منسوب نہیں کیا جا سکا

۔یہی ہماری ذہانتوں کی پرورش کرنے والی نرسریاں تھیں اور یہی وہ اجلے باطن کے لوگ تھے کہ جو دھرتی کے اصل رکھوالے تھے۔جنہوں نے اپنی جدو جہد سے مٹی کا قرض اتار کر سماج کو مالا مال کیا اور ہماری نسلوں کی نسلیں سنواریں۔اسے ہماری بدقسمتی کہیے کہ جنہیں سر آنکھوں پر بٹھانا چاہیے تھا ان کے ساتھ ہم نے غیروں جیسا سلوک کیا؟۔

ڈیرہ کے ان سپوتوں کے کارناموں کو جب ہم سوچنے بیٹھتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے قبرستان میں زلزلہ آ گیا ہو،تمام قبروں کے کتبے اکھڑ گئے ہوں اور طوفان کے دوران آنکھ بچا کر ہم نے اپنی اپنی مرضی کے کتبے اٹھا کر اپنے پیاروں کی قبروں پر لگا دیئے ہوں۔کچھ بھی ہو،غلط قبروں پر غلط کتبے آج ہمارا منہ چڑا رہے ہیں،کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ہم نے انہیں غلط جگہ پر نصب کر دیا ہے۔ہم نے کسی حق دار کا حق مارا ہے،ہمارا مردہ یہ کتبہ ڈیزروہی نہیں کرتا تھا۔

ہمیں چاہیے کہ ہم ایک قرارداد منظور کروائیں اور سب سرکاری عمارتوں کو اُن کے اصل وارثوں کے نام سے شناخت دیں۔اپنے دھرتی جایوں کے ناموں سے فلاحی ادارے بنائیں اور ان کے جنم دن کا جشن عوامی تہوار کی حیثیت سے منائیں کیونکہ دکھ درد،انسانی محنت کی عظمتوں کی جھلک اور اپنی دھرتی کے دکھی لوگوں کی زندگیوں سے جان کاری رکھنے والے ان سب لوگوں نے زندگی کو ایئر کنڈیشنڈ کمروں کے اندر انجوائے کرنے کی بجائے اپنی عمر کا لمحہ لمحہ اپنی زمین اور اس کے اُگے لوگوں کے درمیان بسر کیا تھا۔ سرائیکی وسیب کے اصل وارثوں کو،فیض کے بہتے سندھو دھاروں کو،اُن کی جدو جہد،عزم وارادوں اور اُن سب کی کمٹمنٹ کو ہر ڈیرے وال کا سلام۔

....

ناصر خان، تاریخ کا روشن باب

یہ 12 فروری 2011ء کی ایک ٹھری ٹھری سہ پہر تھی۔ وقفے وقفے سے برسنے والی میٹھی پھوار نے چہار سو جل تھل کر دیا تھا۔ فضا میں دور تلک بکھرے سرمئی بادلوں کی مہین چادر نظروں کو عجب سکون بخش رہی تھی۔ میں عرفان لغاری صاحب کے آفس میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ ایک کے بعد ایک خیال اچھل کر ذہن کے پیالے سے گرتا چلا جا رہا تھا اور میں اسے پکڑ پکڑ کر سمیٹنے میں مگن اسی سوچ میں گم تھا کہ تین دن کے بعد مجھے واپس لوٹ جانا ہے، پھر پتہ نہیں کب ڈیرہ اور اس کے در و دیوار دیکھنا نصیب ہوں، مگر باوجود کوشش کے ابھی بھی کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے کہیں نہ کہیں کوئی کمی، کوئی کوتاہی، کوئی تشنگی سی رہ گئی ہے۔ عرفان بھائی نے فوراً میری باڈی لینگویج کو پڑھ لیا اور پوچھا: آپ ناصر خان سے ملے ہو؟۔ میرا جواب نفی میں پاتے ہی انہوں نے کہا کہ چائے پی کر ہم ناصر خان کے ہاں چلتے ہیں کیونکہ ان سے ملے بغیر ڈیرہ کی تاریخ اور تحقیق کا کام ادھورا سمجھیں۔ اگلے چند منٹوں میں ہم دونوں کچہری سے نکل کر ناصر خان کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔ ہم دونوں نے ابھی کچہری روڈ پر قدم رکھا ہی تھا کہ بادلوں کی چھلنی سے بارش کے لمبوترے قطرے ٹپکنا شروع ہو گئے اور چند ہی لمحوں میں موٹے قطروں نے نرم و ملائم پھوار کا روپ دھار کر زمین کے سینے کو نم کرنا شروع کر دیا۔ بارش کی شبنمی پھوار میں بھیگے وجود کے اندر ایک ٹھنڈ سی اترتی محسوس ہوئی۔ ہم شلواروں کے پائنچے اوپر کیے فقیرنی گیٹ کے اندر سے کچھ تاریخی عمارات کی تصویر کشی کرتے ہوئے جلد ہی محلّہ حیات اللہ پہنچ گئے۔ ناصر خان کے مہمان خانے میں ان کے انتظار میں بیٹھے ابھی چند لمحے گزرے تھے کہ وہ تشریف لے آئے۔ عرفان بھائی نے سب سے پہلے ناصر خان کو ہلکا پھلکا تعارفی فلیور دیا اور پھر باتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ ناصر خان دھیمے لہجے میں مدبرانہ گفتگو کرنے والے ایک سنجیدہ اور پر خلوص قسم کے انسان تھے۔ وہ چالیس کی دہائی میں محلّہ حیات اللہ میں پیدا ہوئے۔ ان کا شمار ڈیرہ کے ان چند پڑھے لکھے مسلم گھرانوں میں ہوتا ہے کہ جہاں تعلیم کو لازمی سمجھا جاتا تھا۔ اسی سوچ کے زیر اثر انہیں

اپنے وقت کی اچھی سے اچھی تعلیم دلوائی گئی۔انہوں نے ہائی سکول نمبر 1 سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور ڈائریکٹ قانون گو کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ چونکہ یہ تقسیم کت فوراً بعد کا زمانہ تھا اسی لیے اس عہدے پر کام کرتے ہوئے انہیں کچھ تلخ تجربات سے بھی گزرنا پڑا۔انہوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے جھوٹے کلیموں کی بھرمار،زمینوں کی بندر بانٹ اور ڈیرے والوں کا استحصال دیکھا۔1964ء میں انہوں نے اپنی نوکری سے استعفیٰ دیا اور کراچی چلے گئے۔کراچی میں کافی عرصہ رہنے کے بعد وہ واپس ڈیرہ لوٹے اور قانون کے پیشے سے دوبارہ منسلک ہو گئے۔ناصر خان غالباً وہ پہلے مسلمان ڈیرہ وال تھے کہ جنہوں نے نہ صرف ڈیرہ اسماعیل خان سیوا سمتھی میں باقاعدہ شمولیت اختیار کی بلکہ اس تنظیم کے رکن بننے کا اعزاز بھی حاصل کیا۔یہ تنظیم دراصل 1913ء میں ڈیرہ کے چند ہندو نوجوانوں نے قائم کی تھی۔اسی تنظیم کی کوششوں سے اُس وقت کے وزیر مالیات مدن موہن مانولیہ نے سرائیکی وسیب کی جغرافیائی اور ثقافتی وحدت کو اجاگر کرنے کے لیے حکومت ہند کے سامنے کچھ مطالبات رکھے تھے جن کو عملی جامہ پہنانے کے لیے Bray کمیٹی تشکیل دی گئی تھی۔اس کمیٹی کے ارکان میں شامل 'خان برادران' نے ڈیرہ اسماعیل خان کے جغرافیائی اور لسانی حق کو کھلے دل سے تسلیم کیا تھا مگر 1946ء میں یہ کمیٹی شورشوں اور ہنگاموں کی نذر ہو کر توڑ دی گئی تھی۔ناصر خان بتاتے ہیں کہ آزادی کے کئی برس بعد 1963ء میں ڈیرہ والوں نے سیوا سمتھی کا بروشر دوبارہ سے ترتیب دیا تھا جسے 1968ء میں ڈیرہ وال نگر دہلی سے پبلش کیا گیا تھا۔بروشر کی ایک کاپی ناصر خان کے پاس بھی بھجوائی گئی تھی جو انہوں نے ڈیرہ کی کسی سیاسی شخصیت کے حوالے اس امید سے کی تھی کہ شاید وہ ڈیرہ کے حقوق کے لیے کچھ کر سکے مگر وہ سیاسی رہنما دُنی تروڑ نکلا۔

ناصر خان نے اپنے دور کے چیدہ چیدہ واقعات بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر جے دیال اور بگائی سیٹھ جیسے لیجنڈری کرداروں کا خصوصی ذکر کیا۔محلّہ حیات اللہ کی تاریخی گلی میں جہاں ایک طرف ہلکی بوندا باندی کب سے جاری تھی وہیں اسی گلی کی ایک چھوٹی سی بیٹھک میں ماضی کے کئی بند دریچے کھل چکے تھے۔ایسے لگتا تھا کہ جیسے دیواروں کی درزوں میں کوئی چہرہ جھانک رہا ہو،دروازوں کی دہلیز پر ماضی کا کوئی کردار آن بیٹھا ہو جو ناصر خان کو ایک عجب مسکان سے تکے جا رہا ہو۔کنک کی ریشم بالیاں،پچھّم کو چلتی دلربا ہوا

اور رم جھم بوندوں کا معطر ساون واپس لوٹ آیا ہو۔ ناصر خان جب اپنے عہد کے حالات واقعات بیان کر رہے تھے تو ان کی آنکھوں کی چمک انکی سچائی کا پتہ دیتی تھی۔

کہتے ہیں کہ افراتفری میں جب جنگل میں طوفان آتا ہے تو مینا اپنے انڈوں کو چھوڑ کر کوؤں کے انڈے اٹھا لیتی ہے، لیکن ایسے کٹھن اور اعصاب شکن حالات میں بھی ڈیرہ والوں نے انسانی اقدار کا خوب پاس کئے رکھا۔ فسادات کے دنوں میں جب بگائی سیٹھ کو پتہ چلا کہ اس کے مسلمان محلے دار فاقہ کشی کی حالت میں ہیں تو اس نے اپنے ملازم نِکُو کو حکم دیا کہ وہ سارا غلہ گوداموں سے اٹھا کر مسلمانوں میں تقسیم کر دے، اولیت مسلمان محلے داروں کو دی جائے۔ جب خدا ترسی اور انسانیت کا ذکر چھڑا تو ناصر خان نے بتایا کہ ڈیرہ میں ایک ڈاکٹر بنا ہوا کرتا تھا، جب فسادات عروج پر تھے تو وہ اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر آدھی رات کو لالٹین اٹھائے مسلمانوں کے محلوں میں مریضوں کو بلا معاوضہ دیکھنے جایا کرتا تھا۔ مریض کی حالت دیکھنے کے بعد گھر کے کسی مرد کو خالی شیشی کے ہمراہ اپنے ساتھ لے کر گھر پہنچتا اور شیشی میں دوائی بھر کر اسے رخصت کر دیا کرتا تھا۔ انہوں نے اپنے دور کے ڈاکٹر شمبر ناتھ کا ذکر بڑی عقیدت و احترام سے کیا۔ ڈاکٹر شمبر ناتھ نے اعلان کر رکھا تھا کہ جو کوئی بھی مریض آئے انہیں فوراً اطلاع دی جائے۔ ایک دفعہ ڈاکٹر کے کسی سکھ اسسٹنٹ نے گلہ کیا کہ مسلمان ہمیں لوٹ کر ہماری املاک کو آگ لگا رہے ہیں، ہمیں دکانوں سے اتار کر زندہ جلا رہے ہیں آپ کے پاس جب بھی کوئی مسلمان مریض سرجری کے لیے آئے تو آپ کو بھی بدلہ لینا چاہیے۔ یہ بات سن کر ڈاکٹر شمبر ناتھ سخت خفا ہوئے اور اپنے سکھ اسسٹنٹ کو خبردار کرتے ہوئے کہا: ''میں ایک ڈاکٹر ہوں اور میرا کام جان بچانا ہے، مجھے اپنا فرض ادا کرنے دو اور اگر تمہیں واقعی لڑنے مرنے کا شوق ہے تو میرے کلینک کے باہر جا کر لڑو''۔ اسی طرح ایک اور خدا ترس ڈاکٹر بھگوان داس ماٹا جو اپنا اسٹھیتو اسکوپ اس امید پر ڈیرہ چھوڑ گیا تھا کہ وہ بہت جلد واپس آجائے گا۔

تاریخ کی ٹوٹی گرہیں جوڑنے والے ناصر صاحب نے ہندوستان کے سابق چیف آف آرمی اسٹاف جنرل وی پی ملک کا ذکر کرتے ہوئے ہماری معلومات میں گراں قدر اضافہ کیا۔ رام دیال اور شیو دیال کا ہونہار پوتا وی پی ملک محلّہ حیات اللہ کے عقب میں واقع ملکاں والی گلی میں نمبر 3 سکول کے سامنے

والے ایک گھر میں پیدا ہوا تھا۔ آزادی کے بعد اس کا سارا گھرانہ ہندوستان چلا گیا، وہاں پر اس نوجوان نے آرمی جوائن کی اور اپنی قابلیت اور اہلیت کے بل بوتے پر ہندوستانی فوج کے سب سے بڑے رینک چیف آف آرمی اسٹاف تک جا پہنچا۔ کہا جاتا ہے کہ کارگل کی جنگ کے دوران جب وہ ہندوستان کے چیف آف آرمی اسٹاف تھے تو ان کے سامنے جنگی پلان رکھا گیا، انہوں نے ڈیرہ شہر کے نقشے پر سبز دائرہ یہ سوچ کر لگا دیا کہ اگر بالفرض جنگ ہوئی تو اس کی جنم بھومی کو کچھ نقصان نہ پہنچنے پائے۔ ناصر خان کے ساتھ ڈھیروں باتیں ہوئیں، ان کی سوچ اور خیالات کو پرکھ کر ان کی زندگی کے خدوخال، فکر اور احساس تک رسائی ممکن ہوئی۔ ان کے بارے میں لکھتے ہوئے مجھے اپنی کم علمی، کم مائیگی اور نالائقی کا اعتراف ضرور ہے مگر یہ کیا کم ہے کہ ان سے ملنے کا موقع ملا۔ نفرتوں کے اس موسم میں جب ہر طرف افراتفری کا عالم ہے، ایسے میں ان سے مل کر بہت سے حقائق جاننے اور زندگی کے ان قیمتی لمحات میں ان سے بہت کچھ سیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ ناصر خان سے ملنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ کوئی چیز تو ایسی ہے کہ جوان کے اندر سانسیں لے رہی ہے۔ کچھ ہے جس نے انہیں توانا رکھا ہوا ہے۔ اسے ہم نظریہ کہیں یا پھر سوچ کا نام دیں، کیونکہ نظریہ سوچ اور سوچ دماغ کی پیداوار ہے۔ یہ ایک لاجیکل سی بات ہے کہ جب تلک کوئی دماغ سوچتا رہتا ہے تب تک وہ زندہ رہتا ہے۔ بالآخر عرفان لغاری نے ناصر خان سے رخصت مانگی اور ہم دونوں ان کی بیٹھک سے باہر نکل آئے۔

بھل بھل کرتی گیلی شام امبر سے کب کی نیچے اتر چکی تھی۔ کیچڑ سے لت پت گلیوں سے گزر کر غلہ منڈی تک آتے ہی عرفان بھائی نے اپنے گھر کی راہ لی۔ ٹیکسی رکشوں کی بھاگم دوڑ میں فضا میں اچھلتے چھینٹوں کے درمیان زندگی رواں دواں تھی۔ سورج کا چہرہ بادلوں کی اوٹ میں جانے کب کا جا چھپا تھا۔ مؤذن نے مسجد میں شام کی صدا بلند کی اور صلواۃ کے راستے پر فلاح کی کھوج میں میرے قدم قریبی مسجد کی طرف اٹھ کھڑے ہوئے۔

....

وَل کول وِسری اَجرک پا

6 فروری 2011ء، آج کا دن معمول سے کچھ زیادہ ہی روشن تھا۔ دوپہر ہونے کو آئی تھی مگر صبح سے بکھرنے والی نورانی چمک اور ارد گرد پھیلی تازگی ویسی کی ویسی تھی۔ سعید اختر سیال کی دعوت پر ڈیرہ دیکھنے کی غرض سے خصوصی طور پر اسلام آباد سے تشریف لائے گل زیب خاکوانی کا آج دوسرا روز تھا۔ روہی چینل اسلام آباد سے وابستہ ہمارے اس مہمان کو قلعہ بلوٹ اور کافر کوٹ کے تاریخی مقامات کی سیر کروائی جا چکی تھی۔ اسی لیے آج انہیں دریا کنارے لے جا کر اس کی رونقیں دکھانا اور شہر گھمانا مقصود تھا۔ طاہر شیرازی، کاشف رحمٰن کاشف اور سعید بھائی کی ہمراہی میں ہم سب اپنے مہمان کو شہر دکھانے کے لیے لے گئے۔ ہماری گاڑی تو پانوالہ بازار کی گہما گہمیوں سے الجھتی، حق نواز پارک سے گزر کر دائیں کروٹ لیتی جی پی او کے سامنے والی سڑک پر دوڑنے لگی۔ دھیمی رفتار سے چلتے لوگوں کی بستی سے گزرتے ہوئے جب ہماری گاڑی محمود ہسپتال (لائنز کلب ہسپتال) کے سامنے بنے بند تک پہنچی تو ناکے پر کھڑے سیکورٹی اہلکار نے پشتو میں یہ کہہ کر روک دیا کہ بریگیڈیئر صاحب خصوصی دورے پر نکلے ہوئے ہیں، لہٰذا آپ لوگ آگے نہیں جا سکتے۔ تھوڑے سے بحث و مباحثے کے بعد سعید بھائی نے کنٹونمنٹ ایریا کا اپنا سرکاری کارڈ دکھایا تب کہیں آگے جانے کی اجازت ملی۔ اگرچہ یہ چھٹی کا دن تھا لیکن دریا کا کنارہ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ بیٹ پر جگہ جگہ پھیلی ہریالی آنکھوں کو تراوت بخش رہی تھی، عین اسی جگہ کبھی ثوبتیں اور دھاونیاں ہوا کرتی تھیں مگر اب عالم یہ تھا کہ چاروں جانب بکھری خاموشی اور اداسی کسی آکٹوپس کی طرح جکڑنے کو دوڑتی تھی۔ تھوڑی دوری پر ہمیں کچھ اکا دکا لوگ دکھائی دیئے۔ دریا کنارے کھڑی تاریخ کا منہ چڑاتی زنگ آلود ڈیرہ لانچ سے گزرنے کے بعد ایک اونچے فیملی کیبن کے سامنے گاڑی روک دی گئی۔ ہم سب اوپر چڑھ آئے۔ یہ سائٹ کسی ہوٹل کا حصہ معلوم ہوتی تھی اور یہاں موسم قدرے خنک تھا۔ تاحد نگاہ پھیلا دریا کا خشک بیٹ جس کے بیچوں بیچ ٹھہرا پانی کسی جھیل کا منظر پیش کر رہا تھا۔ گل زیب ایک بنچ پر بیٹھ گئے اور

طاہر شیرازی ہم سب کو 80 کی دھائی میں لے گئے۔ پانی کے اس پار کچے کا حسین مقام کہ جہاں سے سورج سر اٹھا کر آکاش کی بلندیوں پر چڑھتا دکھائی دیا کرتا۔ تھل اور دامان کے بیچ نکلتی امرت دھارا اور اس سے پرے پھیلے پہاڑ جن کی پیشانیوں کو آسمان جھک کر چوما کرتا تھا۔ دریا پر اترتی رنگین اور سہانی شامیں کہ جب کونجوں، مرغابیوں، راج ہنسوں، تلیئر، میناؤں، بٹیروں اور لالیوں کے جھنڈ وسعت بھری دھرتی کے سینے پر اڑانیں بھرتے پھرتے اور جب ان گنت پتھروں میں سے کسی ایک پتھر پر بیٹھا کوئی وجود اپنے پاؤں پانی میں ڈبوئے خاموشی سے ان پیار بھرے پرندوں کی لمبی لمبی اڑانیں دیکھا کرتا تھا۔ پھر کیا ہوا۔ سب کچھ دھیرے دھیرے نظروں سے اوجھل ہوتا چلا گیا۔ زندگی کے دریا کا بند ٹوٹ گیا اور محبت کی وادی کے تمام رنگ بہہ نکلے۔ کونجیں اپنی ڈار سے کیا بچھڑیں کہ کرلاتی رہ گئیں۔ طوے، مینائیں قید کر لی گئیں اور ہنستے بستے لینڈ اسکیپ کو کسی ظالم گھمل گھیری نے نگل لیا۔ وہ پاؤں جنہیں کبھی سندھو تر کیا کرتا تھا، اس پر دامان کے تھوہڑوں کے کانٹے اگ آئے، ارد گرد پھیلی ہریالیوں کو کسی ڈریگن نے جلا کر بھسم کر دیا۔ سنہرے دنوں کی دھوپ کو سیاہ بادلوں نے ڈھک دیا۔ ایسے بے فیض بادل کہ جو کبھی نہ برسے بلکہ روشنی کو روک کر ایک ایسی چھاؤں پھینکتے رہے جس میں دھوپ ٹھہر سی گئی تھی۔

گونگی، بہری اداسیوں کی گدلی چادر اوڑھے سندھ دریا خاموشی سے اپنے لٹنے کی داستان سننے لگا تھا۔ کیبن کے سامنے کھڑے کسی انجان درخت کے نیچے بکھرے خشک پتے کے قریب ایک پھدکتی چڑیا دکھائی دی۔ ٹھنڈی ہوا زور سے چلی۔ خنکی کے تال میل میں رچے، ہوا کی شریر سرسراہٹ سے پھڑ پھڑاتے درختوں کے پتے چند لمحوں کے لیے ساکت ہوئے اور اگلے ہی لمحے کسی مست پون کی ہلکی سی شرارت سے پھر سے ہنس پڑے۔ یہ سعید اختر سیال تھے جو ہم سب کی فرمائش پر مدہم سی مسکان ہونٹوں پر سجائے اپنا تازہ کلام سنا رہے تھے۔

ہِک نہ ہک ڈِینھ حاکم کول سوالنڑاں ھِ
بابے کہ تیئں بال کُوں خاب ڈِکھالنڑاں ھِ
جکھڑ کیئں ڈِینھ گھُل پووے تاں خیال کرئے

ڈاٹ اِچ جیہڑی باری ھِ اُتھ آلنڑاں ھِ
بھورے اِیویں بھورن نال اَن کھُٹدا نیئں
پکھواں دا اے چوگا آپ سنبھالنڑاں ھِ
کندھ اِچ جیہڑا جالا ھِ نیئں بند کرنا
پُرکھیاں ناویں ڈِیوا شامیں بالنڑاں ھِ
ہِک نہ ہِک ڈِینھ حاکم کول سوالنڑ اں ھِ
بابے کہ تیئں بال کُوں خاب ڈِکھالنڑاں ھِ

دیرہ سندھ کنارے اور وِساکھ جیسی شہرہ آفاق شاعری تخلیق کرنے والے اس شاعر کا کلام سرائیکی دھرتی کا سنگھار ہے۔ سعید اختر ایک محبت، ایک سوچ کا نام ہے۔ مٹی کے عشق میں موم کی طرح لحظہ لحظہ پگھلتی ایک ایسی محبت جو روح کے احساس سے جڑی ہے، جو رشتوں کے ریشم سے بندھی ہے۔ ان کے اشعار میں زندگی واقعی سانسیں لیتی ہے۔ ان کی شاعری دھرتی ماں کا عکس اور سوچ کی آئینہ دار ہے۔ ان کے الفاظ میں گہرائی اور سوچ کی ایک پختگی ہے جو سر اٹھا کر جھانکتی ہے اور اپنا آپ منوا لیتی ہے۔ وِساکھ میں لکھے درد کو کوئی جتنی بار بھی پڑھ لے جی نہیں بھرتا۔ ''اساں ولناں ھ، اجرک، تھلہ بالورام، دیبل، سرسوتی، کافر کوٹ، سومنات اور وکھرپ' ' جیسے عنوانات سے لکھی گئی نظمیں دراصل وہ سچائیاں ہیں کہ جنہیں لکھتے ہوئے راہ میں دشواریاں، ہجر کی صدیاں اور وچھوڑے کے کرب آتے ہیں۔ وِساکھ پڑھ کر ایسے لگتا ہے کہ جیسے اس کا حرف حرف لکھا ہی تب گیا جب لکھنے والے نے کسی چیز کو شدت سے محسوس کیا۔ جب لفظ خود بخود شریر کے اندر سر ابھارنے، چلنے پھرنے اور بولنے لگے تب شاعر کو کسی مخصوص ماحول میں جانے کی ضرورت نہ پڑی بلکہ اس کا ذہن خود بخود اسے ایک ایسے منظر نامے میں لے گیا کہ جہاں پر سندھو کا کنارہ، بالو کا تھلہ، دامان، بلوٹ اور اسے مٹانے کی خاطر بجلی کی رفتار سے امڈتے چلے آتے، دھول اڑاتے حملہ آوروں کے گھوڑوں کی ٹاپیں اور سموں سے اٹھنے والی چنگاریاں صاف دکھائی دیں۔ دامان کی پور پور میں ڈنگ مارنے کے بعد اس کی نس نس میں زہر اتارنے والوں کی کہانیاں، بلوٹ کی وادی کو ڈسنے والے سنگ چُوروں کے

قصے، وسیب کے سینے پر اُگے پیرا سائیٹس اور دھرتی کی رگ رگ کو چوسنے والی جونکیں۔ اس نے دھرتی کے اوپر سے گزرتے موسموں کو خاموشی سے دیکھا اور ان سارے مناظر کو وِساکھ میں قید کر لیا۔ سعید اختر کی شاعری ان تمام خوشیوں کی ضامن ہے جو کبھی اس بستی کی سنہری زمینوں پر منائی گئیں۔ جہاں کبھی محبت، لگن اور عقیدت کے جذبے کاشت کیے گئے۔

تیڈا اوسبہ، سکوَت سانگھے
تیڈی بُدھ مت، پرم پریت
تیڈے جن دھن، کھیڈ اں میلے
تیڈی مَد قدیم دی رِیت
تیڈے جھمریں' ڈھول ڈھمکے
تیڈے نچدے ٹپدے مِیت
تیڈے سہرے، میندھیاں باٹن
تیڈے گھڑی گھڑولے گیت
آکھ ڈِتو نے سب پلیت!!!

بلاشبہ وہ ان تمام مظالم کی چشم دید گواہ بنیں جو اس بستی پر ڈھائے گئے تھے۔

کیندے ماس کوں رت اچ بوڑ کے
تن دا بت ڈھہاون سوکھا ہِ
لال متام کھنڈاون سوکھا ہِ
ادھ ادھورے چن دی سِک اِچ
پورے سجھ دا درشن کوہ کے
سجھ گرہن ورتاون سوکھا ہِ
کیندی وسدی جنت دے وِچ

تیر، سنگھولے، تیغاں چاکے

دوزخ دی سَندھ لاون سوکھے

لال متام کھنڈاون سوکھے!!!

حیرت ہے کہ اتنا کچھ لٹنے کے باوجود بھی یہ شخص ہرگز مایوس نہیں ہوا بلکہ اس کے عنوان کی تفسیر آج کی نوجوان نسل ہے جسے وہ تاکید کرتا ہے کہ ''اپنی جڑوں اور اپنی شناخت کے ساتھ سینہ تان کر چلو، یہی تمہاری اصل زندگی ہے''۔سندھ کنارے سر اٹھائے کھڑے اس شخص کو دیکھ کر یوں لگتا ہے کہ جیسے وہ یہاں صدیوں سے ایستادہ ہو۔

بھوری چڑیا پھدکتی پھدکتی سڑک کے بیچ میں آ گئی تھی۔ہم سب نے اپنی گھٹی سانسیں سندھو سے اٹھنے والی گیلی ہواؤں کے سپرد کیں اور واپس پلٹ آئے۔ ہمارا کیا تھا، ہم تو فقط تتلی کے پروں جیسے رنگ برنگے لمحات کا عکس چرانے آئے تھے، سو واپس لوٹ چلے لیکن ایک شخص ایسا ہے جو آج بھی کسی امید، کسی آس پر سندھ کنارے کھڑا پکار پکار کر یہی کہہ رہا ہے۔

اُبھے دا نہ بُوھا تک

اُبھے دی ہُن آس لہا

آپنے تن توں اُبھا دھو

لمیں دے دریا وچ دھا

ول کول سسی جیندی کر

ول کول کیچ بھمبھورَ سا

ول کول سارا سندھو

ول کول وِسری اجرک پا

....

اَسیکوُں اسلم نال ملا ڈیوو

نہ جانے وہ کیسی شام تھی۔ نہ سرد نہ گرم۔شام بھی کیا وہی جھٹ پٹے کا سمے تھا۔اندھیرا ہو جانے کے باوجود گلی میں تھوڑی بہت گہما گہمی تھی۔ میں سعید بھائی کے ہمراہ اسلم صاحب کی طرف روانہ تھا۔اسلم صاحب سے میرا قلمی تعارف تلسی داس بھاٹیہ کی مشہور نظم ’’اسیکوں سیڈا سونہڑا دیرہ ولا ڈیوؤ۔اسیکوں اسلم نال ملوا ڈیوؤ‘‘ سے کئی برس پہلے ہو چکا تھا۔اس کے علاوہ پریم پپلانی،کھتر جی اور اتل بگائی کی تحریروں میں بھی بار بار جس مسلمان ڈیرے وال کا ذکر پڑھنے کو ملتا تھا وہ اسلم صاحب ہی تھے۔اسلم صاحب آج بھی ڈیرہ وال نگر،گڑ گاؤں اور فرید آباد میں بسنے والے ہندو ڈیرہ والوں میں کافی مقبول ہیں اور ڈیرہ اسماعیل خان کے ثقافتی،لسانی اور تہذیبی سفیر کی حیثیت سے وہاں خوب جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ ٹیلی فونک گفتگو کے دوران ہم نے ان سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تو انہوں نے بخوشی اجازت دے دی۔ جب ہم اسلم صاحب کی رہائش گاہ پر پہنچے تو انہیں اپنی چھڑی تھامے بیٹھک میں منتظر پایا۔اُن کے انداز میں محبت،اپنائیت اور ایک خاص قسم کا والہانہ پن چھلک رہا تھا۔بیٹھک میں بیٹھتے ہی میری نظر سامنے کی دیوار پر ٹنگی فریم شدہ تصویر پر جا پڑی۔ کچھ پوچھنے سے پہلے ہی انہوں نے بتا دیا کہ اس یادگار تصویر میں میرے ساتھ میرے دوست ہیمراج ملہوترا کھڑے ہیں اور یہ تصویر ہندوستان میں ہیمراج کی خصوصی فرمائش پر کھنچوائی گئی تھی۔ یہ کہہ کر اسلم صاحب چائے کا آرڈر دینے کے لیے گھر کے اندر تشریف لے گئے مگر واپسی پر دو بڑی سائز کے تصویری البمز ان کے ہاتھوں میں تھے۔البم میں لگی ساری تصاویر ہندوستان یاترا سے بھری ہوئی تھیں۔وہ البم کھول کر ایک ایک تصویر کے متعلق بتانے لگے۔ ہر تصویر کے ساتھ کوئی نہ کوئی کہانی جڑی ہوئی تھی۔تصویری نمائش کے ساتھ ساتھ ہماری درخواست پر اسلم صاحب اپنے متعلق بتانے لگے ۔انہوں نے سب سے پہلے ایک گہری سانس لی،چھڑی کو مضبوطی سے تھاما اور پھر چپکے سے وقت کی گرد کو

جھاڑ کر ماضی کو لفظوں کی پوشاک پہنانے لگے۔

وہ چالیس کی دہائی میں اندرونِ شہر کی مشہور گلی سکلی گراں میں پیدا ہوئے۔ پرائمری تعلیم اسلامیہ سکول سے حاصل کرنے کے بعد 1959ء میں خالصہ سکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ زمانہ طالبعلمی کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں: ''مجھے سکول جانے کے لیے ایک پیسہ ملتا تھا، چونکہ یہ چورن اور ٹافیوں کا زمانہ نہ تھا اسی لیے گلی سکلی گراں سے میں ایک پیسے کی بھنی ہوئی دال اور مکھن لے کر سکول جایا کرتا تھا ''۔ اسلم صاحب کو 1947ء میں ڈیرہ میں لگنے والی آگ بھی اچھی طرح یاد ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب کلاں بازار کا دایاں حصہ اور بھاٹیہ بازار کی دکانوں کو کچھ شر پسندوں نے آگ لگائی تو ہندو دکاندار اپنی املاک چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ ہر طرف آگ کے شعلے، کالا دھواں اور افراتفری کا عالم تھا۔ کلاں بازار اور چوگلہ کے اردگرد بجلی کے کھمبے ٹوٹے اور تاریں بکھری پڑی تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ اس دن گلی سکلی گراں میں کچھ لوگ چارپائیاں بچھائے حالات کا جائزہ لے رہے تھے۔ اتنے میں کاواں والے ویہڑے اور گلی پونگراں کے کچھ مسلم نوجوان ہندوؤں کی جلتی دکانوں میں جا گھسے اور وہاں سے گڑ، شکر، خشک میوہ جات کی بوریاں اور کپڑوں کے تھان لوٹ کر لے آئے۔ اس دن واقعی لوٹ مچی ہوئی تھی۔ مجھے ہندوؤں کی ہجرت بھی اچھی طرح یاد ہے کہ جب وہ توپانوالہ دروازے اور الحبیب ہوٹل والی گلی سے جہازوں والی پریڈ گراؤنڈ میں اکھٹے ہوئے اور پھر وہیں سے روتے دھوتے ہندوستان کی طرف چل نکلے دوسری طرف ہندوستان سے آنے والے مہاجرین کے قافلے دھڑا دھڑ پہنچنے لگے اور اس طرح پاکستان بن گیا۔ حالات آہستہ آہستہ معمول پر آنے لگے مگر شہر کی سیاست میں جو خلا ہندو چھوڑ گئے تھے وہ کبھی بھی پر نہ کیا جا سکا نتیجتاً ڈیرہ کی سیاست پر باہر سے آنے والے لوگ قابض ہو گئے اور ہنوز یہ سلسلہ جاری وساری ہے۔

تقسیم سے پہلے شہر کے بہت سے ہندو میرے والد کے قریبی دوست تھے، اسی لیے مجھے ان سے ملنے کا نہ صرف اشتیاق تھا بلکہ یہی اشتیاق جنون کی صورت مجھے تین بار (1964ء، 1988ء اور 2001ء) ہندوستان لے گیا۔ حیرت انگیز طور پر ہر بار مجھے وہاں سے ڈھیروں محبتیں، بے پناہ پیار اور اپنائیتیں ملیں، اب وہی یادیں میری بقیہ زندگی کا سرمایہ ہیں۔

جب میں پہلی بار دسمبر 1964ء میں ہندوستان جانے لگا تو دوستوں یاروں نے بہت منع کیا کہ وہاں مت جاؤ، پتہ نہیں وہ لوگ تمہارے ساتھ کیسا سلوک کریں گے۔ میں دوستوں کی باتوں سے تھوڑا بہت گھبرا گیا، کیونکہ جس طریقے سے ہم نے انہیں اپنے علاقے سے نکالا تھا عین ممکن تھا کہ وہ ہم سے نفرت کرتے ہوں گے اور ہمارا نام سننا تک گوارہ نہ کریں گے، مگر چونکہ میں جوان تھا، ایڈونچرسٹ تھا، اسی لیے ہمت کی اور اپنے والد کے زمانے کی دوست فیملی (ملہوترہ فیملی) سے رابطہ کر کے انہیں اپنے پروگرام سے آگاہ کر دیا۔ میرے پہنچنے سے پہلے ہی وہاں کے مقامی اخبار ڈیرے وال سندیش جسے اب ہند سندیش کہا جاتا ہے میں جلی سرخیوں کے ساتھ کئی دنوں تک یہ خبر چھپتی رہی کہ ہماری جنم بھومی ڈیرہ اسماعیل خان سے ہمارا مہمان محمد اسلم ہم سب سے ملنے کے لیے خصوصی طور پر دہلی تشریف لا رہا ہے۔ ڈیرے وال سندیش کے چیف ایڈیٹر سیٹھی صاحب تھے جو ڈیرہ میں پلازہ سینما کے بھی مالک تھے۔ میں فوکر طیارے کے ذریعے جب دہلی ائیر پورٹ پر اترا تو اپنے آپ کو تھوڑا سا غیر محفوظ محسوس کیا لیکن جب عمارت کی خارجی سمت نگاہ دوڑائی تو وہاں ہیم راج کو کھڑے پایا۔ ہیم راج نے جب دور سے ہاتھ اونچا کر کے ہلایا تو کچھ اطمینان سا ہوا۔ ائیر پورٹ پر سامان کی تلاشی لیتے وقت کسٹم آفیسر جو کہ سردار جی تھے مجھ سے پوچھنے لگے کہ کہاں سے آئے ہو؟ میں نے کہا ڈیرہ سے۔ کون سا ڈیرہ؟۔ ڈیرہ اسماعیل خان۔ یہ سننا تھا کہ اس نے میرا اٹیچی کیس بنا دیکھے بند کیا اور خوشی سے سرشار لہجے میں بولا۔ تم میرے وطن سے آئے ہو۔ میرے ساتھ میرے گھر چلو، تم آج میرے مہمان ہو۔ میں نے سردار جی کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ میرا دوست ہیم راج ملہوترہ مجھے لینے کے لیے ایئر پورٹ پر پہلے ہی پہنچ چکا ہے۔ ہیم راج چونکہ دہلی میں کونسلر تھے اسی لیے خاصے جانے پہچانے تھے۔ ایئر پورٹ سے باہر نکلتے ہی ہیم راج نے مجھے سختی سے دبوچ لیا، اس کے ہمراہ ایک اور شخص بھی تھا جس کا چہرہ مجھے کچھ جانا پہچانا لگا۔ میں نے پوچھا کہ آپ وہی ہوناں جس کی گھاس منڈی ڈیرہ میں ہارڈ ویئر کی دکان ہوا کرتی تھی، اور واقعی وہ وہی شخص نکلا مگر میں اب اس کا نام بھول گیا ہوں، خیر سب نے مجھے گلے لگایا، گیندے کے پھولوں کے ہار پہنائے اور ہم سب ایئر پورٹ سے باہر نکل آئے۔ میں اس سفر میں ہیم راج کے گھر وی آئی پی پروٹوکول کے ساتھ ٹھہرا رہا، اس دوران میں جہاں جہاں بھی گیا مجھے بے

پناہ محبتیں اور چاہتیں ملیں۔ مجھے سیوا سمتی کانفرنس میں بھی شرکت کی دعوت دی گئی جہاں پر پہنچتے ہی سب شرکاء تعظیماً دونوں ہاتھ جوڑ کر میرے استقبال کیلئے کھڑے ہو گئے۔ ہر کوئی اخلاص، عاجزی اور انکساری سے ملا۔ مجھے بتایا گیا کہ جب ہم سب ڈیرے وال شرناتھیوں (مہاجرین) کی شکل میں دہلی پہنچے تھے تو یہاں پر ہمارا ایک کیمپ لگایا گیا تھا اور اسی کیمپ کے اردگرد ہمیں زمینیں الاٹ کی گئی تھیں۔ پنڈت نہرو نے ہمارے کیمپوں پر آ کر خصوصی اعلان کیا تھا کہ آپ سب مل کر اس علاقے کو آباد کرو اور اپنی مرضی سے ان کے نام رکھو۔ ہم سب نے مل کر اپنے نئے علاقے کا نام ڈیرے وال نگر رکھا۔ دیوی دیال جی نے یہاں پر بلوٹ میں ستی کیول رام کی طرز کا تھلہ تعمیر کروایا، ڈی آئی خان ہائی سکول کھولا گیا اور سوہن حلوے اور ڈولی والی روٹی کی دکان بھی کھولی گئی۔ کچھ ڈیرہ وال اپنے پلاٹس فروخت کر کے گُڑ گاؤں اور کچھ فرید آباد میں بھی جا بسے، لیکن کسی نے بھی ڈیرہ وال نگر سے اپنا رابطہ ٹوٹنے نہ دیا۔ آج بھی سارے ڈیرہ وال 13 اپریل کو ڈیرہ وال نگر میں کیول رام تھلے پر اکھٹے ہوتے ہیں اور حاضری دیتے ہیں۔

پریم ناتھ پپلانی جی کو جب میری آمد کی اطلاع ملی تو وہ گُڑ گاؤں سے خصوصی طور پر مجھ سے ملنے کے لیے آئے۔ ہیمراج نے میری خواہش پر ڈاکٹر جے دیال سے بھی ملوایا۔ مجھے یاد ہے جب میں چھوٹا بچہ تھا تو ڈاکٹر جے دیال کے والد کا سٹی تھانے کے عقب میں ہسپتال ہوا کرتا تھا، جسے بعد میں ڈاکٹر جے دیال نے چلایا۔ مجھے جب کبھی کھانسی نزلہ اور زکام ہو جاتا تو والد صاحب ڈاکٹر جے دیال کے پاس لے جایا کرتے۔ ڈاکٹر صاحب بہت لائق فائق، خداترس اور پیشے کے لحاظ سے واقعی گریٹ انسان تھے۔ وہ سب مچ کے مسیحا تھے۔ اپنا کلینک بند کرنے کے بعد جب سائیکل پر گھر جانے لگتے تو راستے میں کوئی نہ کوئی مریض انہیں روک لیا کرتا۔ وہ ہرگز برا نہ مناتے بلکہ سائیکل سے اتر کر مریض کو دیکھتے، مفت نسخہ لکھتے اور ہدایت کرتے کہ میرے کلینک جا کر کمپاؤنڈر کو یہ نسخہ دکھا دو اور اس سے مفت دوائی بھی لے لو، یہ کہتے ہی اپنی سائیکل پر بیٹھ کر آگے چل پڑتے تھے۔ اسلم چکڑیال بتاتے ہیں کہ جب ڈاکٹر جے دیال ان سے ملنے کیلئے آئے تو وہ بہت زیادہ لاغر، کمزور اور ضعیف ہو چکے تھے مگر ان کا لہجہ اسی طرح بارعب اور گرجدار تھا۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا کہ ہجرت کے بعد بھی آپ کا وہی معمول رہا جیسا ڈیرہ میں تھا؟۔ وہ

میرے سوال کوفوراً بھانپ گئے اور بولے۔ہاں بالکل۔یہاں پر بھی میرا وہی اسٹائل رہا، اگر چہ سائیکل کی جگہ کار نے لے لی مگر میں نے مفت میں مریض دیکھنا بند نہ کیے۔ڈاکٹر جے دیال بتانے لگے کہ ڈیرہ والوں نے انہیں بہت زیادہ پیار دیا،لوگ مجھ سے اتنی زیادہ محبت کرتے تھے کہ میں بتا نہیں سکتا۔ڈاکٹر صاحب بات بات پر نواب ڈیرہ کو یاد کرتے اور کہتے۔نواب صاحب سچ مچ کے دیوتا تھے،لیکن اسلم تم بتاؤ میں وہاں کب تک ٹھہرتا؟۔مجبوراً مجھے رات کے اندھیرے میں لیہ سے ہندوستان آنا پڑا۔اسلم! کیا میکوں دیرے وال اجن تئیں یاد کریندن؟۔یہ اتنا اوکھا سوال تھا کہ اسلم کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ڈاکٹر صیب! دیرے وال بھلا تو یکوں کیویں بھل سکدن ،تساں اُنہاں دے دِلاں وچ وسدے ہاوے۔یہ سن کر ڈاکٹر جے دیال زاروقطار رونے لگے۔اسلم چکڑیال بتاتے ہیں کہ یہ ایک ایسا جذباتی منظر تھا کہ جسے لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں۔اس قسم کے نہ جانے اور کتنے جذباتی مناظر دیکھنے کو ملے کہ جس نے مجھے اندر سے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ہیمراج کے گھر میں جب میرا پہلا دن تھا تو اس کی بچیاں سکول سے گھر آئیں اور فرفر سرائیکی بولنے لگیں۔میں نے حیران ہو کر ہیمراج سے کہا:اوئے ہیمراج،کیا بات ہے یار۔تیڈے بال تاں ماں بولی الیندن۔یہ سنتے ہی ہیمراج فخریہ انداز سے بولا:''اوئے اسلم!اساں آپڑا سب کجھ تو یکوں ڈے آئے ہیں۔آپڑا مال متاع،کاروبار، دکاناں،زمیناں، جائیداداں یارا یہو ہک زبان تاں آپڑے نال گھن آئے ہیں،اے تاں ہن سیڈے کول نہ کھسو''۔اپنی مٹی اور زبان سے اندھا عشق کرنے والا میرا دوست ہیمراج اپنی بے پناہ صلاحیتوں کے باعث دہلی کا کونسلر بنا۔اس کا بیٹا انیل ملہوترا آج کل دہلی میں بی جے پی کا لیڈر رہے۔

اخبار میں میری آمد کی خبر پڑھ کر کئی ڈیرے والوں نے مجھ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ایک شرنارتھی مجھے خصوصی طور پر ملنے آیا۔وہ تھوڑا اونچا سنتا تھا۔آتے ہی پوچھا، مجھے پہچانا؟۔میں نے انکار کیا تو بولا۔''میں بے وطن دیرے وال ہاں تے پچھلے کئی سالاں کول آپڑے دیرے کوں ڈیکھن کیتے سِکدا وداں'' یہ سب کہتے ہی وہ مجھے بے اختیار چومنے لگا۔میں نے اس سے اس کا نام پوچھا تو وہ زاروقطار روتے ہوئے بولا:''میڈا کوئی ناں کوئنی۔میں ہک شرنارتی ہاں۔میں بے وطن ہاں تے بے وطناں دا نہ کوئی وطن

ہوندے تے نہ کوئی ناں''۔ چلتے پھرتے لوگوں کے درمیان وقت نے اسے اجنبی بنا کر رکھ دیا تھا۔

ایک بزرگ شخص نے ہیمراج کو فون کیا اور کہا کہ وہ اسلم سے ملنا چاہتے ہیں۔ ہیمراج نے مجھے کہا چونکہ وہ بوڑھے آدمی ہیں اسی لیے ہم دونوں خود اس سے ملنے جائیں گے۔ ہیمراج نے اس سے وقت لیا اور ہم دونوں اس کے ہاں چل پڑے۔ اس بزرگ کی دہلی میں دکان تھی جہاں پر وہ نوجوان طالب علموں کو ٹائپ رائٹرز کے ذریعے ٹائپنگ اور شارٹ ہینڈ کا کورس کرواتے تھے۔ اس شخص نے ایک کلاہ پہنا ہوا تھا۔ جب میں اس کی دکان کے اندر پہنچا تو وہ میرے کندھوں کو پکڑ کر کھڑا ہو گیا اور ایک عجیب سی کیفیت سے بے اختیار کہنے لگا: ''توں میڈے پھلاں دے سہرے کول آیا ہیں۔ توں میڈی مٹی کول آیا ہیں۔ میکوں ڈسا میڈا شہر کیویں ھِ؟ اوندے لوک کیویں ہن۔ کیا اسیکوں کڈھ کے خوش ہن؟۔ کیا مو نجھے تاں نیں؟۔ شالا ہمیش خوش راہون۔ شالا وسدے راہون، ابادراہون''۔ اس شخص کی باتوں میں نا قابل بیان اذیت چھپی ہوئی تھی جس سے میرے اندر دکھ، شرم کا ایک عجیب احساس پیدا ہوا اور کچھ ایسی کپکپی طاری ہوئی کہ چندلمحوں کیلئے میں نے اپنے آپ کو شاک اور بے بسی کی حالت میں محسوس کیا، بعد میں وہ مجھے اپنے بارے میں بتانے لگا۔ اس نے کچھ اس عاجزی سے مجھے رات کے کھانے کی دعوت دی کہ میں باوجود انکار کے اسے ٹال نہ سکا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ مجھے اپنے ذاتی بیڈ روم میں لے گیا۔ کمرے کی دیوار پر ایک بڑے سے فریم میں تصویر ٹنگی ہوئی تھی۔ تصویر میں وہی شخص سر پر رومال لپیٹے کسی قبر کے سرہانے بیٹھا دعا مانگ رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ یہ کس جگہ کی تصویر ہے؟۔ وہ بولا خود پہچانو۔ جب میں نہ پہچان پایا تو اس نے کہا کہ یہ ڈیرہ کے قبرستان کی تصویر ہے اور یہ قبر میرے عزیز دوست سیف اللہ خواجک زئی کی ہے۔ جب مجھے پتہ چلا کہ اس کا انتقال ہو چکا ہے تو ایک دن چپکے سے ڈیرہ آیا، اس کے ورثاء سے ملا، قبرستان گیا اور دوست کی قبر پر جا کر دعا مانگی۔ یہ تصویر اسی یادگار لمحے کی ایک انمول نشانی ہے۔ تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے وہ حسرت بھری نگاہوں سے بولا: اسلم کاش اے مٹی میکوں وی نصیب تھیندی۔ حالانکہ وہ ہندو تھا لیکن پتہ نہیں اس نے یہ سب کیوں کہا تھا۔ میں اس رات اداس ہو کر اس کے گھر سے نکلا۔ دہلی کے سفر میں میری ملاقات تلسی داس بھاٹیہ سے بھی ہوئی۔ تلسی داس بھاٹیہ اور ستیش

بھاٹیہ دونوں بھائی تھے۔تلسی داس ڈیرہ کے معروف شاعر تھے۔انہوں نے کئی غزلیں اور شاہکار نظمیں لکھیں۔1951ء میں ان کی لکھی ایک نظم''اسیکوں سیڈا دیرہ ولا ڈیوؤ'' کافی مقبول ہوئی۔وہ لکھتے ہیں۔اسیکوں سیڈا دیرہ ولا ڈیوو۔رحمت دامینہ وسا ڈیوو۔☆ سندھ دریا تھاں ٹھاٹھاں مارے۔بالو دا تھلہ نالے بن دے نظارے۔او سونہڑا نظارہ ول ڈکھا ڈیوو۔اسیکوں سیڈا دیرہ ولا ڈیوو۔☆ دیرے شہر دا مٹھا پانی۔مٹھے لوک ہن دلبر جانی۔اسیکوں اسلم نام ملا ڈیوو۔اسیکوں سیڈا دیرہ ولا ڈیوو۔☆ پستے، بدام تے چلغوزے۔پیلھوں، پنڈ تے خربوزے۔گھیو خرسانی منگوا ڈیوو۔اسیکوں سیڈا دیرہ ولا ڈیوو۔☆ ڈوں تصیلاں ٹانک کلاچی۔بنوں توں آندے ہین بنوچی۔ڈھول مریالی توں منگوا ڈیوو۔اسیکوں سیڈا دیرہ ولا ڈیوو۔☆ خالصہ، اسلامی برادری سکول۔مشن ہائی سب توں مقبول۔اسیکوں ایلا وادی ملوا ڈیوو۔اسیکوں سیڈا دیرہ ولا ڈیوو۔☆ بھاٹی سڈیندن ہین اتھاں راجے۔رام لیلا دے وجدے ہین واجے۔سونہڑا دربار ول سجا ڈیوو۔اسیکوں سیڈا دیرہ ولا ڈیوو۔☆ تُلسی اتھوں نکل کے آیا۔چار بھراواں مل کم چلایا۔بیڑی ماچس نال جلا ڈیوو۔اسیکوں سیڈا دیرہ ولا ڈیوو۔شاعر، تُلسی داس بھاٹیہ۔(کملانگر، دہلی، 1951)۔

ہندوستان پہنچ کر تلسی داس نے بیڑی کا کارخانہ لگایا۔ستیش بھاٹیہ ولایت چلے گئے جبکہ تلسی داس دہلی میں رہے۔مجھے جب دوسری بار 1988ء میں ہندوستان جانے کا اتفاق ہوا تو اس وقت بھی کئی ہندو ڈیرے وال ملنے کے لیے آئے۔ایک ہیڈ ماسٹر صاحب مجھے ملے اور پوچھا کہ تم کہاں سے آئے ہو؟۔میں بولا ڈیرہ سے۔کیا خاص ڈیرے وال ہو؟۔میرا مطلب تقسیم سے پہلے بھی وہیں پر رہتے تھے یا ہندوستان سے وہاں گئے ہو۔میں بولا کہ نہیں میں خاص ڈیرے وال ہوں، میرا نام اسلم ہے، میرا جنم خاص ڈیرے کا ہے اور میرے باپ دادا سمیت ساتوں پشتیں ڈیرے وال ہیں۔یہ سن کر وہ مجھ سے لپٹ لپٹ کر رونے لگا۔میں نے پوچھا کہ آپ روتے کیوں ہو تو وہ بولا''میں ناں روندا بلکہ اے میڈی چالی سالاں دی بے وطنی روندی پئی ھِ۔اسلم توں ڈسا قدرت میکوں میڈی چالی سالاں دی محرومیاں دا کیرا صلہ ڈیسی؟۔اوئے اسلم توں بے وطن نئیں تھیا۔کاش توں بے وطن تھیندا تاں تیکوں پتہ لگدا جو بے وطنی کیشے ہوندی ھ''۔

ایک دن میں ہیمراج کے ساتھ بازار میں گھوم پھر رہا تھا کہ وہ مجھے اچانک ایک جیولری شاپ پر لے گئے اور وہاں پہنچ کر سنار سے میرا تعارف کچھ ان الفاظ میں کروایا: ''اے دیرے کول آئے ہوئے اسیڈے خاصو خاص مہمان ہن''۔ یہ سننا تھا کہ سنار سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا اور قریب آ کر بے اختیار میرے ہاتھ پاؤں چومنے لگا۔ اس نے اپنی دکان میں بیٹھے ایک نوجوان لڑکے کو جو غالباً اس کا بیٹا تھا کہا۔ اے شخص میڈے وطن کول آئے، اٹھ کے متھا ٹیک تے بھج کے ہک ٹھڈی بوتل گھن آ۔ جب وہ جھکنے لگا تو میں نے اسے پیار سے منع کر دیا۔ وہ بوتل لینے چلا گیا۔ بوتل آ گئی تو سنار نے کہا اسے میرے سامنے بیٹھ کر پیو۔ میں بوتل پینے لگا، جیسے ہی بوتل آدھی ختم ہوئی تو اس نے کہا اب اسے مجھے دو۔ میں حیرانگی سے ہیمراج کی طرف دیکھنے لگا وہ بھی تھوڑا بہت پریشان ہوا کہ آخر معاملہ کیا ہے۔ جیسے ہی بوتل سنار کے ہاتھوں میں آئی اس نے فوراً اسے منہ سے لگایا اور غٹا غٹ ساری بوتل پی گیا۔ سمجھ نہیں آتا کہ اس اندھی عقیدت کو کیا نام دوں؟۔ مٹی کی محبت یا دھرتی سے پاگل پن کی حد تک عشق۔ جنون کی حد تک عشق کے قائل۔ موم کی طرح مٹی کی محبت میں پگھلتے وجود۔ میں نے بہت سے محبت کرنے والے دیکھے ہیں لیکن عشق کی اتنی خوبصورت شکلیں کہیں نہیں دیکھیں۔ واقعی اپنائیت، رواداری اور اپنی مٹی سے جڑی روایات کا احترام و تکریم کرنے والے۔ پریت اور مٹھاس کی ڈوری سے بندھے ہندو ڈیرے والوں میں کئی ایسی خوبیاں تھیں کہ جو انہیں باقی ماندہ ہندوستانیوں سے ممتاز کرتی تھیں۔ میرے سفر میں میرا دوست ہیمراج ملہوترہ ہر وقت میرے ساتھ ساتھ رہا۔ دہلی، فرید آباد، گُڑ گاؤں، آگرہ، اجمیر شریف اور نہ جانے کہاں کہاں کا سفر ہم دونوں نے اکھٹے کیا۔ لیکن میرا آخری وزٹ جو 2001ء میں ہوا اس وقت ہیمراج کی صرف یادیں میرے ہمراہ تھیں کیونکہ وہ کافی عرصہ پہلے نہر میں دھاونی لگاتے ہوئے ڈوب کر ہم سے بہت دور چلا گیا تھا۔ مگر مجھے آج بھی لگتا ہے کہ وہ یہیں کہیں میرے پاس بیٹھا ہوا ہو۔ اس کی یادیں، اس کی ذات سے وابستہ اس کی میٹھی میٹھی مزے دار باتیں مجھے آج بھی سرور دیتی ہیں۔ واقعی محبت کی فصل اگر من کے اندر اگنے لگے تو پریت کا پھل خود بخود پک کر زمین پر گر جاتا ہے۔ وہ عظیم سرائیکی دھرتی کہ جسے سندھو کے پوتر پانیوں سے سینچا گیا تھا جس کا ذرہ ذرہ محبت سے منور اور عشق سے تاباں تھا۔ جس کسی نے بھی اس مٹی کا رزق کھایا۔ جس کسی نے

بھی اس کا پانی پیا، وہ کہیں بھی چلا گیا اس کے سحر سے بچ نہ سکا۔ اس نے اس مٹی کو اون کیا، اس کی لاج رکھی، اس سے عشق کیا اور اس کی ست رنگی تہذیبی ثقافت اور شیریں زبان کو اپنے خون کے اندر شامل کیا بلکہ اپنی اگلی نسلوں تک اس سلسلے کو چلایا۔ اس مٹی کی تاثیر ہی کچھ ایسی ہے کہ نفرتوں کی آگ، تعصب کا اٹھتا دھواں، بے وطنی اور بے سروسامانی کی ہجرت بھی اس کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔ سچ ہے کہ مٹی اور زبان کی محبت کبھی فنا نہیں ہوا کرتی بلکہ یہ اپنے دشمنوں کو فنا کر کے رکھ دیا کرتی ہے۔

ہیمراج نے سچ کہا تھا۔ ''اوئے اسلم! اساں آپڑا سب کجھ تو یکوں ڈے آئے ہیں۔ آپڑا مال و متاع، آپڑے کاروبار، دکاناں، زمیناں، آپڑیاں جائیداداں تک آپڑا سب کجھ تو یڈ ے حوالے کر آئے ہیں۔ یارا ایہو ہکو زبان تاں نال گھن آئے ہیں، اے تاں سیڈے کول نہ کھسو''۔

....

لوہے دا دروازہ، کھیری دی دُکان

یہ 1989ء کا ایک سرد دن تھا، ڈیرہ آٹو اسٹور کے سامنے یکا یک ایک گاڑی رکی۔ گاڑی کے اندر بیٹھے مرد اور عورت نے شیشے کے پار کا منظر دیکھا اور دونوں گاڑی سے باہر نکل آئے۔ مرد نے پینٹ شرٹ جبکہ عورت نے شلوار قمیض پہن رکھی تھی مگر ماتھے پر تلک کی وجہ سے وہ غیر مسلم لگتی تھی۔ مرد کے ہاتھ میں کیمرہ تھا، وہ سمٹی دھوپ میں اردگرد پھیلی زندگی اور چلتے پھرتے ماحول کو کیمرے کی آنکھ میں اتارنے لگا جبکہ عورت اشتیاق بھری نظروں سے اردگرد کے ماحول کو تکنے لگی۔ وہ عورت چلتی چلتی ڈیرہ آٹو اسٹور کے سامنے آن کھڑی ہوئی اور دکان پر لگے سائن بورڈ کو توجہ سے پڑھنے لگی۔ عورت کو دکان کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ کر دکان کا مالک (محمد اسلم چکڑیال) باہر نکلا اور اس سے اردو میں ہم کلام ہوا۔ اسلم صاحب کے سوال کا جواب اردو میں دینے کی بجائے وہ عورت ٹھیٹھ سرائیکی میں بولی۔ ''میں ہندوستان کول آئی ہاں، پکی دیرے وال ہاں، میڈی اِتھیئں دی پیدائش ھِ تے میں آپڑا گھر ڈیکھن کیتے آئی ہاں، مگر میکوں آپڑا گھر نیں پیا لبھدا، میڈی کجھ مدد کرو''۔ میڈا ناں محمد اسلم ھِ تے میں تیڈی ضرور مدد کریساں۔ اسلم صاحب کے لہجے کی سچائی جانتے ہی اُس عورت نے تصویر کشی میں مصروف اپنے خاوند کو آواز دے کر اپنے پاس بلایا۔ اسلم صاحب ان دونوں کو اپنی دکان کے اندر لے گئے۔ سب سے پہلے اُن کی خاطر مدارت کی، اس کے بعد اپنا تعارف کروایا اور اس کے بعد ان سے بات چیت شروع ہوگئی۔ سب سے پہلے مرد نے اپنا مختصر تعارف کروایا۔

میڈا ناں ہرِیش گرور ھ، میڈی پیدائش خاص پہاڑ پور دی ھ، میں پیشے دے لحاظ نال ایم بی ایس گولڈ میڈلسٹ ڈاکٹر ہاں، ہارٹ اسپیشلسٹ ہاں تے سر گنگا رام ہسپتال (دہلی) اِچ کنسلٹنٹ ہاں۔ میڈی پتنی وی ایم بی بی ایس ھِ۔ اساڈا دہلی دے راجندر نگر اِچ آپڑا ذاتی کلینک وی ھِ۔ اساں لہور تک

انٹرنیشنل سیمینار دے سلسلے اچ پاکستان آئے ہوئے ہیں تے کل سرکار دی خصوصی اجازت گھن تے لہور کول ہک ڈِیں کیتے سدھا دیرہ آئے ہیں۔ اساں اِتھاں ڈاکٹر فتح اللہ کول ٹِکے پئے ہیں۔ میڈی پتنی خاص دیرے وال ھِ تے آپڑی جنم بھومی ڈیکھن ایندی آخری اِکشا ہئی۔ اسلم صاحب کے استفسار پر عورت نے بتایا کہ اُس کے پِتا جی ڈگری کالج ڈیرہ میں اکنامکس کے پروفیسر تھے۔ تقسیم کے بعد ہمارا گھرانہ ہندوستان ہجرت کر گیا تھا۔ اس وقت میں سکول میں پڑھتی تھی لیکن مجھے ابھی تک اپنا گھر اور محلّہ یاد ہے۔ وہ چہک چہک کر سرائیکی بولنے لگی تھی۔ جیڑی گلی اِچ میڈا گھر ہائی اُتھاں لوہے دا دروازہ ہئی تے بازار دے سرے دے اُتے کھیری (دودھ دہی) دی دکان وی ہئی۔ میکوں بس اتنا یاد ھِ۔

ٹھیک ہے جس مٹی کی خوشبو اور کشش آپ کو اتنی دور سے کھینچ لائی ہے تو میں ایک مسلمان ہونے کے ناطے آپ کی ہر ممکن مدد کروں گا۔ یہ کہتے ہی اسلم صاحب ایک عزمِ مصمم سے اٹھے اور ان سب کے ہمراہ گاڑی میں بیٹھ گئے۔ اسلم صاحب کو اس جوڑے کی یہ ادا بہت بھائی کہ ہائی کوالیفائیڈ ہونے کے باوجود وہ ٹھیٹھ سرائیکی میں ہر بات کا جواب دیتے رہے۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی وہ عورت بولی۔ میکوں سب کول پہلے زنانہ ہسپتال دکھاؤ، زنانہ ہسپتال دے وارڈ اچ میں جمی ہم۔ اس کی فرمائش پر گاڑی کا رخ ہسپتال کی طرف موڑ دیا گیا۔ ہسپتال پہنچتے ہی وہاں عملے نے حد سے زیادہ تعاون کیا اور وہاں پر موجود لیڈی ڈاکٹرز انتہائی خلوص اور محبت سے ملیں۔ اسے اپنا وہ وارڈ بھی دکھایا گیا جہاں اس کی پیدائش ہوئی تھی۔ اس موقع پر تصویریں کھینچی گئیں اور آخر کار سب باہر نکل آئے۔

ہسپتال دیکھنے کے بعد گاڑی جیسے ہی فقیرنی گیٹ کے اندر داخل ہوئی تو ڈاکٹر ہریش نے ہاتھ کے اشارے سے گاڑی رکوائی اور لپک کر وی بی سکول کے آہنی گیٹ کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ یہی میرا سکول ہے، میں یہیں پڑھتا تھا۔ سب لوگ سکول کے اندر داخل ہوئے اور پرنسپل سے ملے۔ ڈاکٹر ہریش کی خصوصی فرمائش پر اُسے سکول کا ہاسٹل دکھایا گیا۔ ایک بوسیدہ کمرے کے سامنے جا کر ڈاکٹر ہریش خوشی سے چلا اٹھا۔ یہی میرا کمرہ تھا، جب میں پہاڑ پور سے ڈیرہ پڑھنے آتا تھا تو اسی کمرے میں آ کر ٹھہرتا تھا۔ یہاں قریب ہی ایک میٹھے پانی کا کنواں بھی ہوا کرتا تھا۔ میں اس کا پانی بڑے شوق سے پیا کرتا تھا۔ مگر اب نہ

کنواں باقی رہا تھا نہ ہی ہاسٹل کے کمرے اپنی اصل حالت میں باقی بچے تھے۔ڈاکٹر ہریش نے ایک گہری سانس لے کر بہت سی یادوں کو اپنے اندر اتارا۔

سکول سے باہر نکلتے ہی کچھ نشانیوں اور چند ناموں کو ذہن نشین کرتے ہوئے اسلم صاحب منزل مقصود کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔گاڑی میں بیٹھتے ہوئے عورت نے ایک بار پھر یاد دھانی کروائی۔"لوہے دا دروازہ ،کھیری دی دکان"۔اسلم نے سر ہلا کر تصدیق کی اور اپنی دانست میں انہیں محلّہ حیات اللہ کی گلی کوچوں میں پھرانے لگے۔محلّہ حیات اللہ کا گورنمنٹ سکول نمبرا ،چیتر سین (پاکستان کے سفیر) کا گھر اور جنرل وی پی ملک (چیف آف آرمی اسٹاف آف انڈیا) کا گھر بھی دکھایا گیا۔بازار کی رونقوں اور ہجوم کی پشت سے لپٹی ،خلوص،اپنائیت اور رواداری کے ریشم سے بندھی ماضی کی گلیاں، ہمیشہ کی طرح آج بھی ٹھنڈی محسوس ہو رہی تھیں۔ان تپلی گلیوں میں جہاں مکان اونچے ہوتے چلے جا رہے تھے،اُن کا سایہ وہاں سورج کی تمازتوں کو زیادہ دیر ٹھہرنے نہیں دیتا تھا۔بدلتے زمانے نے کچھ نہ کچھ اثر بہرحال ڈالا تھا۔کہیں نہ کہیں نئی تعمیر کے نمونے بھی نظر آ رہے تھے مگر ماحول میں پرانی خوبصورتی آج بھی پہلے کی طرح جھلک رہی تھی ۔چونے کے پتھروں سے تراشی دیواریں،دہلیزیں،لکڑی کے بھاری بھرکم دروازے،اونچی اونچی ماڑیاں ابھی تک سلامت تھیں ۔باہر کی جانب کھلنے والے روشندان اور دروازوں میں لگی آہنی گرلیں۔شاید غیر محفوظ ہونے کا اندیشہ ان گلی کوچوں پر ابھی تک حاوی تھا۔

سب کچھ اشتیاق بھری نظروں سے دیکھنے کے بعد اس نے دکھ بھری آواز میں کہا۔اِنہاں گلیاں اچ میڈا گھر کونا ہئی۔لوہے دا دروازہ،کھیر دی دکان، وہ پھر سے ہم کلام ہوئی۔یہ واحد نشانی تھی جو اس کی یادوں کے تہہ خانے میں ابھی تک اپنا وجود برقرار رکھے ہوئے تھی ۔وجود رکھنے والی نشانیوں کا کیا ہے؟۔ آج ہیں کل نہیں ۔کچھ وجود بظاہر نظر نہیں آتے مگر ان کا طاقتور احساس ماحول پر پوری طرح حاوی رہتا ہے۔آج بھی علاقہ وہی تھا لیکن کچھ تبدیلیاں آ چکی تھیں،تبھی تو وہ اپنا گھر پہچاننے میں بھی دِقت محسوس کر رہی تھی۔تنگ گلیوں سے بچتے بچاتے گاڑی بھاٹیہ بازار کی طرف رینگنے لگی۔کچھ ہلکی سی دھوپ نکل آنے سے روشنی اور دھوپ بھلی لگ رہی تھی۔ بھاٹیہ بازار کی گہما گہمیاں اپنے عروج پر تھیں۔دکانوں کے باہر

پھٹوں پر اہتمام سے سجا سامان، پھل فروٹ بیچنے والوں کے ٹھیلوں سے لے کر پلاسٹک کی اشیاء اور چپل بیچنے والوں تک، کپڑے کی دکانوں سے لے کر سائیکل وموٹر سائیکل کے پنکچر لگانے والوں تک اور پنساری کی دکانوں سے جنرل اسٹوروں تک، ہر قسم کی اشیاء بیچنے والوں کا ایک سیلاب امڈ آیا تھا۔ دکانوں کے اوپر بنی لکڑی کی ماڑیاں اور ان کے آگے جھکے چھجے، نہ جانے کتنے عشروں سے اسی حالت میں تھے۔ یہ سب کچھ یہاں ہمیشہ سے موجود تھا۔ بہت پہلے جب وہ بچی تھی تب بھی یہ بازار ایسا ہی تھا، گلیاں بھی وہی تھیں ہاں مگر نام تبدیل ہو چکے تھے، لیبل بدلے جا چکے تھے۔ گاڑی کو کسی دکان کے سامنے پارک کر دیا گیا۔ دکان کا مالک اپنی دکان کے سامنے یوں گاڑی کھڑا کرنے پر معترض ضرور ہوتا اگر اس میں بیٹھی خاتون اسے بہت شاندار اور پروقار محسوس نہ ہوتیں۔ وہ اسلم صاحب کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے من ہی من میں بولے جا رہی تھی: لوہے دا دروازہ، کھیری دی دکان۔ اس منظر کو پچاس سال ہونے کو آئے تھے مگر وہ ابھی تک اس کے فلیش بیک میں زندہ تھا۔ اس نے بے چین ہو کر اسلم صاحب کو دیکھا، وہ انہیں بتانا چاہ رہی تھی کہ گھر یہیں کہیں آس پاس ہی ہونا چاہیے۔ آخر کار اس گتھی کو سلجھانے کیلئے اسلم صاحب ماسٹر سدو ٹیلر کی دکان پر پہنچے اور ان سے کہا کہ وہ اپنے تجربے کی بنیاد پر گھر تلاش کرنے میں اُن کی مدد کریں۔ ماسٹر سدو نے اپنی یاداشت پر زور دیتے ہوئے کہا: منگلا میڈیکل ہال دے سامنے آلی گلی اِچ لوہے دا دروازہ ہوندا ہئی، ایکوں اُتھئیں گھن ونجو۔ اُتھاں کیں زمانے گلی دِی نکر تے کھیری دی دکان وی ہئی تے ہن وی ھِ، میکوں امید ھِ کہ ایندا گھر اُتھئیں آس پاس ہوسی۔

ماسٹر سدو کا شکریہ ادا کر کے اسلم صاحب اُن سب کورش میں سے گزارتے ہوئے آگے چلے جا رہے تھے۔ پھٹ پھٹ کرتے آٹو رکشوں اور موٹر سائیکلوں کے سائیلنسروں سے خارج ہوتا دھواں، پانچ دھائیاں دِیارِ غیر میں گزارنے کے باوجود وہ محبت اور عقیدت کے ساتھ اس آلودہ ماحول کا حصہ بن گئی تھی۔ آج وہ اس پانچ سالہ بچی کو یاد کرنا چاہ رہی تھی جو دکانوں کے پیچھے سے ہوتی ہوئی اپنے پِتا جی کی معیت میں تیز قدم اٹھاتی چلی آ رہی تھی۔ چاروں جانب لوگ ہی لوگ، اپنی اپنی خوشیاں اور اپنے اپنے غموں کا بوجھ اٹھائے زندگی سے نبرد آزما لوگ۔ یہ سب لوگ اسے آج بھی اپنے اپنے سے لگ رہے

تھے۔ بازار کے دونوں جانب کچھ فاصلے پر بنی پر پیچ گلیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ وہ ہر گلی کی نکر پر تھوڑا ٹھہرتی، گلی کے اندر جھانکتی اور اس کی نگاہیں بے اختیار اپنے دروازے کو تلاش کرنا شروع کر دیتیں۔ وہ بچپن سے کچھ ایسے ہی گلی کوچوں میں پلی بڑھی تھی۔ اچانک ہی اسلم صاحب منگلا میڈیکل ہال کے سامنے بنی ایک گلی میں مڑ گئے، سب نے اس کی تقلید کی تھی۔ گلی میں داخل ہوتے ہی جیسے اس کے جسم میں اسپارک پیدا ہوا اور وہ پھرتی سے قدم اٹھانے لگی، سارا راستہ اس کی سمجھ میں آنے لگا تھا۔ یکا یک اس نے اسلم کا ہاتھ چھوڑا اور تیز تیز قدم اٹھانے لگی۔ وہ بے اختیاری میں سب سے آگے بڑھ گئی تھی۔ لکڑی کے ایک اونچے دروازے والے گھر کے سامنے پہنچ کر وہ رک گئی۔ یہ وہی دروازہ تھا جسے وہ خوابوں میں دیکھا کرتی تھی۔ وہ ایک خواب کی سی کیفیت سے بیدار ہوئی اور ایک بھرپور چیخ ماری۔ ایہو میڈا گھر ھِ۔ ایہو میڈا گھر ھِ۔ وہ ایک عجیب قسم کی جذباتی کیفیت کا شکار تھی۔ اس نے دروازے کی دہلیز کو چھوا، چوما۔ اس کی آنکھوں کے کنارے گیلے ہو گئے۔ اس گھر کی دہلیز کو نہ جانے اس نے کتنی بار پار کیا تھا، لیکن آج یہ گھر اس کا اپنا نہ تھا۔ اسی لیے اسے اندر جانے میں دشواری ہو رہی تھی۔ اس کے قدم بھاری ہو گئے تھے۔ وہ اس زمانے میں چلنے لگی تھی جب تقسیم کے نام پر اس دھرتی نے اپنے حصے کے بخت ہارے تھے۔ جب دھرتی ماں کے سر کے سائیں، اس کے اصل والی وارث اسے چھوڑ چلے تھے۔ بیچ میں آئے پچاس سال کہیں کھو سے گئے تھے اور سب کچھ بھولی بسری یادوں میں ڈھل چکا تھا۔ اس گھر میں اس کی آمد پچاس برس بعد ہوئی تھی مگر ان پچاس برسوں کو اس نے جیسے ایک مونو سیکنڈ کے وقفے میں کالکولیٹ کر لیا تھا۔ یہ عبدالمجید نازک (سعید اللہ مروت صاحب کے والد) کا گھر تھا۔ اسلم نے گھر پر دستک دی، دروازہ کھلا، مجید نازک صاحب باہر تشریف لائے۔ اسلم نے ان کا سب سے تعارف کروایا۔ عبدالمجید نازک کے منہ سے نکلا۔ جی ہاں ضرور، اندر آ جائیے۔ انہوں نے ہلکے سے مسکرا کر اندر آنے کا اشارہ کیا۔ اس نے سانس روک کر دروازے کے اندر قدم رکھ دیا۔ وہ اس گھر کی یادداشت کا انمٹ حصہ تھی۔ گھر کے اندر پہنچ کر اس کے قدم فریز ہو گئے۔ وہ سیڑھیاں، دالان، صحن، کمرے، سب کچھ اس کے سامنے تھا۔ وہ چیخیں، وہ آہ و بکا کہ جب اس گھر کو چھوڑنا پڑا تھا۔ وہ ایک چارپائی پر بیٹھ گئی اور اپنے اعصاب پر بیک وقت قابو پاتے ہی کہنے لگی۔ پانی مل سکتا ہے

کیا؟۔اس نے ایک سانس میں پانی کا گلاس خالی کیا تھا۔ مجھے اس گھر کو ایک نظر جی بھر کر دیکھ لینے دیجئے، مجھے صرف دس منٹ کیلئے اکیلا چھوڑ دیجئے۔اسے اپنے اردگرد جو خاموشی چاہیے تھی وہ چند لمحوں کے لیے سہی لیکن اسے مل گئی تھی۔جسم کے اندر خوف کی گزرتی لہر کو اس نے جیسے خود کو ساکت کرتے ہوئے اپنے آپ کو ارتھ کیا تھا۔گھر میں موجود پرانی چیزوں میں سے کوئی بھی ایسی نہیں تھی کہ جسے اس نے ایک ہی نظر میں پہچان نہ لیا ہو۔اس عمارت میں ایک عجیب قسم کی مانوسیت اور واقفیت تھی۔اس کے قدم اب وہاں تھے جہاں پر اس کی زندگی کی بہترین اور بدترین یادیں بکھری پڑی تھیں۔چند لمحوں کیلئے اس نے اپنے آپ کو شاک اور بے بسی کی حالت میں پایا جو اس نے پچاس سال پہلے محسوس کی تھی۔اس کے چہرے پر ایک ناقابل بیان اذیت، دکھ اور کرب کا ایک عجیب وغریب احساس تھا۔تکلیف دہ یادوں کی طرح جو اس کے اندر سرکنڈوں کی طرح سر نکالے ہمہ وقت موجود رہنے کے باوجود ایک لمبے عرصے سے اسے کاٹ رہی تھیں وہ ایک کُرلاتی کونج کی طرح ایک کمرے سے نکل کر دوسرے میں داخل ہوتی اور ایک بکاٹ مار کر باہر نکل آتی۔اس گھر نے اس کے بچپن کے ایک حصے کو لہولہان اور مسخ کیا تھا۔گھر کے نئے مکینوں نے اس گھر کو بہترین طریقے سے renovate کیا تھا۔اس نے اہل خانہ کا خصوصی شکریہ ادا کیا اور گھر کی دہلیز سے قدم باہر رکھتے ہی اسلم چکڑیال سے بولی۔تم نے مجھے میری جنم بھومی دکھا کر پھر سے زندہ کر دیا ہے۔میں انہی تنگ گلیوں میں پیدا ہوئی تھی، یہاں پر رہنا باعث شرم نہیں باعث افتخار تھا، کیونکہ یہی میرا اصل تھا، تم نے مجھے میرا اصل لوٹا دیا، تمہارا شکریہ۔

....

رنگوں سے کھیلنے والا عجب آرٹسٹ

مِٹھے مالک نے دنیا کا نظام چلانے کے لئے مختلف اوقات میں مختلف انسانوں کو گوناگوں صلاحیتوں سے نواز کر دنیا میں بھیجنے کا سلسلہ نہ جانے کب سے جاری رکھا ہوا ہے۔ ربِ کائنات کی اس منصفانہ تقسیم کے مختلف مدارج ہیں، کوئی پیغمبر، کوئی قلندر، کوئی ولی، کوئی فلسفی تو کسی کو آرٹسٹ بنا کر دنیا میں مسلسل بھیجا جا رہا ہے۔ فن اور آرٹ سے وابستہ لوگوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ کائناتِ بسیط پر پھیلے حقیقی حسن کے عاشق و دلدادہ ہوتے ہیں۔ اِن کی حسن پرستی کی حِس اور اسٹھیٹک سینس بہت تیز ہوتا ہے۔ کائنات کے اسرار و رموز اور اس کے حقیقی حسن پر غور و فکر کرتے ہوئے اُن کا شعور، اُن کی سوچ، ان کی روح اور ان کی توجہ کائنات کے خالق پر مرکوز ہوتی ہے۔ زمانہ ازل سے ہی دنیا ایسے انسانوں کی فنی اور تخلیقی صلاحیتوں کی محتاج رہی ہے۔

حیاتِ انسانی کی بقا، ارتقاء، عروج و زوال اور ان کی علمی، تہذیبی، تمدنی اور ثقافتی زندگی کا سراغ اُس دور کے تراشے گئے پتھروں، تاریک غاروں اور سنگلاخ چٹانوں پر کھینچی گئی ٹیڑھی میڑھی لکیروں اور دریافت شدہ فن پاروں سے ملتا ہے۔ چاہے نیل و فرات کی وادیاں ہوں، ہڑپہ و موہنجوداڑو کی باقیات ہوں یا پھر وادی سندھ کی قدیم ترین سرائیکی تہذیب و تمدن سے ملنے والے مجسمات ہوں، یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ آرٹسٹ نے ہر دور میں اپنے اپنے معاشروں کو زندہ کیے رکھا ہے۔

خطاطی اور کیلی گرافی فائن آرٹس کی ایک قدیم صنف ہے۔ کیلی گرافی ایک اسلامک آرٹ ہے، چونکہ اسلام میں جاندار کی شبیہ بنانے کی ممانعت رہی ہے اس لیے مسلمان مصوروں نے اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کے اظہار کے لیے خطاطی کا سہارا لیا اور اس میں ایسے ایسے تجربات کیے کہ دیکھنے والی آنکھ دنگ رہ گئی۔ مختلف جیومیٹرک اشکال، مختلف اقسام کے دائروں اور قوسوں کو نت نئے اسٹائلز دے کر مسلم مصوروں

نے ایک ایسا آرٹ تخلیق کیا جوان کی پہچان بنا، جسے کیلی گرافیک آرٹ کہا گیا۔

برصغیر میں مغلیہ عہد کے دوران سرکاری سرپرستی ملنے سے اس فن کو بے پناہ عروج حاصل ہوا ۔موجودہ دور میں بھی یہ فن نہ صرف زندہ ہے بلکہ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اس میں نت نئے تجربات ہو رہے ہیں۔کمپیوٹر گرافیکس نے اسے نیا رنگ وروپ سونپا ہے اور اسی ٹرینڈ کے باعث ترقی کے نئے در وا ہو رہے ہیں۔کیلی گرافی کی صنف میں پاکستان واحد ملک ہے جہاں پر خوبصورت تخلیقی کام ہو رہا ہے اور پاکستانی آرٹسٹ فن کے اس شعبے میں اعلیٰ ترین تخلیقی صلاحیتوں کا مظاہرہ کر کے اسلامی دنیا سے مقبولیت اور پسندیدگی کی سند حاصل کر رہے ہیں۔خطاطی کو مصورانہ اسٹائل میں ڈھال کر رنگوں کی خوبصورت پوشاک پہنانے والے کیلی گرافک آرٹ میں صادقین اور گل جی کے نام نمایاں ہیں۔یہ دونوں شخصیات چونکہ پاکستان کے بڑے شہروں سے وابستہ تھیں اسی لیے انہیں مقبول عام ہونے میں زیادہ عرصہ نہ لگا، مگر پاکستان کے پسماندہ ترین ضلع ڈیرہ اسماعیل خان کے مصور اور کیلی گرافک آرٹسٹ عجب خان نے اس فیلڈ میں جو مقام پیدا کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

کینوس پر رنگوں کی کہکشائیں بکھیرنے والا یہ نوجوان لینڈ اسکیپ، خطاطی، Figurative پینٹنگز، تجریدی اور کیلی گرافک آرٹ میں اپنے دور کا نمایاں آرٹسٹ بن کر سامنے آیا ہے۔جاندار رنگوں سے مختلف اسٹائل متعارف کروا کر ملک بھر میں آرٹس اینڈ کیلی گرافی میں نام کمانے والے مصور عجب خان کا اپنا ایک منفرد اسلوب ہے۔ان کے فن کی پرتیں اتنی گہری ہیں کہ بس کھولتے جائیں اور اس کے سحر میں گم ہوتے چلے جائیں۔آج ان کا نام ایک عظیم آرٹسٹ، شاعر اور استاد کی حیثیت سے جانا پہچانا ہے۔

فنِ خطاطی اور پینٹنگ کے ماہر عجب خان ایک نیشنل آرٹسٹ اور کیلی گرافر کیسے بنے اس کے لئے ہمیں ان کے ماضی میں جانا ہوگا۔عجب خان نے ڈیرہ اسماعیل خان کے ایک غریب گھرانے میں آنکھ کھولی۔انہوں نے بی کام کے بعد اردو لٹریچر میں ایم اے کیا۔بی کام کے دوران ایک دن ڈرائنگ کرتے ہوئے انہیں ادراک ہوا کہ وہ حساب کتاب، چیک اینڈ بیلنس اور ٹرائیل بیلنس کے آدمی ہرگز نہیں بلکہ فن و ادب کے راہی ہیں اور یہ فن انہیں قدرت کی طرف سے تحفے میں ملا ہے۔واقعی تخلیق کسی کی میراث نہیں

ہوتی بلکہ یہ مسلسل دریافت کا عمل ہے، چنانچہ عجب خان نے اپنے آپ کو نئے سرے سے دریافت کیا اور ایک آرٹسٹ کی حیثیت سے اپنے فنی سفر کا آغاز کرتے ہوئے اپنے اندر چھپی صلاحیتوں کا استعمال شروع کر دیا۔ ان کا بیشتر وقت مصوری اور خطاطی میں گزرنے لگا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے فن میں نکھار آتا چلا گیا اور ان کے ذہن میں تخلیق کا سندھوٹھاٹھیں مارنے لگا۔ اگر کینوس سامنے نہ ہوتا تو وہ شاعری شروع کر دیا کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی لگن، انتھک محنت اور تخلیقی صلاحیتوں کے بل بوتے پر آرٹ کے شعبے میں بہت کم عرصے میں ایک بلند مقام حاصل کر لیا۔

اُن کے فن پاروں میں عشق و محبت اور مسلسل محنت کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔ لینڈ اسکیپ پینٹنگز میں نئی نئی جہتیں متعارف کروانے اور بڑی بڑی شخصیات کے پورٹریٹس بنانے کے ساتھ ساتھ انہوں نے ایسے موضوعات کو اپنے کینوس پر اتارا کہ جن کا تعلق سرائیکی تہذیب و تمدن اور گلی کوچوں کی زندگی سے عبارت ہے۔ چاہے وہ لینڈ اسکیپ کے پس منظر میں گم ہوتی کوئی پگڈنڈی ہو، کھیت کھلیان ہوں، آئل کلر سے دیہات کا کوئی قدرتی منظر ہو، بدن پہ ستارے لپیٹے، ہاتھی دانت سے ترشی خوبصورت ایڑیاں اور ٹخنوں سے اونچی کیپری سے جھانکتی میدے کی لونی جیسی پنڈلیوں اور ان کے اوپر کشیدہ قامت سراپا لیے پتھر پر بیٹھی کوئی دوشیزہ ہو یا پھر مخصوص برقعے میں لپٹی، چادر کا پلو شانے پر اٹکائے، زلفیں پریشان، ہونٹ نیم وا، انگلیوں کی جنبش میں نزاکت اور پیراہن کی سلوٹوں میں بدن کی لوچ لیے رنگ و نور کے سیلاب میں ڈوبی کوئی پرکشش عورت ہو، اس جوان سال مصور نے اپنے فن پاروں میں اردگرد بکھری سچائیوں کو اپنے کینوس پر اتار کر دھرتی کی خوشبوؤں کو قید کر لیا ہے۔

رنگوں سے کھیلنا ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ انہوں نے بہترین فنی مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے تخیل کو دائروں، تکونوں، زاویوں، مربعوں کی شکل میں حرفوں کی زبان دے کر اسے کیلی گرافک پینٹنگز کے ذریعے کینوس پر منتقل کر کے ایک نئی ہیئت میں اجاگر کیا ہے۔ وہ ایک ایسے تجریدی مصور ہیں کہ جن کی تخلیقات میں اسلامی خطاطی کی روایت کا خاصا دخل نظر آتا ہے۔ وہ جب برش کی زبان میں شاعرانہ گفتگو کرتے ہیں تو قوس قزح کے سارے رنگ کینوس پر کھل اٹھتے ہیں۔ انہیں 2003 میں صادقین ایوارڈ،

2006 میں ایس ایس حیدر ایوارڈ، 2008 میں خانہ فرہنگ ایران، 2010 میں پھر ایس ایس حیدر ایوارڈ اور فیصل آباد میں ہونے والے مقابلوں میں اول انعامات سمیت متعدد ایوارڈوں سے نوازا جا چکا ہے۔ وہ اسلامی فن خطاطی کے شیدائی ہیں۔ انہوں نے قرآن پاک کی آیاتِ کریمہ کے ساتھ ساتھ علامہ اقبال اور طاہر شیرازی سمیت کئی ممتاز شعراء کے کلام کی کچھ ایسی صورت گری کی ہے کہ ہر لفظ بولتا دکھائی دیتا ہے۔ اقبال کی شاعری کو اچھوتے اور خوبصورت انداز میں تحریر کرنے پر وہ لاہور میں ہونے والے مقابلے میں اول انعام کے حقدار ٹھہرے۔ ان کے آرٹ کے نمونے ڈیرہ پریس کلب، ایوان اقبال لاہور، قومی اسمبلی اسلام آباد، شیکسپیئر میوزیم لندن سمیت لاہور، اسلا آباد اور کراچی کی آرٹ گیلریز کی زینت بن چکے ہیں۔

عجب خان کا شمار ان چند خوش بخت لوگوں میں ہوتا ہے کہ جن کے فن پاروں کو مکہ مکرمہ کے کیلی گرافک مقابلوں کے لیے بھی چنا گیا اور انہیں وہاں آنے اور اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کی باقاعدہ دعوت بھی دی گئی، یہ سعادت بہت کم لوگوں کے حصے میں آئی ہے۔

مجھے عجب خان اُس وقت بہت یاد آئے تھے جب پرتھ میں ویسٹرن آسٹریلین آرٹ گیلری کی عمارت میں واٹر کلر، آئیل پینٹنگز، پنسل سے بنائے گئے اسکیچز، تجریدی آرٹ، ڈیجیٹل فوٹو گرافی، آرٹ، کرافٹ اور مصوری کے بکھرے نادر نمونوں کا عجب خان کے مقناطیسی فن پاروں سے موازنہ کیا تھا۔ اس وقت میرے سامنے جولی ڈاؤلنگ کی شاہکار تخلیق تھی۔ جس نے آئیل پینٹنگ کے ذریعے مقامی سیاہ فام ایب اوریجنیز باشندوں کے ساتھ یورپی آبادکاروں کی مزاحمتی جنگوں کا نقشہ کھینچنے کی پاکیزہ کوشش کی تھی۔ فریڈرک گارلنگ کی دریائے سوان کی رنگین منظر کشی پر مبنی ایک انوکھی کوشش۔ رچرڈ مورل کا فری مینٹل بندرگاہ کے دلفریب نظارے کو واٹر کلر میں قید کرنے کا منظر، کیتھلین اوکونر کی پینٹنگ، گریس کراؤلے کا شاہکار تجریدی آرٹ اور فرینک ھنڈر کے پنسل اور واٹر کلر کے کمبی نیشن سے بنایا گیا فن پارہ۔ پھیکے شلجمی رنگوں والی میموں اور وضع قطع کے ٹورسٹ کے درمیان گھومتے پھرتے، نادر نمونوں کا عکس اپنے ذہن میں محفوظ کرتے ہوئے اس وقت میں نے اپنے دوستوں کو بتایا تھا کہ ہمارا شہر ڈیرہ بھی اہل فن سے بھرا پڑا

ہے۔خصوصاً ڈیرہ کا کہنہ مشق مصور وآرٹسٹ عجب خان اپنے اردگرد بکھری زندگی کو کاغذ کے ایک بے جان ٹکڑے پر سمیٹ کر اپنے جاندار رنگوں سے تصویروں میں کچھ اس انداز سے زندگی کا رنگ بھرتا ہے کہ دیکھنے والا بے خود ہو کر داد دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔نامساعد حالات اور سہولیات کے فقدان کے باوجود عجب خان کے فن پارے کسی طور جولی ڈاؤلنگ اور رچرڈ مورل سے کم نہیں ہیں۔لیکن افسوس کہ ہمیں فن کی قدر نہیں۔

آج جہاں ایک طرف ڈیرہ اسماعیل خان جیسے شہر میں چاروں جانب پھیلی موت، دہشت اور ہلاکت خیز تاریکی میں عجب خان جیسے لوگ اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر اجالا بکھیر رہے ہیں تو دوسری طرف انہیں یہ بھی گلہ ہے کہ ڈیرہ میں آرٹ اور آرٹسٹ کی تربیت کا کوئی ادارہ نہیں، اسی لیے یہاں پر آرٹ کو فروغ اور آرٹسٹ کو وہ پذیرائی نہیں مل سکی جو لاہور، کراچی، پشاور یا اسلام آباد میں بیٹھے آرٹسٹوں کے حصے میں آئی ہے۔فنون لطیفہ کے دیگر شعبوں کی طرح یہاں پر بھی جو آرٹسٹ مقصدیت کے حامل فن پارے تخلیق کر رہے ہیں وہ اپنی مدد آپ کے جذبے کے تحت کر رہے ہیں۔ڈیرہ کے نوجوان آرٹسٹوں میں بہترین تخلیقی صلاحیتیں موجود ہیں، وہ کام کا جذبہ اور خواہش رکھتے ہیں۔سماجی اور معاشرتی مسائل کو ہائی لائٹ کرنے میں ڈیرہ کے آرٹسٹ آج بھی فعال ہیں۔اب یہ صوبائی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ باصلاحیت آرٹسٹوں کی حوصلہ افزائی کرنے کے لیے انقلابی اقدامات اٹھائے اور فنون لطیفہ کی سرپرستی بھی کرے۔

.....

سیئں ظہور دامانی

انسانی زِیست کمرہ امتحان میں تھمائے گئے ریاضی کے پرچے سے نہ جانے کتنی ملتی جلتی ہے۔دونوں قسم کے امتحانوں میں پہلا سوال اہم اور لازمی ہوتا ہے۔اگر چہ حساب کا پرچہ حل کرنے کے لیے وقت مقرر ہوتا ہے مگر حسابِ زیست کے گوشوارے کو پُر کرنے کے لیے امتحان لینے والا اپنی مرضی سے وقت کو متعین کر کے پرچہ حل کرنے والے کو اس سے بے خبر رکھتا ہے۔کسی کو پینسٹھ برس، کسی کو چالیس تو کسی کو اس سے بھی کم عرصہ ملتا ہے اور وقت پورا ہوتے ہی بغیر کچھ بتائے پرچہ چھین لیا جاتا ہے۔زندگی کے پرچے میں ٹھوس عمل اور درست جوابات کا آنا نہایت ضروری امر ہے ورنہ سب خسارہ ہے۔

زندگی ہر انسان سے پہلا سوال یہی کرتی ہے کہ تمہیں جب اپنے حصے کی گیلی مٹی دے کر زمین پر اتارا گیا تھا تو تم نے اُس چکنی مٹی کا کیا کیا؟۔اسے کیسے استعمال کیا اور اُس کا کیا کچھ بنایا؟۔گھڑا، صراحی، دِیا، پیالہ یا پھر اُگل دان۔سیئں ظہور دامانی کا شمار ان لوگوں میں سے ہوتا ہے کہ جن کی حیاتی کے دانے اگر چہ بہت تھوڑے تھے لیکن انہوں نے ان دانوں کو جذبوں کے دھاگے میں پرو کر موتیوں کی خوبصورت مالا بنائی تھی۔انہوں نے ایک بھرپور، جاندار اور با مقصد زندگی گزاری اور اپنے حصے کی ملنے والی مٹی سے روشن دِیے، پانی کے ٹھنڈے میٹھے مشکیزے، صراحیاں اور گھڑے بنا کر اپنے وجود کی مٹی کا حق ادا کر گئے تھے۔

ظہور دامانی 1976ء میں ضلع ٹانک کی یونین کونسل رنوال کے گاؤں چھینہ میں ملک محمد نواز عرف بڈا ملک کے گھر میں پیدا ہوا۔ان کے والد اپنے علاقہ کے نہایت معتبر زمیندار تھے لیکن دامان کی بنجر و

بے آب زمینوں کی ملکیت فقط تمنداری تک ہی محدود ہوتی ہے مگر سیاسی اعتبار سے ظہور دامانی کا گھرانہ مقامی سطح پر نہایت ہی اثر ورسوخ کا حامل رہا ہے۔ظہور دامانی نے بنیادی تعلیم (نصابی نہیں) روایتی طور پر اپنے علاقہ کے ایک مدرسے سے حاصل کی۔بچپن میں باپ نے ظہور کو اپنے گاؤں میں ایک چھوٹی سی دکان (کریانہ کی) کر کے دی۔بقول ظہور دامانی کے اس کی دکان پر کوئی پڑھا لکھا گاہک سودا سلف لینے آتا تو ظہور سگریٹ کی ڈبیوں پر اس سے حسب مقدور نصابی تعلیم کی جستجو کیا کرتے،اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہا یہاں تک کہ ظہور دامانی کے والدین اور رشتہ دار اس بات سے بے خبر رہے کہ ظہور میٹرک کی تیاری میں جت گیا تھا۔پرائیویٹ میٹرک پاس کرنے کی خوشخبری جب ظہور نے اپنے والدین کو سنائی تو اُن کے والد بزرگوار نے فخر سے سینہ تان کر انہیں ڈیرہ شہر کے کامرس کالج میں ڈی کام کرنے کی اجازت دے دی جس پر ظہور دامانی نے ڈی کام کے بعد بی کام اور پھر گومل یونیورسٹی سے ایم اے جرنلزم کر لیا۔کامرس کالج ڈیرہ اسماعیل خان میں داخلے کے بعد تہذیب وتمدن سے فطری لگاؤ کی بنیاد پر ڈیرہ اسماعیل خان کے سرائیکی ادبی حلقوں میں آنا جانا اور شہری،دیہی ثقافت کی آمیزش کیلئے ظہور کی عملی خدمات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ ظہور دامانی نے سرائیکی شاگرد سانجھ سے اپنی عملی جدوجہد کا آغاز کیا اور ضلع ٹانک کے علاقہ جٹاتر کے تمام سرائیکی موضعوں میں تنظیم سازی کا عمل شروع کروایا۔سرائیکی لوک سانجھ کے پلیٹ فارم پر ضلع ڈیرہ اسماعیل خان اور ضلع ٹانک میں سرائیکی میلوں کا انعقاد اور ان میں بھرپور عملی اعانت سے سرائیکی ثقافت کو فروغ حاصل ہوا۔ظہور دامانی نے مقامی سطح پر ثقافتی ترویج کے بعد پورے سرائیکی وسیب میں ڈیرہ اسماعیل خان اور ٹانک کے درمیان ثقافتی رشتوں کی استواری کے لیے کام شروع کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ پورے سرائیکی وسیب کی آنکھ کا تارا بن گئے حتیٰ کہ سرائیکی لوک سانجھ جو کہ پورے وسیب میں ادبی سرگرمیوں کے ذریعے اپنے کلچر کی ترویج وترقی کا کام کر رہی تھی کو باقاعدہ پارٹی کی شکل دینے کیلئے پورے سرائیکی وسیب کے ذمہ داران کو آگاہ کیا اور بالآخر سرائیکی لوک سانجھ کو سرائیکی لوک پارٹی کا نام دے کر سرائیکی تحریک کو سیاسی تقویت پہنچائی۔سفید اور جوگی رنگوں پر مشتمل سرائیکی لوک پارٹی کا جھنڈا سئیں ظہور دامانی کا تخلیق کردہ ہے،جسے بھکر میں سرائیکی لوک پارٹی کی تشکیل کے دوران متفقہ رائے عامہ سے منظور کیا

گیا تھا۔

ظہور دامانی نے اپنے والد کی وفات کے بعد باقاعدہ طور پر ٹانک کی عملی سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا، انہوں نے ٹانک کے سرائیکیوں کو ایک پلیٹ فارم پر اکھٹا کیا اور 2004-05 کے ضمنی انتخابات میں تمام سرائیکی یونین کونسل پر متفقہ الیکشن لڑنے کا اعلان کیا، جس پر تمام سرائیکی متفق ہوئے اور انہیں بھاری اکثریت سے کامیاب بھی کروایا۔

گومل زام ڈیم جو ٹانک کے سرائیکیوں کی خوشحالیوں کا خواب ہے اور جس کے انتظار میں نہ جانے وہ کب سے امیدیں لگائے بیٹھے ہیں، ظہور دامانی ان کے لیے ایک نئی آس اور امید بن کر اٹھے۔ انہوں نے اپنی سرائیکی عوام کو نصیحت کی کہ تم آج ہزاروں مربعوں کے مالک ہو مگر گائے کا گوبر بیچ کر اپنے بچوں کا پیٹ پال رہے ہو، خبردار اپنے اجداد کی نشانیوں کا اور اپنی ماں کی غیرت کا سودا نہ کرنا، ہمت، صبر اور جرأت سے کام لینا کہ وہ دن بہت جلد آ پہنچے گا جب تمہاری یہی بنجر زمینیں سونا اگلنا شروع کر دیں گی، تب تمہاری اگلی پچھلی نسلوں کا قرض ادا ہو جائے گا۔ جب گومل زام ڈیم کا پراجیکٹ زیر غور آیا اور اس کا سرکاری نقشہ بنایا گیا تو اسے دامان کے باسیوں سے خفیہ رکھا گیا تاکہ وہ سرمایہ داروں کے ہاتھوں اپنی زمینیں سستے داموں بیچنے پر مجبور ہو جائیں مگر جب ظہور کو اس سازش کا علم ہوا تو انہوں نے اسلام آباد سے گومل زام ڈیم کا نقشہ منگوایا اور جب اسے اٹھا کر دیکھا تو اس میں دامان کی ریڑھ کی ہڈی سمجھی جانے والی وارن کینال کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ وارن کینال سینکڑوں سالوں سے یہاں کی عوام کو پینے کا پانی مہیا کرنے کا واحد ذریعہ چلی آ رہی تھی یہاں تک کہ انگریز دور میں بھی یہ ایک مکمل نہر کی حیثیت رکھتی تھی جس سے دامان کا ہزاروں ایکٹر رقبہ سیراب ہوتا تھا، گومل زام ڈیم کے پانی میں بنیادی حقوق کی مالک بھی یہی وارن کینال تھی گومل زام ڈیم کے نقشے میں وارن کینال کو غائب دیکھ کر انہوں نے اپنے دوستوں سے صلاح مشورہ کیا اور اس وقت کی سنگی این جی او سے رابطہ کر کے ان کی ٹیم کو علاقہ دامان اور وارن کینال کی افادیت اور اہمیت سے آگاہ کیا، جس پر سنگی این جی او نے ورلڈ بینک کو اس پراجیکٹ کے بارے میں آگاہ کیا۔ ظہور دامانی کی کوششوں سے گومل زام ڈیم کا نقشہ نئے سرے سے ترتیب دیا گیا اور وارن کینال کو خصوصی طور پر نقشے میں

شامل کرلیا گیا۔ یہ ظہور دامانی سمیت پورے دامان کی فتح تھی۔

14 اکتوبر 2007 کو عیدالفطر کی نماز کے فوراً بعد کسی شقی القلب نے ظہور دامانی کو اپنے گھر کی دہلیز پر گولیوں کا نشانہ بنا ڈالا۔ شاید وہ بدبخت ظہور دامانی کو فقط علاقہ دامان کے ایک زمیندار کا بیٹا ہی سمجھتا تھا اسے کیا خبر کہ ظہور دامانی کی موت نے پورے سرائیکی وسیب کو کتنا سوگوار کر دیا ہے۔ سئیں ظہور دامانی کی بے وقت موت دامان کے سینے پر سرکنڈوں کی طرح سر نکالے ہمہ وقت کاٹ اور چبھن دے کر سرائیکیوں کو رلاتی رہے گی۔

....

یہ داغ داغ اجالا

پونم کی مہکتی راتوں میں فسوں خیز چاندنی کے حصار میں لپٹا چاند جب اپنے صبیح چہرے پر روشنی کا ہالہ سجائے امبر پر جلوہ افروز ہوتا ہے تو اس کی سج دھج نرالی اور اس کا رنگ وروپ دیکھنے لائق ہوتا ہے۔ ہر دم روشن، تروتازہ اور خوش باش ارشاد حسین کو دیکھ کر بھی کچھ ایسا ہی گماں ہوتا ہے کہ جیسے پونم کا چاند امبر سے چھلانگ لگا کر ڈیرہ کی سرزمین پر اتر آیا ہو۔ ادب، فلسفہ، افسانہ نویسی یا پھر کالم نگاری، انہیں جس کسی بھی پہلو سے دیکھیں، پرکھیں وہ چمکتا دکھائی دیتا ہے۔

یہ داغ داغ اُجالا جیسی نادر کتاب کے خالق سید ارشاد حسین سے میرا تعارف جنوری کی ایک کہر آلود دوپہر کو یونائیٹڈ بک سنٹر میں ہوا۔ اس وقت تک میں نے صرف ان کا نام سنا تھا۔ پردیس میں رہنے کی وجہ سے نہ ان سے مل پایا اور نہ ہی کبھی ان کی کوئی تحریر پڑھنے کا موقع مل سکا۔ ان سے ملنے، ان کی مثبت سوچ پرکھنے اور ان کے بے ضرر نظریات سے آگاہی ملنے کے بعد ان کے اندر چھپے عظیم انسان سے ملنے کا حسین اتفاق ہوا اور پھر اس کے بعد گاہے بگاہے مختلف مقامات پر ان سے نہ صرف بہت سی باتیں ڈسکس ہوئیں بلکہ مجھے ان سے مل کر ایک نیا حوصلہ، تازگی اور ایک نئی انرجی ملی۔ ارشاد صاحب نے دوسری ملاقات میں ہی اپنی کتاب مجھے دستخطوں سمیت تحفہ کر دی۔ خوش قسمتی سے اس دفعہ آسٹریلیا واپسی پر مجھے کوئی کتاب خریدنے کی ضرورت نہ پڑی کیونکہ جناب شوکت مغل، ظہور دھریجہ اور طاہر سمیت کافی دوستوں نے مجھے

اپنی اپنی کتابیں گفٹ کی تھیں۔

میں ارشاد صاحب کی کتاب 'یہ داغ داغ اُجالا' کا مطالعہ شروع کر چکا ہوں۔ان کی یہ کتاب دراصل اخباری کالموں کا مجموعہ ہے۔کتاب کے اوراق میرے سامنے کھلے پڑے ہیں۔جس میں روشن خیالی، نیم روشن خیالی، نظریہ پاکستان اور جمشید نایاب کے عنوان سے بھرپور اور جاندار تحریریں سانسیں لے رہی ہیں۔کتاب پڑھ کر مجھے اردو ادب کے عظیم افسانہ نگار سعادت حسن منٹو یاد آ گئے۔جس طرح منٹو نے اپنے افسانوں میں انتہائی خوبصورتی سے کھوکھلے معاشرے میں سامراج اور مُلّا کی منافقت سے پردہ اٹھایا تھا، یہی کچھ ارشاد صاحب کی تحریروں میں بھی پڑھنے کو مل رہا ہے۔ارشاد صاحب واقعی ایشو بیسڈ کام کر رہے ہیں، ان کی تحریروں سے قارئین کو آگہی اور سیاسی شعور کا پیغام ملتا ہے۔یہی ان کی خوبی ہے کہ وہ آخر میں کچھ نہ کچھ ڈیلیور ضرور کرتے ہیں۔انہوں نے جن مسائل کو موضوع بحث بنایا ہے وہ آج کے دور کے یونیورسل ٹرتھ ہیں۔وہ بڑے لطیف پیرائے میں بڑی سادگی کے ساتھ ساری سچائیوں کو سامنے لاتے ہیں۔ان کی تحریریں اپنے عہد کی تاریخ سے جڑی ہوتی ہیں، خصوصاً عظیم اسکالر جناب جمشید نایاب مرحوم کے بارے میں لکھتے وقت وہ ایک ایسی فضا تشکیل دیتے ہیں جہاں ہجوری، دکھ، درد اور انسانیت کا کرب نمایاں نظر آتا ہے۔

جمشید نایاب کے بارے میں کیا لکھیں؟۔وہ ایک ہیرا تھے اور ہیرے کی قدر صرف جوہری جانتا ہے۔اگر سامنے والا جوہر شناس نہ ہو تو ہیرے کو ایک عام سا موتی سمجھ کر پھینک دیتا ہے۔بالکل ایسے ہی کبھی کبھار تقدیر ہمیں کوری مٹی کے پیالے میں امرت پیش کرتی ہے مگر ہم مٹی کو حقیر جان کر پیالے کو حقارت سے ٹھکرا دیتے ہیں۔جمشید نایاب بھی ایک ایسا ہی لبالب امرت بھرا پیالہ تھے، کہ جس کی ہم نے زندگی میں قدر نہ کی۔جمشید کی شخصیت پر چاہے ارشاد صاحب قلم اٹھائیں یا کوئی اور مجھے ایسا لگتا ہے کہ جیسے ہر کوئی اپنے اندر کے رائٹر کو باہر لانے کی کوشش کر رہا ہو۔

جمشید نایاب کیا تھے؟ ایک بے ضرر، علم پرور، کتاب چہرہ انسان۔ڈیرے کا علمی و ادبی سرمایہ۔اپنے اردگرد چلتی پھرتی کولڈ بلڈڈ اینمل سوسائٹی کے بیچ مثبت سوچ اور منفرد طرز تحریر کے زریعے

معاشرے میں سماجی تبدیلی لانے کا عزم رکھنے والا سادہ سا انسان۔ ارشاد صاحب لکھتے ہیں کہ وہ اتنے سادہ تھے کہ موٹر سائیکل تک ڈرائیو کرنا نہیں جانتے تھے، اکثر میرے پیچھے موٹر سائیکل پر بیٹھ جاتے، منی بیگم کی غزلیں گنگنانے لگتے یا پھر خود سائیکل پر اکیلے پھرا کرتے تھے۔ ارشاد صاحب نے جمشید نایاب سے کبھی ان کے نظریات کے بارے میں جاننے کی کوئی کوشش نہ کی بلکہ وہ اُن سے ایک مخلص دوست کی طرح فقط دوستی نبھاتے رہے۔

جمشید پر الزام تھا کہ وہ اشتراکی خیالات کے حامی ہیں اور اپنے کمیونسٹ نظریے کا پرچار کرتے پھرتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ کمیونزم یا سوشلزم کا مذہب اسلام سے کسی قسم کا کوئی تصادم نہیں بلکہ یہ کیپٹل ازم (سرمایہ دارانہ) نظام کیخلاف اٹھنے والی ایک ایسی تحریک تھی جو مزدور طبقے کی معاشی خوشحالی اور ان کی سیاسی بقا کی خاطر چلائی گئی تھی۔ جو لوگ سوشلسٹ نظام کو کفر و الحاد کا نظام کہتے ہیں وہ پرانے جاگیردارانہ نظام کے حامی مولوی ہو سکتے ہیں۔ سوشلسٹ نظام احترام آدمیت، ایثار اور محبت کا نظام تھا۔ کارل مارکس، لینن، اینگلز وغیرہ سب انتہائی پڑھے لکھے، مہذب، محنت کرنے والے اور بہادر انسان تھے۔ یہ سب لوگ اپنے نظریات کے ساتھ جیئے۔ انہوں نے کبھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا، محلات نہیں چھوڑے، حرم نہیں بھرے۔ ان میں سے کسی نے اسلام کو برا بھلا نہیں کہا، اللہ کو نعوذ باللہ گالی نہیں دی۔ انہوں نے فقط اتنا کہا کہ مذہب تو اللہ اور اس کی تخلیق کا باہمی معاملہ ہے، ریاست کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ مانتے ہو تو مانو نہیں مانتے تو نہ مانو، مگر اب نہ کوئی بھوکوں مرے گا، نہ کوئی حرام کی کمائی کھائے گا۔ جہاں تک ہمارے دین اسلام کا تعلق ہے تو اسلام کی بیسک تھیوری ہی سوشل جسٹس یعنی عدلِ اجتماعی ہے۔ بے شک قرآن پاک ایک عقلی کتاب ہے جس نے دنیا کو یونانی فکر سے آزاد کروا کر تاریخ کا اولین انقلاب برپا کیا۔ مکہ مکرمہ میں دنیا کا سب سے بڑا انقلابی حضرت محمد ﷺ پیدا ہوا۔ اسلامی انقلاب کے بعد انقلاب فرانس اور پھر سوشلسٹ انقلاب آیا۔ سوشلزم کے مقاصد بھی عدل اجتماعی کے تھے جو اسلام کے ہیں۔ اصل چیز ہے آزادی ضمیر کا حق۔ یہی ایک ایسا بنیادی حق ہے جو جانوروں اور انسانوں میں تمیز کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔ جمشید نایاب بھی آزادی ضمیر کی، اپنی سوچ کے ساتھ جینے کے حق کی باتیں کیا کرتے

تھے،مگر ہمارے گھٹن زدہ،تنگ نظر اور سفوکیٹڈ معاشرے میں انہیں کوئی سپیس نہ مل سکی اور وہ ہم سے روٹھ کر چلے گئے۔سب سے بڑی بات کہ جاتے جاتے اپنے قاتل کو جانتے پہچانتے جان بوجھ کر اپنی زندگی میں ہی معاف کر گئے، یہ ان کی پر امن سوچ کا عملی ثبوت تھا۔

جہاں تک شدت پسندی کا تعلق ہے تو ہمیشہ سے یہی کہا جاتا رہا ہے کہ کسی بھی معاشرے سے شدت پسندی کو ختم کرنے کے لیے روشن خیال افراد کلیدی کردار ادا کر سکتے ہیں۔میرے خیال میں فلسفیانہ حد تک تو یہ بات بالکل ٹھیک ہے مگر عملی طور پر ممکن نہیں کیونکہ جمشید کی موت اس فلسفے کی پریکٹیکل طور پر نفی کرتی نظر آتی ہے۔جس معاشرے میں ایک مسلح شخص ہلکی سی مشین گن کے زور پر سینکڑوں افراد کو یرغمال بنا سکتا ہو وہاں گولی کے مقابلے میں دلیل کوئی معنے نہیں رکھتی۔

روشن خیال افراد بھلا کر بھی کیا سکتے ہیں؟۔اپنے قلم سے شعوری جدوجہد،سول سوسائٹی کو اکھٹا کر کے چند موم بتیاں جلا کر پر امن احتجاج یا پھر زیادہ سے زیادہ ہمت کر کے ایک آدھ تقریر۔اور بس۔شاید معاشرے میں اس طریقے سے کچھ نہیں بدلنے والا۔

ارشاد صاحب نے اپنی کتاب یہ داغ داغ اجالا میں اوریجنل سورسز کو ترتیب دے کر روشن خیالی،لبرل ازم،سیکولرازم،تخلیق پاکستان اور فلاحی ریاست کے تصور پر مبنی مضامین میں جس طرح فیکٹس کو سامنے لا کر ان کا کورٹ مارشل کیا ہے وہ پڑھنے لائق ہے۔اُن کی کتاب نہ صرف سوچ کے در وا کرتی ہے بلکہ قارئین کے لیے بہت بڑا سوالیہ نشان بھی چھوڑ جاتی ہے۔

....

دھرتی کا لعل، عقیل چکڑیال

ٹکڑیوں کی صورت نیلے گگن پر تیرتے سرمئی بادل بڑی تیزی سے اکٹھے ہوئے تھے اور شام پھیلا دی تھی۔ گھنگھور گھٹائیں بارش کا سندیسہ دے رہی تھیں۔ موسم بلا کا رومینٹک ہو چلا تھا۔ ٹھنڈی، پرنم ہوائیں گرمی کی شدت کے خاتمے کا سبب بنی تھیں۔ ایسے میں اگر بارش ہو جائے تو واقعی چس آ جائے۔ اسے حسن اتفاق کہیے کہ سیئں عقیل نے بولنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ بادلوں کی چھلنی سے بارش کے لمبوترے قطرے چھما چھم برسنے لگے۔

''تعلیم ہمارا زیور ہی نہیں بلکہ ہمارا دفاعی ہتھیار بھی ہے۔ اگر ہمیں واقعی ترقی کرنا ہے، اپنے خطے کو جنت نظیر بنانا ہے تو پھر وقت کے آنچل کو تھام کر چلنا ہوگا اور آنے والی نسل کو جدید تعلیم سے روشناس کرانا ہوگا۔ ایک پڑھا لکھا، باشعور سرائیکی نوجوان اپنے حقوق کی جنگ کہیں بہتر انداز میں لڑ سکتا ہے۔ وہ یہ جنگ نہ صرف جیت سکتا ہے بلکہ اپنے ساتھ ساتھ اپنی قوم کی تقدیر بھی بدل سکتا ہے''۔ (عقیل چکڑیال)۔

کہتے ہیں کہ چیونٹی جب اپنا بچہ پیدا کرتی ہے تو اُسے دو چیزیں سکھاتی ہے۔ ایک اتفاق، دوسرا سمت کا تعین۔ بچہ اِن دو بنیادی قوانین کو اپنے ننھے دماغ میں رکھ کر پلتا بڑھتا ہے۔ چاہے آندھی آئے، طوفان یا زلزلہ۔ دنیا کا کوئی بھی حادثہ اسے اپنے گھر تک جانے سے نہیں روک سکتا۔ جب تک وہ

زندہ رہتا ہے، اپنی ماں کی نصیحت، اپنی سمت اور اپنے گھر کا راستہ کبھی نہیں بھولتا۔

مغلوب قوموں کی زندگی میں جہاں صحیح سمت کا تعین انتہائی ضروری ہے وہیں اسے جگانے ،اٹھانے، جدوجہد پر اکسانے اور راستہ دکھانے والے انسانوں کا تسلسل سے پیدا ہونا بھی اتنا ہی اہم ہے ایک ہزار سال سے تاریک سرنگوں میں ٹکریں مارتی، ظلمی اندھیروں سے لڑتی سرائیکی قوم کو نوید ہو کہ اس نے اپنے لعل و گوہرا گلنے شروع کر دیئے ہیں۔ دھرتی کے نرم و ملائم سینے پر فخر سے پنجہ گاڑھے، اپنی جڑوں کے ساتھ مضبوطی سے پیوست کھڑے سئیں ظہور احمد دھریجہ، شوکت مغل، سعید اختر اور عقیل چکڑیال جیسے بلند قامت ہمالیہ کہ جو پچھلے بیس تیس برسوں سے بھولے بھٹکوں کو نہ صرف راستہ دکھا رہے ہیں بلکہ انکی صحیح سمت میں رہنمائی کر کے کسی لائٹ ہاؤس کا کردار ادا کرتے چلے آ رہے ہیں۔

عامیانہ لہجے میں گہری باتیں کرنے والے بے غرض و بے ریا، سرائیکی تحریک کے خاموش سپاہی سئیں عقیل پر جب لکھنے بیٹھا تو عقل نے آ کر پوچھا۔ آخر تمہارا اُن سے رشتہ کیا ہے؟۔ جواب ملا۔ مٹی سے آدم کا رشتہ، سندھو سے اس کے باسی کا رشتہ، دھرتی سے بیٹے کا رشتہ، چرخے سے سوت کا رشتہ اور شہ رگ سے جسم کا رشتہ کبھی نہیں پوچھا کرتے۔ مٹی سے رومانس اور عشق کا رشتہ ہی ایسا حقیقی رشتہ ہے کہ جو انسانوں کو مذہبی اور مسلکی تفرقوں سے آزاد کر کے سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ جو انسان کو نہ صرف حیوان بننے سے روکتا ہے بلکہ اسے انسانوں کی کہانیاں سناتا ہے اور آپس میں جوڑے رکھتا ہے۔ یہ کہانیاں اُس مشترکہ تاریخ کی ،اُس تہذیب کی، ثقافتی ورثے، مشترکہ میراث اور زبان کی کہانیاں ہوتی ہیں کہ اگر جذبے ان کے ساتھ آ ملیں تو سوئی کی نوک بن کر دکھی دلوں کو رفو کرنے کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ دھرتی کا لعل، عقیل چکڑیال کچھ ایسے ہی لازوال رشتوں کے بندھن میں جکڑا دکھائی دیتا ہے۔

سئیں عقیل کی زندگی کی کہانی جہدِ مسلسل سے عبارت ہے۔ تعلیم یافتہ، مڈل کلاس طبقے سے تعلق رکھنے والا یہ شخص اندرون اماماں والا گیٹ شہر ڈیرہ کے معروف محلّہ کمہاراں میں پیدا ہوا۔ پرائمری اور ہائی لیول کی سکولنگ اسلامیہ سکول نمبر 2 سے ہوئی۔ 1972ء میں میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد کامرس کالج میں داخلہ لیا۔ وہاں سے اکاؤنٹنگ میں ڈپلومہ کرنے کے بعد 1977ء میں یو۔ بی۔ ایل کی یونیورسٹی

برانچ سے منسلک ہو گئے اور دوران سروس یو بی ایل مزدور یونین (سی بی اے) ڈیرہ اسماعیل خان زون کے جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے ۔اس عہدے پر اپنی خدمات سرانجام دیتے ہوئے انہوں نے کئی ڈیرے والوں کی میرٹ پر بھرتیاں یقینی بنوائیں ۔1994ء میں پروموشن ہوئی ۔ بینک کی افسری کے ساتھ ساتھ سیاسی سرگرمیاں بھی جاری رہیں ۔1997ء میں ملک بھر میں یو بی ایل کے تقریباً 5400 جبری نکالے جانے والے ملازمین میں وہ بھی شامل تھے۔سیئں عقیل نے زمانہ طالب علمی سے ہی سوشل ایکٹیویٹیز میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔آپ ایک طرف انجمن تاجران شرقی سرکلر روڈ کے جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے تو دوسری طرف سرائیکی کاز کے لیے اپنے ہم عصروں کے ساتھ مل کر خاموش تحریک کا کارآمد حصہ بھی بنے ۔انجمن تاجران کے ایک اہم رکن کے طور پر وہ تاحال اپنی خدمات سرانجام دے رہے ہیں ۔سرائیکی کاز میں شمولیت کی پاداش پر نہ صرف اُن کی پروموشن روک دی گئی بلکہ 1997ء میں انہیں جبراً اپنی نوکری سے بھی ہاتھ دھونا پڑے تھے ۔نوکری چلے جانے کے بعد انہوں نے پیچھے مڑ کر نہ دیکھا بلکہ سرائیکی کاز کے لیے اپنے آپ کو کل وقتی مختص کر دیا۔ یہ وہ دور تھا کہ جب پڑھے لکھے اور روشن خیال سرائیکی کا واسطہ سطحی ذہنیت کے حامل لوگوں سے پڑتا تھا۔فوٹو گرافی سے لاؤڈ اسپیکر تک حرام قرار دینے والے لمیٹڈ ذہنیت کے لوگوں کے ردعمل میں سعید اختر، ملک اسلم اعوان، خضر حیات ڈیال، ایاز چھینہ، سہیل ریاض، قاری گل زمان ،قاری فلک شیر اور لطیف انور جیسے روشن خیال اور ایک جیسی ویولینتھ پر سوچنے والوں کا آرگینک بیج بنا جس کے نتیجے میں سرائیکی وسیب پارٹی کا قیام عمل میں لایا گیا۔سیئں عقیل ڈیرہ بچاؤ تحریک کے بھی متحرک سپاہی تھے ۔ یہ ڈیرہ بچاؤ تحریک کا ثمر تھا کہ سرائیکی سماج کو زنجیروں میں جکڑ کر مصلوب کرتے چلے آ رہے بنیاد پرستوں، معاشرے کے فرسودہ اور مردہ رکھوالوں کو شکستِ فاش ہوئی ۔

ساڈے بال الاون سِکھدے پین ۔سیئں عقیل بجا فرماتے ہیں کہ سرائیکی دھرتی کبھی بانجھ نہیں رہی ۔تھل، روہی، دامان پر مشتمل سرائیکی ریجن کے لوگوں میں ہمیشہ سے بے پناہ صلاحیتیں پوشیدہ رہی ہیں ۔اندرون شہر ڈیرہ میں پیدا ہونے والا وی پی ملک اپنی قابلیت کی بنا پر ہندوستان کا آرمی چیف بنا۔ باپ کی انگلی پکڑ کر ہجرت کرنے والا پانچ سالہ جگدیش کھترا ایشاء کی سب سے بڑی آٹو موبائل کمپنی

ماروتی اُدیوگ کا ڈائریکٹر بنا۔کوئی دہلی کا کونسلر سلیکٹ ہوا،کوئی ایران میں ایمبیسیڈر،کوئی اندرا گاندھی کا استاد،کوئی ہندوستان کی اعلیٰ ترین عدالتوں کا جج تو کوئی یو این او میں جا بیٹھا۔قیام پاکستان کے وقت جہاں سرائیکی وسیب سے تاریخ کا سب سے بڑا برین ڈرین ہوا وہیں ہندوستان کی لاٹری نکل آئی۔سینکڑوں مثالیں، بیشمار ایسے سرائیکی چہرے کہ جنہوں نے ہندوستان کی ترقی میں کلیدی کردار ادا کیا۔مگر ہمارے حصے میں محرومی، محکومی، مظلومی،مفتوحی، مفلسی ،خود فراموشی اور خود اذیتی کیوں آئی؟۔زندگی کے حسین رنگوں میں ہمیں ہمارے حصے کے رنگ کیوں نہیں ملے؟۔سرائیکی مٹی میں پوٹینشل ازل سے تھا مگر ہمیں ہمت، جرأت اور حوصلہ دینے کی بجائے احساس کمتری میں کیوں مبتلا رکھا گیا؟۔ہماری پانچ ہزار سالہ مٹھڑی بولی کو حقیر کیوں جانا گیا؟۔ننگی منجھی تہذیبوں کو چولا پہنانے والی۔جاہل، وحشی اور باربیریز کو مہذب بنانے والی۔چاندی کے پھول اگانے والی پرامن دھرتی کا مذاق کیوں اڑایا گیا؟۔غیروں کو ست بسم اللہ،سجن آون اکھیاں ٹھرن کہنے والے پریتی کلچر کو مسخ کرکے مذہبی منافرتوں کی بھٹی میں کیوں جھونکا گیا؟۔مگر دیر صرف شعور ملنے کی تھی۔سوچتی،کھوجتی اور بولتی آنکھوں کے دھندلے کانچ سارے راز کب کے اُگل چکے۔سرائیکی وسیب اب کروٹ بدل رہی ہے۔یہاں کا نوجوان اب اپنے پاؤں پر کھڑا ہو چکا ہے۔سرائیکیوں کی زندگی اب کوئی بلینک چیک نہیں رہی کہ جسے ہر کوئی اپنی مرضی سے بھرواتا پھرے۔سرائیکی ازم کے خلاف دلوں میں دھوئیں کی مانند اٹھتی کدورت،سرائیکیوں سے نفرت اور انہیں گنی پگ بنا کر اُن پر اپنی مرضی کے تجربات کرنے والے حملہ آوروں کو اب ایک ایک ذیادتی کا حساب دینا ہوگا سیئں خضر حیات ڈیال کی سربراہی میں بننے والی سرائیکی وسیب پارٹی میں جنرل سیکرٹری کے عہدے سے وابستہ عقیل چکڑیال جب ٹھہر ٹھہر کر بول رہے تھے تو کسی شفاف جھیل کے خاموش پانی کی طرح لگتے تھے۔ ایک ایسا ٹھہرا پانی کہ جس میں کنکر مارنے والے کو زندگی کے نئے دائرے، نئے زاویے، نیا حوصلہ اور نئی حرارت ملتی ہے۔ پھیکے،مٹیالے،افسردہ،اداس،غمگین اور رنجیدہ چہروں کا عکس جب اس ٹھہرے پانی پر پڑتا ہے تو خوشی،امید،امنگ اور ترنگ کے بیشمار رنگ چھلک اٹھتے ہیں۔اگر کوئی اس ٹھہرے پانی میں جھانک کر دیکھے تو سمجھ پائے کہ نیچے جذبوں کا سونامی ٹھاٹھیں مارتا پھر رہا ہے۔

کھڑکی کے شفاف شیشے پر دستک دیتی رم جھم پھوار کے تسلسل میں ہوا کی صوتی لہروں پر در آئی عقیل چکڑیال کی آواز اور ان کے افکار و خیالات نے کانوں کی نسوں کو پور پور تک بھگو دیا تھا۔ سرائیکی تحریک کے متحرک سپاہی سیئں عقیل چکڑیال پر جب لکھنے بیٹھا تو عقل نے کان میں آ کر گستاخی کی۔ آخر تمہارا اُن سے کیا رشتہ ہے؟۔ جواب آیا کہ مٹی سے آدم کا رشتہ، سندھو سے اس کے باسی کا رشتہ، دھرتی سے بیٹے کا رشتہ، چرخے سے سوت کا رشتہ اور شہ رگ سے جسم کا رشتہ کبھی نہیں پوچھا کرتے۔

....

تسلیم فیروز، ایک عہد ساز شخصیت

یہ اندرونِ شہر تھلہ بموں شاہ کی مشہور و معروف اسٹریٹ ہے۔ اِسی اسٹریٹ میں اگر آپ ناک کی سیدھ میں بازار کی طرف چلنا شروع کریں تو سامنے گلی گل زمان میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اِسی گلی میں کچھ قدم کے فاصلے پر دائیں جانب ایک کوچہ نظر آتا ہے۔ جی ہاں وہی کوچہ جس کے اندر بادامی کلر کا فولادی دروازہ ہے۔ داخلی گلی کے اس دروازے کو پار کرنے کے بعد نیم تاریک ڈیوڑھی شروع ہو جاتی ہے، جس کی بائیں جانب لوہے کا زنگ آلود زینہ اوپر کو جاتا دکھائی دیتا ہے۔ زینے کی سمت لکڑی کا ایک کمزور سا دروازہ ہے، جو ہلکے سے جھٹکے سے بے آواز کھلتا چلا جائے گا اور آپ ایک چھوٹے سے کمرے میں داخل ہو جائیں گے۔ اس چھوٹے سے کمرے کو آپ ڈرائنگ روم، ریسٹ روم پلس لاؤنج، جبکہ اس کے چھوٹے سے طول وعرض کو دیکھتے ہوئے آپ کچھ اور بھی پلس کر سکتے ہیں۔ کمرے میں بالکل سامنے بچھی چارپائی پر سلیقے سے بچھا بستر، قریب ہی پڑا چھوٹا سا ٹی وی، کارپٹ پر دھرا کمپیوٹر، تین چار کرسیاں، کوری مٹی کا ایک گھڑا، چھوٹا سا میز جس پر پڑی چنگیر میں لپٹی روٹیاں۔ آپ کی نظریں گھومتی گھامتی ٹی وی کے پیچھے بنے شیلف پر جا نکلیں تو آپ کی سانسیں حیرت سے سینے کے اندر جا اٹکیں، اس حصے میں نہایت ہی قرینے سے سجی ادبی کتب کا جلد لگا انبار اور ارد گرد کی اٹریکٹ کرتی اور یجنلٹی۔ چھوٹے سے نیم پختہ کمرے پر مشتمل یہ اس گلی کا سب سے غریبانہ گھر ہے۔ آج کے ماڈرن دور میں جب ثقافتی خوبصورتیوں سے مالا مال

شہر کے باسی اپنی قدیمی روایات اور ثقافتوں کی ایسی کی تیسی کرنے پر تلے ہوئے ہیں، وہیں اُن کے درمیان قدیم طرز و تعمیر والے ایک چھوٹے سے کمرے میں جدید سوچ کا حامل ایک قدآور شخص بھی رہائش پذیر ہے۔ مادیت پرستی سے کوسوں دور اس شخص نے بڑی جرأت و بہادری کے ساتھ اپنی ثقافتوں اور قدیم روایتوں کو مضبوطی سے تھام رکھا ہے۔ ٹھنڈی، سیلن زدہ اور نیم تاریک گلی میں جدا راستہ بنانے والی روشنی کی اس باریک سی کرن کا نام ہے تسلیم فیروز۔

شام کے دھندلکے میں سعید بھائی کے ہمراہ تنگ و تاریک گلیوں سے گزرنے کے بعد جب تسلیم فیروز صاحب کے در پر دستک دی تو خوشگوار حیرت کے ساتھ ہمارا استقبال کیا گیا۔ لوڈ شیڈنگ کے باعث کمرے میں جلتی واحد چارجنگ لائٹ نے کمرے کو کسی حد تک مکمل تاریکی سے بچا رکھا تھا اور گرما کی گیلی چڑیا کی طرح اپنے آپ میں سمٹے بیٹھے اس عظیم شخص کے پورے وجود پر ایک ملگجی سا اندھیرا سایہ فگن تھا۔ تسلیم فیروز ایک شخص نہیں بلکہ ایک عہد کا نام ہے۔ ایک ایسا بختاور عہد کہ جب سادگی سے زیادہ سادہ اور فطرت سے زیادہ قریب ڈیرہ وال سوسائٹی میں صبر و برداشت، تحمل اور عزت و احترام کا مادہ موجود تھا۔ اور ہوتا بھی کیوں ناں؟ کیونکہ برداشت ہی سرائیکی وسیب کی پہچان اور اس کی اصل خوبصورتی تھی۔ سرائیکی وسیب کے پرامن شہر، سٹی آف انٹلیکچوئل (ڈیرہ اسماعیل خان) میں پیدا ہونے والے اس شخص نے ایم اے اردو کرنے کے بعد اپنے آپ کو ونیسم کالج میں درس و تدریس کے مقدس ترین پیشے سے منسلک کر دیا۔ علم و ادب سے وابستہ، عجز و انکساری کے پیکر، روشن خیال اور ترقی پسند سوچ کے حامل، کلین شیو چہرے پر نظر کا چشمہ سجائے تسلیم فیروز صاحب نے اگرچہ وقت سے پہلے ریٹائرمنٹ لے لی مگر پڑھنا لکھنا ترک نہ کیا۔ اُن کا شعری مجموعہ 'لہو کی خوشبو' کافی عرصہ ہوا منظر عام پر آچکا ہے۔ سعید بھائی نے تسلیم صاحب کی ادبی خدمات کے بارے میں تھوڑا سا تبصرہ کیا اور اس کے بعد تو باتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ ماہنامہ فنون لاہور کا ایک ادبی پرچہ تھا جو احمد ندیم قاسمی کی زیرادارت شائع ہوا کرتا تھا۔ تسلیم صاحب نے فنون کے لیے بھی لکھا۔ فنون کی کئی جلدیں ان کی الماری میں آج بھی قرینے سے سجی نظر آتی ہیں۔

تسلیم صاحب کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے ہر دور میں کسی بھی پارٹی کا ایندھن بننے کی بجائے

اپنے آپ کو سیاسی وابستگیوں سے آزاد کیے رکھا۔انقلابی سوچ کے حامل اس شخص نے ہمیشہ جمہوریت کو ناکام کرنے والوں کی کھل کر نفی کی اور صرف حق کا ساتھ دے کر مظلوموں کی بات کی۔ڈیرہ کی سرزمین پر ایک وقت ایسا بھی آیا جب اُن کا شہر اُنکے اپنے باسیوں کے لیے قتل گاہ بن گیا۔ایک ایسے وقت میں جب صوفیائے کرام کی دھرتی اور اسماعیل خان بلوچ کی پریم نگری میں بسنے والوں کے ذہنوں میں ایک ماتمی لہر رقصاں تھی۔جب ہر طرف کالے بادلوں کا ماتمی وجود سایہ فگن تھا اور جب ایک ان دیکھے خوف کی فضا نے سرائیکی وسیب کے پرامن شہر کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا،تسلیم فیروز جیسے باہمت شخص نے اردگرد بکھری وحشت و بربریت،سردمہری،خاموشی،لاتعلقی،بے زاری،بے رخی،ترش روئی،خوف اور اداسی کو اپنے اندر جذب کر کے تبدیلی کا عہد لے کر پھر سے جی اٹھنے اور شہر کی جلتی در و دیوار کو پھلانگ کر منتشر اہل قلم کو اکٹھا کر کے انہیں مثبت سوچ کے ساتھ لیڈ کیا اور ساتھ ہی ادبی محافل بھی سجوائیں۔شہر میں ایک طرف قتل و غارت گری اور دھما کے جاری تھے تو دوسری طرف اہل قلم برادری ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے کا درس دے رہی تھی۔ایسے میں روشنی کے ہالے میں کھڑے تسلیم فیروز سب سے نمایاں تھے جو مذہبی تفریق کو بالائے طاق رکھتے ہوئے قلم کا پورا حق ادا کر رہے تھے۔ایسے پرآشوب دور میں انہوں نے اپنے اندر کے غبار کو کیا خوب نکالا۔یہ کیسی الجھن ہے جو میرے ذہن سے جاتی نہیں ☆ خواب آور گولیاں کھا کر بھی نیند آتی نہیں ☆ مدتوں سے بند ہیں ہر ایک گھر کی کھڑکیاں ☆ اب کسی گھر میں تازہ ہوا جاتی نہیں ☆ جبر زیادہ ہو تو دب جاتی ہے لے فریاد کی ☆ بات گہری ہو تو لوگوں کو سمجھ آتی نہیں۔

دیمک زدہ معاشرے کی کسمپرسی،سالوں کی تنہائی اور اکیلے پن کے سارے ملال انکی شاعری میں بھی در آئے۔میں سبز اشارہ ہوں اسی واسطے اب تک ☆ پیچھے سے کسی نے مجھے مڑ کر نہیں دیکھا۔☆ ہم انسانوں سے اچھے ہیں پرندے ☆ فضاؤں کو کشادہ کر رہے ہیں۔

2007 سے 2010 تک کے قیامت خیز عرصے میں ڈیرہ وال اہل ادب نے اپنی مٹی کی خاطر جتنا ادب تخلیق کیا وہ کسی شاہکار سے کچھ کم نہ تھا،بالآخر اللہ پاک کی رحمت کو جوش آیا،اُس کے کرم سے شہر کے حالات سازگار ہوئے اور زندگی کا پہیہ پھر سے گھومنے لگا۔

یہ حقیقت ہے کہ سچ لکھنا، سچ سہنا اور سچ برداشت کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ بدقسمتی سے ڈیرہ کی اہل قلم برادری میں کچھ ایسے بے ضمیر لوگ بھی شامل ہوتے چلے آئے ہیں کہ جن کا قلم ہمیشہ گروی رہا اور جو فقط اس غرض سے لکھتے اور لکھواتے رہے کہ اس کے عوض فیوڈلسٹ یا ملا طبقے سے مراعات سمیٹی جائیں۔ اپنے مالی فوائد کی خاطر قلم کی حرمت کو بیچنے والوں اور شاہ سے زیادہ شاہ کے وفادار بننے والوں سے کوسوں دور تسلیم فیروز ہمیشہ اپنے نظریات پر ڈٹے رہے اور اپنی سوچ کو نیلام کر کے جھوٹ لکھنے کی بجائے نعرہ حق بلند کرتے رہے۔ وہ ریٹائرمنٹ کے بعد سے اب تک میٹرک سے بی اے تک کے طالب علموں کے لیے گائیڈیں تیار کر کے اپنی اس محنت کے صلے میں ملنے والے چند روپیوں کو پنشن کی رقم سے ملا کر عزت و آبرو کے ساتھ معاشرے میں سانسیں لیتے چلے آئے ہیں۔

سعید بھائی کے ہمراہ تسلیم فیروز صاحب سے ملنے کا میرا خواب پورا ہوا۔ میں نے تسلیم صاحب کے بارے میں جیسا سوچا تھا انہیں اُس سے بڑھ کر پایا۔ تصنع اور بناوٹ سے بے نیاز، اجلے باطن کا حامل، لبرل سوچ اور شخصی آزادی کا قائل ایک ایسا ترقی پسند ادیب اور شاعر کہ جو آج بھی اپنے کل سے مایوس نہیں۔ جس کسی نے بھی تسلیم فیروز صاحب سے ملنا ہو یا ان سے کچھ سیکھنا ہو وہ گلی گل زمان میں چند قدم کے فاصلے پر دائیں جانب کے کوچے میں سامنے نظر آنے والے دروازے پر دستک دے ڈالے۔ جی ہاں وہی دروازہ جس کے ماتھے پر میری خواہش کے مطابق جلی حروف میں یہ شعر لکھا ہونا چاہیے۔ 'میں سبز اشارہ ہوں اسی واسطے اب تک ☆ پیچھے سے کسی نے مجھے مڑ کر نہیں دیکھا'۔ جی ہاں وہی بادامی رنگت دروازہ جو ذرا فاصلے پر یوں دکھتا ہے جیسے کوئی ڈریم لینڈ یا کوئی افسانوی رہائش گاہ ہو۔ جہاں پر لوگوں کا جم غفیر آباد ہونے کی بجائے جدید سوچ کا حامل شخص تن تنہا رہائش پذیر ہے۔ وہی ایک شخص کہ جس نے بڑی جرأت و بہادری کے ساتھ اپنی ثقافتوں اور قدیم روایتوں کو مضبوطی سے تھام رکھا ہے۔ ٹھنڈی، سیلن زدہ بو میں بسی نیم تاریک گلی میں اپنا جدا راستہ بنانے والی روشنی کی اس ننھی سی لکیر کا نام ہے تسلیم فیروز۔

....

ہماری وسیب کا فنکار

یکم فروری 2011ء کی سہ پہر ابھی پوری طرح ڈھلی نہ تھی۔ اونچے، شفاف آسمان پر سورج کی جگمگاتی کرنیں ایک نرم و گرم، حدت آمیز سا کیف پیدا کر رہی تھیں۔ میں طاہر بھائی کے ہمراہ ایک ویلفیئر تنظیم ''ایس پی او'' کے زیر اہتمام، پریس کلب ڈیرہ میں مدعو کی گئی تقریب میں شرکت کیلئے سائیکل پر رواں دواں تھا۔ ثقافتی نوعیت کی اس گیٹ ٹوگیدر کیلئے شام تین بجے کا وقت مختص کیا گیا تھا۔ اس تقریب کا مقصد شہر ڈیرہ میں عرصہ دراز سے جاری قتل و غارت کے باعث ثقافتی رابطوں کی بحالی اور کلچرل ڈیڈ لاک کو توڑ کر اسے اس کی اصل روح سمیت واپس لانے کیلئے مل جل کر ایک لائحہ عمل تیار کرنا تھا۔ پریس کلب کی عمارت کے اندر جانے کا یہ میرا پہلا موقع تھا۔ وہاں پہنچتے ہی ہم نے اپنی سائیکلیں اسٹینڈ پر کھڑی کیں اور میں حسب عادت عمارت کا جائزہ لینے لگا۔ یہ ایک نئی نکور شاندار عمارت تھی جس کے ماتھے پر کسی سیاسی شخصیت کا نام نمایاں تھا۔ نام پڑھتے ہی مجھے اقبال کا شعر کچھ پھیکا پھیکا سا لگنے لگا۔

کوئی قابل ہو تو ہم شان کئی دیتے ہیں۔ ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں۔

میرے دماغ کی سوئی اٹک سی گئی اور میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ چار جنوری کی ایک کہر آلود دوپہر کو اسلام آباد ائیر پورٹ سے باہر آتے وقت بھی میں کچھ ایسی ہی کیفیت سے دوچار ہوا تھا کہ جب ائیر پورٹ

کی داخلی عمارت پر'' بینظیر انٹرنیشنل ائیر پورٹ'' لکھا دیکھا تھا۔ اُس وقت نوبل پرائز وِنر ڈاکٹر عبدالسلام، حکیم سعید اور عبدالستار ایدھی کے پرانور چہرے میری نظروں کے سامنے آ گئے تھے۔ مجھے ڈیرہ پریس کلب کی عمارت پر ڈھلتی شام کے گہرے اداس سائے میں اس شعر کی بازگشت سنائی دی۔

مکتبِ عشق کا دستور نرالہ دیکھا۔ اس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا۔

ڈیرہ پریس کلب کی عمارت کے احاطے میں بشیر راجپوت، ارشاد حسین، عجب خان اور طاہر شیرازی کے ہمراہ کھڑا میں اپنی ہی آواز کی بازگشت کے ساتھ لڑتا جھگڑتا رہا اور یہی سوچتا رہا کہ تاریخ کے ساتھ ہمارا کھلواڑ نہ جانے کب بند ہوگا؟۔ ہم کب تلک اپنے قابل ترین انسانوں کی فلاحی خدمات کا اعتراف کرنے میں بخل سے کام لیتے رہیں گے؟۔ ہم نہ جانے اور کتنے بے فیض لوگوں کو تمغے، ہار پہنا کر اوران کے ناموں سے شہروں، قصبوں، سکولوں، لائبریریوں اور پریس کلبوں کے نام رکھ کر اپنے ضمیر کو جھوٹی تھپکیاں دے کر سلاتے رہیں گے؟۔ سندھ کنارے چوہوں کی طرح خوف سے بلوں میں گھسی قوم میں کوئی تو اٹھے گا اور اس سوچ کی نفی کرے گا کہ ہم ان چہروں کو کیوں گلوریفائی کریں کہ جن کا ہماری دھرتی ، ہمارے کلچر اور ہماری سوسائٹی میں رتی برابر کنٹری بیوشن نہیں۔ میرے دماغ کی سوئی انہی سوالیہ نشانات کے درمیان اٹکی رہی۔ اسی دوران ہم سب کو پریس کلب کی عمارت سے ملحقہ ڈرائنگ روم نما کمرے میں بلایا گیا۔ کمرے کے درمیان میں بیضوی میز کے اردگرد ریوالونگ چیئرز دھری تھیں۔ روہی ٹی وی کے فاروق بلوچ اور سابق کونسلر مشتاق ڈار کے پہلو میں سوشل ویلفیئر کے سربراہ شفیع اللہ بلوچ براجمان تھے۔ اس شام ڈیرہ کے شعراء، ادیب، نثر نگار، مصور، سنگرز، صحافی، اسٹیج اور ڈرامہ آرٹسٹوں کا جم غفیر تھا بلکہ ساری ادبی کریم بمعائے الیکٹرانک و پیپر میڈیا امڈی پڑی تھی۔ ہماری قطار میں ارشاد حسین، عجب خان، طاہر شیرازی، سعید اختر، پیامی صاحب جبکہ سامنے کی طرف شاب شیخو جی، کوثر خمار اور بشیر راجپوت کے علاوہ دیگر آرٹسٹ بیٹھے تھے۔ الیکٹرانک و پیپر میڈیا سے منسلک سعید اللہ مروت، ابوالمعظم ترابی، فاروق عادل اور پہاڑ پور سے خصوصی طور پر اس تقریب میں شرکت کی غرض سے تشریف لانے والی ایم پی اے صاحبہ بھی موجود تھیں۔

روہی ٹی وی کے فاروق بلوچ نے آرٹ اور آرٹسٹ کی بحالی اور فلاح کے لیے بلائی گئی تقریب کا ایجنڈا بیان کیا جس کے بعد رسمی تعارف کا سلسلہ چل نکلا۔سب سے پہلے ارشاد حسین نے اپنے آپ کو متعارف کروایا۔ترقی پسند سوچ کے حامی ارشاد حسین منفرد انداز کے لکھاری ہیں۔ان کی باتوں میں دھیمی دھیمی ظرافت نمایاں رہی۔ان کی کتاب یہ داغ داغ اجالا پڑھی تو پتہ چلا کہ وہ اپنی سوچ اور تحریر سے دنیا میں مثبت تبدیلی لانے کیلئے پرعزم ہیں۔ان کے اندر کے کریٹیو رائٹر کو سلام۔پھر طاہر شیرازی کی باری آئی۔انحراف اور ماسوا لکھنے والے اِس شاعر کو کون نہیں جانتا تھا مگر جب سے طاہر نے جاتراں لکھی ہے وہ دل میں کھُب سے گئے ہیں۔میرے لیے وہ ایک ایسے کرسٹل گلاس کی مانند ہیں کہ جن کے آر پار دیکھا جا سکتا ہے۔پھر اُس مدبر و سنجیدہ،اندر سے گہرے اور کیرنگ انسان کی باری آئی جنہوں نے اپنے ذہن کے کینوس پر بنی من پسند تصاویر اور رنگا رنگ مناظر کو برش کی مدد سے بے نام کاغذ پر اتار کر نہ صرف اسے زندگی بخشی بلکہ اپنے فن کو پاکستان بھر میں متعارف کروا کر شہر ڈیرہ کو انوکھی پہچان دلوائی۔یہ عجب خان تھے۔عجب خان سے مل کر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کچھ لوگ بہت کم بولتے ہیں مگر اچھا بولتے ہیں،ان کے کہے گئے الفاظ سیدھا دل میں اتر جاتے ہیں۔یہ اس لمحے کا اعجاز ہوتا ہے یا پھر کہنے والے کے خلوص کا اثر،میرے خیال میں سارا مسئلہ ٹائمنگ کا ہوتا ہے۔عجب خان ایک پرخلوص ٹائمر ہیں۔

رئیل لائف میں لونگ،ویل ایجوکیٹڈ سعید اختر سیال جن کی ذات خصوصاً میرے لیے کسی گاڈ فادر سے کم نہیں۔انہوں نے ہم سب کی معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے بتایا کہ رحیم بازار(رام بازار) میں قائم رام لیلا نامی عمارت قیام پاکستان سے پہلے فنون لطیفہ کی سرگرمیوں کا اہم مرکز ہوا کرتی تھی۔سعید بھائی کی باتوں سے مجھے ڈیرہ کا وہ سہانا دور یاد آنے لگا جب اغواء اور موت کے خوف سے بے نیاز،ثقافتی اور تعلیمی لحاظ سے بلندیوں کو چھونے والا شہر اپنے لوگوں کی فراخ دلی کے باعث وسیب بھر میں مشہور تھا۔توپانوالہ روڈ کا درجہ لاہور کی مشہور مال روڈ سے کچھ کم نہ تھا۔شہر کی آبادی شام کو دریا کی سیر کیلئے نکلتی اور اسے تفریح کا ذریعہ سمجھتی تھی۔جمیل ہوٹل ادیبوں کی آماجگاہ تھا۔پلازہ اور ٹیٹلر سینمائیں شہر کی تفریح گاہیں تھیں،نوجوان بغیر کسی خوف کے تین تین بجے کے شو دیکھنے جاتے تھے۔اس وقت سیاسی قوت کا بھوکا

مولوی سماج دشمن ضیاء کے ساتھ مل کر سماج پر قبضہ جمانے کے منصوبے بنا رہا تھا۔ ویتنام میں الجھے امریکہ کی توجہ ابھی اس خطے کی طرف نہیں گئی تھی۔ پھر یہ ہوا کہ ضیاء اور اس کے حواریوں نے اپنی اولادوں کے روشن مستقبل کی خاطر ہر پیدا ہونے والے بچے کی گردن میں امریکی غلامی کے طوق پہنا ڈالے، اُسی دن سے ہمارے فنکار کو بھی موت آ گئی۔

ہماری قطار میں بہت سے فنکار بیٹھے تھے، مگر میں صرف پیامی صاحب سے آشنا تھا اور ان سے 2007ء میں فاروق عادل کے ہمراہ ملاقات بھی ہو چکی تھی۔ پیامی صاحب نے ڈیرہ میں اپنی مدد آپ کے تحت کچھ فلمیں بھی بنائیں اور وہ شاعری بھی کرتے ہیں۔ سامنے والی قطار میں پرفارمنگ آرٹ کے شعبے سے منسلک نوجوان سنگرز اور ڈرامہ آرٹسٹوں نے اپنا اپنا تعارف کروایا۔ پرفارمنگ آرٹ کے تین درجے ہیں۔ موسیقی، ڈرامہ اور رقص۔ اس کے علاوہ مجسمہ سازی، پینٹنگز، اسکیچز، نقاشی وغیرہ یہ جو کچھ بھی ہے وہ تخلیقی آرٹ ہے۔ اسی آرٹ سے وابستہ کھوجتی آنکھوں والے شباب شینخو جی کی جب باری آئی تو انہوں نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے خوب ''ھاں دِی وِسِی'' نکالی۔ ان کی باتیں سن کر ایسے لگا جیسے بانسری کی سریلی آواز ہوا پر در آئی ہو، جس کی لے پر کوئی دکھ بھرے ماہیے گا رہا ہو۔ شینخو جی کو سنتے ہی میرا ذہن فلیش بیک میں چلا گیا۔ واقعی کچھ چیزیں کبھی پرانی نہیں ہوتیں۔ نہ محبت، نہ محبت کے دکھ اور نہ ہی دکھ بھرے ماہیے۔ کوثر خمار کو میں ایک کالمسٹ کی حیثیت سے جانتا تھا، مجھے پتہ نہ تھا کہ وہ ٹی وی آرٹسٹ بھی ہیں۔ خمار صاحب بہت اچھا بولے اور کسی دوسرے کیلئے بولنے کی قطعاً گنجائش نہ چھوڑی۔ شینخو جی اور کوثر خمار کے روپ میں بیٹھے فنکار اپنی ذات کی نفی کیے اپنی صلاحیتوں کا رونا رو رہے تھے۔ اسے ہم اپنے معاشرے کے المیہ کردار بھی کہہ سکتے ہیں۔

پتہ نہیں ہمارے معاشرے کے فنکار کا کردار گاؤں کے کمہار سے کیوں اتنا ملتا جلتا ہے، جس طرح کمہار ایک مخصوص اسپیڈ اور ردھم کے ساتھ گردش کرتی چکنی مٹی کی ڈھیری کو بڑی چاہت کے ساتھ آرٹسٹک ہاتھوں، انگلیوں کی پُوروں اور ناخنوں کے لمس سے آشنا کر کے کسی مخصوص سانچے میں ڈھال کر اس کی تجسیم کا اہتمام کرتا ہے، بالکل اسی طرح ایک فنکار بھی اپنے اندر چھپی صلاحیتوں کو پبلک کے سامنے لا

کران سے داد وصول کرتا ہے۔ایک وقت تھا جب فنکار، صناع کار اور کاریگر اپنے اپنے فن میں مہارت حاصل کرنے کے بعد اپنا آرٹ حاکمِ وقت کے سامنے پیش کیا کرتے تھے،لیکن اب وہ دور چل نکلا ہے کہ جب ہمارے اوریجنل فنکار کو کمہار سے بھی بدتر بلکہ کوزہ گر کے بنائے اس حساس برتن کو بھانڈ، مراثی، گویا، پینٹر بابو اور نہ جانے کن کن القابات سے نواز کر انہیں پیک دان بنا دیا گیا ہے۔

شینخو جی اور کوثر خمار کی باتیں سن کر ایسے لگا جیسے ہم اپنا بہت کچھ گنوا بیٹھے ہیں۔ جیسے برستی بارش میں گندھی خوشبو لٹاتی گیلی مٹی، برگد کی شاخوں کے ساتھ لٹکتے رنگ برنگے دھاگے اور آسمان پر سجی قوس قزح میں بکھرے سپتا سندھو کے سارے رنگوں کو کسی بلیک ہول نے نگل لیا ہے۔ ہمارے میلے ٹھیلے، ہماری مٹی سے جڑی رسمیں، ہماری دریس، ہماری دھاونیاں، ہماری رونقیں اور ہماری کلچرل ایکٹیویٹیز۔۔ ہماری بہت سی ایسی قیمتی چیزیں جو ہم سے کھوگئی ہیں ان میں ہمارا وہ انمول فنکار بھی شامل ہے جو ہم سے کہیں گم ہو گیا ہے اور آج تک نہیں مل پایا۔

ذرا سوچیں ایسا کیوں ہوا؟ نظر اٹھا کر دیکھیں، موازنہ کریں کہ مغرب میں تھیٹر کئی سو سالوں سے زندہ چلا آ رہا ہے۔ ہندوستان میں کلاسیکل موسیقی نہ صرف کئی نسلوں سے زندہ ہے بلکہ وہاں آرٹ اور موسیقی کے فروغ کیلئے کئی ادارے قائم کیے جا چکے ہیں۔آرٹ تخلیق کا دوسرا نام ہے اور تخلیق سے وابستہ ہر شعبہ ریسرچ اور آزادانہ سوچ کا متقاضی ہے، مگر ایک ہم ہیں کہ تہذیب سے لے کر آرٹ، فلسفہ اور سائنس تک ہر شعبے میں زوال پزیری کا شکار ہو چکے ہیں۔

ہم ایسے نہ تھے۔ برصغیر کی تقسیم سے پہلے جس قسم کا تعلیمی نصاب تھا اس میں ایک اچھی بات تھی کہ چونکہ ہندوستان تمام مذاہب کے ماننے والوں کا مشترکہ خطہ تھا اسی لیے نصاب میں بھی تمام مذاہب اور اقوام کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ملٹی کلچرل سوسائٹی کے باعث یہاں کے لوگوں کے ذہنوں میں برداشت کا مادہ بھی موجود تھا۔آزادی ملنے کے بعد ہندوستانی لیڈرشپ نے اپنی عوام کیلئے نہ صرف سیکولر بنیادوں پر بہترین سیاسی اور جمہوری نظام وضع کیا بلکہ اپنی تاریخ، کلچر اور ثقافت سمیت فنونِ لطیفہ کے ہر شعبے کو گلے سے لگایا، انہیں بخوبی اندازہ تھا کہ اسی سے ہی کسی تہذیب کا معیار مقرر ہوتا ہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد ہم نہ صرف فنونِ لطیفہ، کلچر اور ثقافت بلکہ سب سے بڑھ کر اپنی تاریخ کے منکر ہو گئے۔ سرکاری منشیوں سے لکھوائی گئی تاریخ میں ہمیں رٹوایا گیا کہ ہماری تاریخ کا آغاز محمد بن قاسم کے ہندوستان پر حملے سے شروع ہوتا ہے۔ ہم اپنی آنے والی نسلوں کے معصوم ذہنوں میں مطالعہ پاکستان کے نام پر آج تک جو کچھ رٹواتے رہے ہیں اس کا مقصد کچھ اور نہیں بلکہ ہندوستان کو ہندوؤں کا ملک اور اپنے ہی خطے کی ثقافت کو ہندو ثقافت قرار دے کر اُن سے فاصلے بڑھانا اور نفرتیں پیدا کرنا تھا۔ ہم اپنے بچوں سے لاکھ چھپائیں لیکن سچ یہی ہے کہ اشوکا ہی ہمارے خطے کا سب سے بڑا حکمران تھا۔ پولٹیکل سائنس کی پہلی کتاب ارتھ شاستر ہماری ہی سرزمین کا افتخار ہے۔ دنیا کی سب سے پہلی کتاب رِگ وید سپتا سندھو (سات دریاؤں کی دھرتی) پر بیٹھ کر لکھی گئی تھی۔ ہماری روایات، ہمارا کلچر، ہماری تہذیب و تمدن، ہماری زبان ہزارہا سال پرانی ہے۔ ہمارا کلچر محمد بن قاسم کے ساتھ بحری جہازوں میں تیر کر ہم تک نہیں پہنچا بلکہ عرب فاتحین اور افغانستان سے آنے والے اَن کلچرڈ، سفاک حملہ آوروں نے ہم سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ یہ خطہ ہزارہا سال پہلے اُس وقت بھی چاندی کے پھول اور گندم کے دانے اگلتا تھا جب دوسری تہذیبیں زراعت سے نا آشنا تھیں۔ رِگ وید کہتی ہے کہ جب سندھ کنارے آباد سرائیکی دھرتی پر پھولوں کی فراوانی اور شہد کی مکھیوں کی بہتات تھی، تب کپاس کے پھولوں کو چن کر کپڑا بنا جاتا، اجرک بنائی جاتی، جسم ڈھانپا جاتا اُس وقت دنیا کی نام نہاد تہذیبیں ننگی منجھی پھرا کرتی تھیں۔ سچ یہی ہے کہ سندھ کنارے بسنے والوں نے پوری دنیا کو تہذیب سے آشنا کیا تھا۔ ہم مانیں یا نہ مانیں حقیقت یہی ہے کہ ہندوستان کی تاریخ اور ثقافت کا ارتقائی سفر سندھ کنارے شروع ہوا اور یہیں پر ہی اسے عروج حاصل ہوا تھا۔ ہند، سندھ اور سندھو کے حوالے سے ہم ایک زبردست ورثے کے مالک تھے مگر پچھلے چونسٹھ سالوں میں اپنی تاریخ اور ثقافت سے منہ موڑ کر ہم نے کیا پیدا کیا؟۔ گاربیج اور صرف گاربیج۔ ہم گزشتہ چھ دہائیوں سے گاربیج کو ہی مسلسل ری سائیکل کرتے چلے آرہے ہیں۔ مگر گاربیج، گاربیج ہی رہتا ہے چاہے اسے جتنا بھی گرم کر کے کسی بھی شکل میں کیوں نہ ڈھال لیں وہ کبھی سونا نہیں بن سکتا۔ اب وقت آگیا ہے کہ چودہ اگست کے دن ملنے والی نام نہاد آزادی پر کھل کر ڈیبیٹ ہونی چاہیے۔ یہ کیسی آزادی تھی کہ جس نے ہمارے معاشرے

سے فنکاروں کو نگل کر چورا چکوں کو آگے لانا شروع کر دیا تھا۔

کہتے ہیں کہ نیکی اور بدی کا رواج زمانہ ازل سے چلا آ رہا ہے، لیکن قدیم زمانے کے چوروں، عیاروں اور ٹھگوں میں کم از کم اتنی شرم وحیا اور شرافت ضرور تھی کہ وہ اپنی الگ بستیاں بنا کر رہتے تھے۔ آج کل کے ٹھگ بڑے طنطنے کے ساتھ عوام میں دندناتے پھرتے ہیں۔ کسی کے ماڈل فارمز میں بنے عظیم الشان محلات ہیں تو کوئی مسجد ومحراب کی آڑ میں بنے بنگلوں میں رہائش پزیر ہے۔ یہ بنارسی ٹھگوں کی وہ کھیپ ہے جو تقسیم کے بعد ہمیں تحفتاً ملی ہے۔ ان فنکاروں میں سے کوئی مذہب کو فن کے طور پر استعمال کر کے کروڑ پتی بنا، کسی کو ہیروئن اور اسمگلنگ کے کاروبار نے ارب پتی بنایا، کسی کو افغان جہاد نے، کسی کو ہجرت کے جھوٹے کلیموں نے اور کوئی اس سے بھی بہت پہلے اُس وقت کروڑ پتی، نسلی اور اصلی بنا جب اپنے ہی لوگوں کی لاشوں کو کچل کر گوری چمڑی والوں سے اپنی وفاداریوں کے عوض ہزار ہا ایکڑ پر پھیلے ناجائز مربعے سمیٹے۔ جس کسی نے بھی اپنی عیاری، مکاری اور فنکاری سے جہاں کہیں سے بھی پیسہ اکھٹا کیا اپنے گرد کردار کا ایک جھوٹا حصار بنا لیا۔ ایسی صورتحال میں اور یجنل فنکار کو موت آنے لگی اور آرٹ کا جنازہ نکل گیا۔ صورتحال یہ ہے کہ تصویر کشی جیسی بے ضرر اور پروڈکٹیوا یکٹیویٹی ہمارے ہاں جائز نہیں۔ ہمارے ہاں فائن آرٹس کا جو تصور قرار دادِ مقاصد کی منظوری کے بعد پروان چڑھا ہے اس نے ہماری سوچوں کا زاویہ بدل ڈالا ہے۔ فنون لطیفہ کو ہم نے پہلے دن سے ہی عیاشی اور فحاشی کے مترادف جان کر جوتے کی نوک پر رکھ لیا تھا، لے دے کر صرف خطاطی آ بچی ہے، مگر وہ بیچاری بھی اپنی تمام تر جمالیاتی حسیات کے باوجود وہ مقام حاصل نہیں کر پائی کہ جس کی وہ مستحق تھی۔

انسانی دنیا کی کوئی بھی سوسائٹی فنون لطیفہ اور سائنس سے کٹ کر کبھی زندہ نہیں رہ سکتی۔ کسی بھی قوم کے ثقافتی تہوار، میلے ٹھیلے اس قوم کے اندر چھپے جذبات کو بڑھاوا دے کر اسے ایک نیا جوش اور ولولہ عطا کرتے ہیں۔ انسانی خون کے اندر گردش کرتی انرجی انسان کو اپنے ہونے کا احساس دلاتی ہے۔ یہ ایک فطری عمل ہے کہ جب بندہ ڈھول کی تھاپ پر بے ساختہ دریس مارتا ہے تو وہ اپنے اندر کی چھپی جھجک کو باہر نکالتا ہے۔ یہ عمل نہ صرف اسے نیا اعتماد اور حوصلہ دیتا ہے بلکہ اس کی سوچ کو ایک نیا زاویہ بھی ملتا ہے۔ اگر

ہم اپنے جذبات واحساسات کو اپنے اندر دبا کر رکھیں گے تو یہ مرنے کی بجائے اپنے اظہار کا طریقہ بدل کر کسی نئی شکل میں اپنا غبار ضرور نکالیں گے اور اگر یہی جذبہ خدانخواستہ کسی تخریبی عمل کا حصہ بنا تو پھر لازماً سوسائٹی کا المیہ جنم لے گا اور یہ لے رہا ہے۔آج ہماری سوسائٹی اسی المیے سے دوچار ہے، ہمارے سماج کو سب سے بڑا خطرہ انتہا پسندی سے ہے۔

انتہا پسندی کیا ہے؟۔ایک عام آدمی کے نزدیک انتہا پسندی صدیوں سے گروی رکھے غلام ذہنوں میں پنپنے والی سوچ کا نام ہے۔ یہ ایک ایسا سماجی رویہ ہے جو ہر اُس چیز کا جانی دشمن ہے جس کے زریعے لوگ اپنی خوشیوں، مسرتوں اور سرشاریوں کا اظہار کرتے ہیں۔اس سوچ کے حامل افراد کو نہ رونقیں اچھی لگتی ہیں، نہ میلے ٹھیلے اور نہ ہی مسرت سے سرشار چہرے۔ان کا بس چلے تو یہ جیتی جاگتی سوسائٹی کو قبرستان بنا کر ملیامیٹ کردیں، اگرچہ یہ لوگ اپنی طرف سے ہزارہا کوششیں کر بھی چکے لیکن ناکامی ان کا مقدر رہے۔

بلاشبہ ڈیرہ کے فنکاروں میں تخلیقی صلاحیتوں کی ہرگز کمی نہیں، یہاں کے لوگوں میں بے پناہ صلاحیتیں پوشیدہ ہیں، مگر افسوس کہ شدت پسند سوچ کے حامل یرغمالیوں نے ہمارے معاشرے کے فنکار کو نفسیاتی مریض بنا کر رکھ دیا ہے۔دنیا کے سارے خفا لفظ بوجھ کی طرح اپنے اوپر لادے، رندھے، سپاٹ لہجے میں منتشر سوچوں کے ساتھ اپنا حال دل بیان کرنے والے فنکاروں کا شکوہ بجا کہ اب یہاں اُلو بولتے ہیں۔واقعی یہاں اُلو بولتے ہیں لیکن وہ وقت دور نہیں جب حملہ آوروں کی ننگی تلواروں کے زخم سہتی، سمندر سے وسیع ظرف کی مالک سرائیکی دھرتی اپنی وِل پاور کی بدولت دھیرے دھیرے اپنے اصل کی طرف واپس لوٹے گی کیونکہ اپنائیت، رواداری، برداشت اور تصوف کے حسین رنگ لیے پریت اور مٹھاس کی ڈوری سے بندھی محبت اس خطے کا ثمر بھی ہے اور تخم بھی۔

شدت پسندی اور فرقہ پرستی کے لبادے میں ہماری دھرتی ماں کو زخم دینے والے، اس کی تہذیب وتمدن کے دشمن اور اس سے جڑی روایات کا احترام وتکریم نہ کرنے والے کہیں اور سے درآمد کیے گئے ہیں، ان کی جڑیں ہمارے معاشرے میں زیادہ گہری نہیں ہیں۔انشاء اللہ یہاں کا ثقافتی جمود ضرور

ٹوٹے گا۔ برستی بارش میں گندھی خوشبو لٹاتی گیلی مٹی، برگد کی شاخوں کے ساتھ لٹکتے منت بھرے رنگ برنگی ریشمی دھاگے، ہماری سُکھیں، ہماری جنجیں، ہماری دھاونیاں، ہماری رونقیں، ہماری دریسیں، ہمارے میلے ٹھیلے، ہمارے فنکار، ہمارے سازندے، ہمارے سارنگی نواز اور قلا کار پھر سے جی اٹھیں گے اور عظیم سرائیکی خطے کا اہم شہر ڈیرہ پُھلاں دا سہرا واپس اپنے اصل رنگوں میں پھر سے رنگ جائے گا۔

اوائل فروری کی نرم و ہلکی خنکی میں لپٹی دھندلی شام کو آس، امید اور یقین کے جگنو ہاتھوں میں لیے یہی فیصلہ ہوا کہ اس قسم کی ثقافتی سرگرمیاں، ادبی میل ملاپ اور سوشل گیٹ ٹوگیدر کی محفلیں جاری رہنی چاہئیں تا کہ ہمارے فنکاروں کو ایک پلیٹ فارم مہیا کیا ہو سکے اور یہ لوگ اپنے ردھم میں واپس آ کر فن کی خدمت کر سکیں۔

....

ایک شام سمیع اللہ کے نام

یکم فروری کی سرمئی شام تقریباً تاریکی میں ڈھل چکی تھی۔ پرندوں کی قطاریں کب کی اپنے گھروں کو لوٹ چکی تھیں۔ پریس کلب ڈیرہ میں جب ''ایس پی او'' کے تحت فن اور فنکار برادری کی بقا کے لیے منعقدہ پروگرام اختتام پذیر ہوا تو چیف ایڈیٹر اپنا اخبار جناب سعیداللہ مروت کی سربراہی میں عجب خان اور طاہر شیرازی کے ہمراہ ہم اُن کے دفتر کی طرف روانہ ہوگئے۔تقریباً پانچ منٹ کی مسافت پر مدینہ مارکیٹ میں اپنا اخبار کے دفتر میں اپنی بے ترتیب سانسیں ہموار کرتے ہی ہم سب نے جیو ٹی وی کے پروفیشنل کیمرہ مین قیس جاوید کو ان کی سرائیکی زبان کی تاریخ اور کلچر پر لکھی تازہ ترین کاوش پر مبارک باد دی۔ابھی ہم نے قیس کے ہاتھوں کی بھاپ اڑاتی سبز چائے کے چسکے لینے شروع کیے ہی تھے کہ مروت صاحب نے حیران کن خوشگوار انکشاف کیا:''ہم سب ڈاکٹر خالد کے ہاں چل رہے ہیں جہاں پر ڈیرہ کے ابھرتے نابینا سنگر سمیع اللہ سے ملاقات کا چانس ہے''۔سمیع کو میں جیو ٹی وی کے لیے خصوصی طور پر بنائے گئے مروت صاحب کے ویڈیو کلپ میں کافی عرصہ پہلے پرفارم کرتا دیکھ چکا تھا۔ پتہ نہیں یہ سمیع جیسے بظاہر نابینا مگر دل کا نور رکھنے والے فنکار سے ملنے کا اشتیاق تھا یا پھر تجسس کہ سب جانے کے لیے تیار ہوگئے۔سعیداللہ صاحب نے اپنی بائیک باہر نکالی اور سڑک پر آتے ہی ایک زوردار کک لگا دی۔عجب

خان نہایت پھرتی سے پشت پر سوار ہوئے، طاہر اپنے مخصوص اسٹائل سے سائیکل پر چڑھے، میں بھی ان سب کے ہمراہ سائیکل دوڑانے لگا۔ ہمارا رخ ڈاکٹر خالد کی رہائش گاہ کی جانب تھا جہاں پر وہ سمیع کے ہمراہ ہم سب کے منتظر تھے۔ پندرہ منٹوں کے پیڈل مارچ کے بعد ہم ڈاکٹر خالد کے مہمان خانے پر پہنچ گئے۔ اس وقت انکی بیٹھک میں پہلے سے چند مہمان موجود تھے۔ ان سب کے سامنے سفید شلوار قمیص میں بان کی چارپائی پر بیٹھے سمیع اللہ نمایاں تھے۔ سمیع کے دائیں ہاتھ اس کا ایک گروپ فیلو نسواری چادر میں احساس کی خوشبو اپنے گرد لپیٹے کسی گہری سوچ میں گم سم بیٹھا دکھائی دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے سمیع سے ہم سب کا تعارف کروایا اور پھر دھیرے دھیرے اُس کے حالات زندگی بیان کرنا شروع کر دیئے۔ سمیع اللہ بینائی سے محروم ان چند نوجوانوں میں سے ایک ہے کہ جنھوں نے نامساعد حالات کے باوجود عام ڈگر سے ہٹ کر موسیقی میں اپنا نام پیدا کرنے کی ایک کوشش کی ہے۔ سمیع نے ایک غریب گھرانے میں آنکھ کھولی ،اسے نابیناؤں کے ایک سرکاری سکول میں داخل کروایا گیا۔ یہ ڈاکٹر خالد ہی تھے کہ جنھوں نے سمیع کی موسیقی میں رغبت دیکھتے ہوئے اُن کے اندر کے چھپے فنکار کو باہر نکالا۔ ڈاکٹر صاحب کے کینیڈا میں مقیم ایک دوست نے انہیں آلات موسیقی خرید کر دیئے۔ ڈاکٹر خالد نے سمیع کو موسیقی کی باقاعدہ تربیت دلوانے کے لیے استاد کا اہتمام کیا اور اس طرح اُس کی گرومنگ کا سلسلہ چل نکلا۔ تھوڑے ہی عرصے میں سمیع نے اپنے تین نابینا دوستوں کے ساتھ مل کر ایک میوزیکل گروپ تشکیل دیا۔ دھیرے دھیرے اس گروپ نے اپنی محنت اور لگن سے سامعین کو اس قدر متاثر کرنا شروع کیا کہ ان کا شہرہ بی بی سی سمیت ملک بھر کے الیکٹرانک میڈیا میں ہونے لگا۔ سمیع اللہ اپنے گروپ کو لیڈ کرتے ہیں، وہ ہارمونیم بجانے کے ساتھ ساتھ گلوکاری بھی کرتے ہیں جبکہ باقی ماندہ ممبر طبلہ، دف اور پیانو بجاتے ہیں۔ ان چار نوجوانوں نے مل کر پچھلے سال سرائیکی گانوں پر مبنی اپنا پہلا البم بھی ریلیز کیا تھا، جسے سرائیکی وسیب میں کافی پذیرائی ملی تھی۔ چارپائی پر تکیہ سے پشت لگائے جب ڈاکٹر صاحب سمیع کے حالات زندگی بتا رہے تھے تو سمیع اپنی بڑی بڑی آنکھوں کے پٹ کھولے اُن کی گفتگو بڑے انہماک سے سن رہے تھے اور ساتھ ہی ہرا بھرنے والی آواز کی سمت چہرہ کیے ایک ہلکی سی مسکان بکھیر رہے تھے۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ایسے کھیل رہی تھی

جیسے صبح کی کرن پھوٹ رہی ہو۔ مجھے اس وقت سمیع کی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی چمک دکھائی دی ۔طاہر شیرازی، حشمت علی، سعیدا اللہ مروت سمیت ہر کوئی سمیع کو اشتیاق بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ہمارے درمیان عجب خان جیسے شہرہ آفاق مصور بھی موجود تھے جو سمیع کو اپنی آنکھ کے کیمرے میں سموئے ایک ایسے آبجیکٹ کی صورت تکے جا رہے تھے کہ جس طرح روح میں اتر کر کوئی تخلیق کار کسی آبجیکٹ کا اسکیچ یا امیج بناتا ہے۔

گانا سننے کی فرمائش سمیع کے کانوں سے ٹکراتے ہی چارپائی کے نیچے پڑے جستی صندوق اور کچھ کارٹن کے ڈبوں کے درمیان کپڑے میں لپٹا ہارمونیم باہر نکالا گیا۔ موسیقی کے مخصوص راگ ''سارے گاما پادا نیں سا'' سے وارم اپ لیتے ہی سمیع کی کھنکھناتی آواز کمرے کے اندر گونجنے لگی۔ ''ہک وارِیں قاصدوَل وَنج تُوں۔ اَوکھے بول نہ بول یار ملنگاں نال''۔ سُر اور ساز کی ٹائمنگ بنتے ہی سمیع نے روح کی گہرائیوں سے وسیب کے منفرد شاعر جناب شاکر شجاع آبادی کا شہرہ آفاق کلام چھیڑ دیا۔ ماحول میں پھیلی خوشگوار ٹھنڈک دھیمی موسیقی کے پس منظر کے ساتھ گھل مل کر ایک الگ ہی ساز تخلیق کر رہی تھی۔

''فجر دا سجھا اُبھر داہ سُچیندے شام تھی ویندی۔ خیالاں وِچ سیکوں اج کل بُولیندے شام تھی ویندی''

کمرے کا ماحول نیم خوابیدہ اور سحر انگیز بن چکا تھا۔ ہارمونیم کی مدھ بھری دھنوں پر رنگ و خوشبو کی سرسراہٹ واضح تھی۔ گانا گاتے وقت سمیع کا چہرہ شدت جذبات سے کسی ملکوتی نور سے چمک رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور ہونٹ ہولے ہولے ہل رہے تھے۔ ماحول پر ایک مکمل سکوت طاری تھا مگر سمیع کی میٹھی گنگناتی آواز اس سکوت کا حصہ معلوم ہو رہی تھی۔ کسی سحر کار محفل میں شریک ہونے کا یہ پہلا موقع تھا۔ سمیع نے آدھے گھنٹے تک موسیقی کی وجد بار تانوں اور اپنی مدھ بھری آواز کے سحر میں ہم سب کو جکڑے رکھا۔ گانے کے اختتام پر سب نے اسے دل کھول کر داد دی۔ داد و دہش کے اس سلسلے کے درمیان میں سوچنے لگا: فن واقعی ایک بہت بڑا قیمتی گوہر ہے۔ اپنے من میں طوفان چھپائے بیٹھے اس نوجوان کے اندر اگر کوئی جھانک کر دیکھے تو اسے بڑی حیرت انگیز، دلکش اور پرکشش وادی دیکھنے کو ملے گی، جہاں غموں، خوشیوں اور تمناؤں کا امتزاج، دکھوں، تشویشوں اور امنگوں کا نیا جہان نظر آئے گا۔ سمیع کا کہنا ہے کہ اسے

موسیقی سے عشق ہے۔ وہ جب شاکر کا دکھ بھرا کلام گاتے ہیں تو ان کی گھٹن زدہ تاریک زندگی میں ہر طرف اجالا ہو جاتا ہے۔ موسیقی نہ صرف انہیں روحانی تسکین دیتی ہے بلکہ یہ اُن کی اپنی ذات کے اظہار کا ایک مثبت ذریعہ بھی ہے۔ وہ آگے چل کر اسے ایک باقاعدہ پروفیشن کے طور پر اپنانے کا ارادہ کیے بیٹھے ہیں۔ مجھے اس نوجوان کے اسٹیمنے اور وِل پاور نے کافی حد تک متاثر کیا۔ ہم نے جتنا وقت ڈاکٹر خالد کی بیٹھک میں گزارا سرائیکی وسیب کا یہ نوجوان فنکار لبوں پر مسکراہٹ بکھیرے ہم سب کے سامنے بیٹھا رہا۔ اِسی محفل سے اٹھتے وقت مجھے ایک نیا دوست حشمت علی ملا۔ گہرے لہجے میں عامیانہ اور فلسفیانہ گفتگو کرنے والے حشمت علی کے بارے میں صرف اتنا کہوں گا: ''آئی ایم سو اِمپریسڈ''۔

کہر آلودہ سرد موسم میں سرکلر روڈ پر اپنی سائیکلیں کھینچے ہم سارا راستہ سرائیکی وسیب کی خوشحالی اور اس کے باصلاحیت لوگوں کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ شمالی سرکلر روڈ نے مکمل سکوت کی چادر اوڑھ رکھی تھی، کہیں کہیں گلی کی نکر پر پہرہ دیتے پولیس کے جانباز سپاہی الرٹ دکھائی دیئے۔ شہریوں کے ساتھ کندھے سے کندھا ملائے، اپنی جانوں کے نذرانے پیش کرنے والے اور سماج دشمن قوتوں کے ناپاک عزائم کو خاک میں ملانے والے شیر دلیر سپاہیوں کو دل نے سیلوٹ کیا۔ قدرت کی لامحدود چھت پر دھند کی دبیز تہہ میں چھپا چاند کسی پردہ پوش حسینہ کی مانند دکھائی دے رہا تھا، فضاؤں میں دور تک سمیع کی مترنم آواز کی بازگشت سماعتوں میں گونجتی چلی جا رہی تھی۔

''فجر دا سجھ اُبھر داہ سُچیندے شام تھی ویندی۔ خیالاں وِچ اسیکوں ہن بُولیندے شام تھی ویندی ☆ اُنہاں دے بال ساری رات روندن بُکھ توں سمندے نیئں۔ جنہاں دے کیئں دے بالاں کُوں کِھڈیندے شام تھی ویندی ☆ میڈا رازق رعایت کر نمازاں رات دِیاں کر ڈے۔ جو روٹی شام دی پوری کریندے شام تھی ویندی''۔

.....

مُو نجھا نہ تھی اَو کملا

دریا کا گدلا پانی کہیں رکا ہوا تو کہیں دھیرے دھیرے رواں تھا۔ کہیں دریا کی گود خالی تھی تو کہیں پر اس کے ٹھہرے پانی نے اپنے اوپر جھکے درختوں کے عکس کو نگل رکھا تھا۔ آفرین ہے ان درختوں پر جو اس حالت میں بھی اپنی انفرادیت اور اپنا وجود قائم رکھے ہوئے تھے۔ گل زیب بڑی محبت، اپنائیت اور والہانہ پن سے اردگرد کے ماحول پر نظریں دوڑائے انتہائی مگن انداز میں گاڑی ڈرائیو کر رہے تھے۔ سردی اور ہوا کے تھپیڑوں میں سب کچھ سہل سا لگ رہا تھا بلکہ موسم کی خوبصورتی انجوائے منٹ میں ڈھل گئی تھی۔ 2000ء سے 2011ء تک کے درمیانی عرصے میں عرب امارات، سعودیہ، بحرین، ایران اور آسٹریلیا جیسے ممالک کو قریب سے دیکھنے کے بعد میں اپنے مہمان دوست کو بتا رہا تھا کہ ان سب ممالک کے شہروں میں کوئی شہر بھی ایسا نہیں کہ جو میٹھے پانی کے اس قدر قریب ہو اور جس کا اتنا چارمنگ، نیچرل لینڈ اسکیپ ہو جیسا کہ ڈیرہ اسماعیل خان کا ہے۔ اسے ہماری بدقسمتی کہیے کہ اگر نیلی آنکھوں والا منظّم انگریز ان علاقوں کو اپنے دیسی خدمت گاروں کے حوالے نہ کر گیا ہوتا تو آج اس شہر کا حسن و جمال دیکھنے لائق ہوتا۔ ہم پر مسلط دیسی حکمرانوں اور ماضی کے گورے مالکان میں صرف ایک چیز مشترک تھی۔ گورے بھی

ہمارے وسائل پر اسی طرح قابض تھے جیسے اُن کے لائے گئے وفادار غلام جو آج ہمارے وسائل پر سانپ بنے بیٹھے ہیں۔صرف ایک خامی یعنی وسائل پر قبضے کے علاوہ گوروں میں بہت سی اچھائیاں بھی تھیں۔ہم اس وقت اُن کے غلام تھے،وہ تو ہم آج بھی ہیں۔تو کیا پھر وہی دور اچھا نہ تھا کہ جب انگریز ہمارے وسائل پر قابض تھا،ہم اس کے غلام تھے اور وہ ایک اچھا منتظم تھا۔نہ وہ خود کرپٹ تھا اور نہ اس کے ماتحت ادارے کرپٹ تھے۔اگر اُس نے ہم نے دس روپے لوٹے تو دو روپے ہماری بہبود و ترقی پر بھی خرچ کیے۔یقین جانیے کہ ڈیرہ اسماعیل خان کا انفراسٹرکچر زیرو سے اٹھا کر اسے ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کی غرض سے جتنے ترقیاتی کام برٹش دور میں ہوئے اس کی آج تک مثال نہیں ملتی۔انگریز راج میں پہاڑ پور نہر کا جال بچھایا گیا۔دریا کا پختہ پشتہ اور اس کے کنارے پکنک کی غرض سے بنائے گئے کنکریٹ کے چولہے،سنگی بنچ،سنتھے کی باڑیں،پھولوں کی کیاریاں اور درختوں کے تنوں پر سفید چونا لگا کر اس پر اندراج کیا گیا۔کتنی حیرت کی بات ہے کہ اُس وقت درختوں کا کاٹنا اور معصوم پرندوں کا شکار کرنا سنگین جرم سمجھا جاتا تھا۔ سرکلر روڈ کے گرد پھولوں کی کیاریاں،درخت،کنوئیں،باغات،پلے گراؤنڈز، سکول، لائبریریاں،ٹینس کورٹس،سرکاری ادارے (ڈیرہ سے پیزو تک بچھی ریلوے لائن،پولیس،ڈاک کا نظام،پبلک ٹرانسپورٹ،پل،سرنگیں،سڑکیں،فوجی چھاؤنیاں،ٹیلی فون،تار گھر،برقی گھر، عدالتیں،سکول،کالجز) سب سے بڑھ کر گورے صاحب کی آرگنائزڈ مینجمنٹ،آگے کی سوچ،دور اندیشی پر مبنی لکھے گزیٹئرز اور دوسری کتب کہ جس میں انگریز افسران نے قبائلی نفسیات کا جائزہ لینے کے بعد کیا خوب لکھا تھا کہ ڈیرہ شہر کی پرامن ملٹی کلچرل سوسائٹی کے زیرسایہ بسنے والی شہری آبادی میں اتحاد،امن اور بھائی چارے کی فضا کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس شہر کو ٹربل میکرز (قبائلیوں) سے دور رکھا جائے۔یاد رہے کہ جب انگریز اس خطے کو چھوڑ کر جا رہا تھا تو ڈیرہ اسماعیل خان ہر لحاظ سے نہ صرف پشاور کا ہم پلہ تھا بلکہ بنوں،مردان اور صوابی جیسے علاقے اس کی قدامت کے آگے ہیچ تھے۔

کچے کی جانب آسمان تھوڑا سا قرمزی ہونے لگا تھا،سنہری شام کے آثار پھیلتے جا رہے تھے۔ دریا کا موجودہ کنارہ سیلابی ریلے کے سامنے ہار مان کر گرنے والے اس سوکھے درخت کے کھوکھلے تنے کی

مانند تھا کہ جس میں نہ تازگی رہی تھی اور نہ شادابی۔سعید بھائی نے کھو کھلے درخت سے تھوڑا سا آگے وہ مقام بھی دکھایا کہ جہاں پر اگست 2010 میں سندھو کی طوفانی لہروں نے بند کو توڑنے کی حتی المقدور کوشش کی تھی مگر اللہ پاک کے کرم سے شہر ڈیرہ ایک بہت بڑی تباہی سے بچ گیا تھا۔پشتے کے حوالے سے دھرتی ماں کے عظیم رکھوالے ''سیٹھ بگائی'' کی خدمات کا ذکر بھی چلا کہ جب اس نے اپنے خوابوں کو تعبیر دینے کی کوشش کی تو کیسے اس کے اپنے پاؤں لہولہان ہوئے اور دامن میں مفلسی کی دھول، خسارے کی راکھ اور ہجر کے آنسوؤں کے سوا کچھ باقی نہ بچا۔

سندھ کنارے بنی کیہلوں کی جھونپڑیوں کے سامنے سے گزر کر گوبر کی کھاد اور مردہ پتوں کی باس میں رچے علاقے سے ہوتے ہوئے ہم دریا کے بند سے اتر کر کچی پائند خان کے بازار میں آن پہنچے۔سعید بھائی نے گل زیب کو قریبی دکان کے سامنے گاڑی روکنے کو کہا اور خود شیشہ نیچا کر کے پھٹے پر بیٹھے ایک دکاندار سے کارلو پراپرٹی ڈیلر کا پتہ پوچھا۔دکاندار نے سامنے والی دکان کا اشارہ کیا۔مجھے تھوڑا سا تجسس ہوا تو قریب بیٹھے طاہر شیرازی سے پوچھا: تساں دا پراپرٹی ڈیلر نال کیرا کم ھ؟۔یار امجد نواز کارلو نال ملنا ھ ۔وسیب کے مقبول و معروف فوک سنگر امجد نواز کارلو سے ملنا، واقعی ایک امیزنگ سرپرائز تھا۔گاڑی سے باہر نکلنے سے پہلے ہی امجد کارلو ہم تک پہنچ چکے تھے۔وہ بڑی محبت اور خلوص سے ہم سب کو اپنی دکان کے اندر لے گئے اور بیٹھتے ہی چائے اور سموسوں کا آرڈر دے دیا۔امجد فیس بک اوپن کیے اپنے مداحوں کے ساتھ غالباً لائیو چیٹ کر رہے تھے جسے انہوں نے وقتی طور پر موقوف کیا اور ساری توجہ ہمارے گروپ کی طرف مبذول کر دی۔باتوں باتوں میں میری فرمائش پر انہوں نے اپنا تعارفی فلیور دیا۔وہ کچی پائند خان میں پیدا ہوئے اور پرائمری کا امتحان کچی پائند خان سکول سے پاس کیا۔ان کی آواز چونکہ بچپن سے سریلی تھی اسی لیے سکول کے استاد نصیر سرمد صاحب نے انہیں نعتیں پڑھنے کی طرف راغب کیا۔وہ بزمِ ادب کے پیریڈ میں نعتیں پڑھنے لگے۔نصیر سرمد کے طفیل ہی انہیں ریڈیو پاکستان ڈیرہ میں فیاض بلوچ کے بچوں کے پروگرام میں پہلی بار متعارف کروایا گیا، وہاں پر انہوں نے میٹھے سروں میں نعت پڑھی ''جب مسجد نبوی کے مینار نظر آئے''۔امجد کی سریلی آواز آن ائیر آتے ہی وہ اپنے اردگرد مقبول ہونے لگے۔سرائیکی گانوں

کی طرف اپنے سفر کا ذکر کرتے ہوئے ان کا کہنا تھا کہ ان کا بچپن وسیب کے مشہور فوک سنگر عطاء اللہ نیازی کو سنتے گزرا۔ان کے چچا عطاء اللہ کے گانے شوق سے سنا کرتے تھے، چنانچہ میرا رجحان بھی سرائیکی موسیقی کی جانب ہوا۔اس موقع پر چچانے بھی ہمت بندھائی اور میں ان کے سرہانے پڑے تکیہ کو باجا بنا کر گانے لگا۔''آ وسیاں ساونڑیاں، کرگئی کرگئی جادو کرگئی، اُٹھاں آلے ٹرجان گے''۔اس طرح شوق رفتہ رفتہ پروان چڑھنے لگا اور کالج لائف تک پہنچتے ہی میں باقاعدگی سے گانا گانے لگا۔جب پی ٹی سی ایل میں کنٹریکٹ بیس پر جاب ملی تو ساری تنخواہ اکھٹی کر کے اپنا پہلا البم چرسی ڈھولا نکالا،جس کا ایک گانا آ چرسی ڈھولا تیکوں چرس پلاواں کافی مشہور ہوا۔پہلا البم مارکیٹ میں آتے ہی دھڑا دھڑ میوزک کے پروگرامز ملنے لگے۔اسی دوران تھل پروڈکشن میر پور خاص والوں نے میرا البم ''مونجھا نہ تھی او کملا'' نکالا۔اس سپر ہٹ البم نے سرائیکی بیلٹ میں دھوم مچادی۔

گڈلکنگ پرسنلٹی کے حامل ینگ امجد نواز کارلو سرائیکی وسیب کے اس لحاظ سے منفرد سنگر ہیں کہ انہوں نے زیادہ تر گیت اپنے ہی لکھے ہوئے گائے، بیشتر کی دھنیں بھی خود تخلیق کیں۔امجد کارلو کی باتیں سن کر میں سوچنے لگا کہ موجودہ گھٹن زدہ ماحول میں جب خوشیوں کا گلا گھونٹا جا چکا ہے،انسانی حسیات اور احساسات کی ترجمانی کرنے والی بے ضرر موسیقی دم توڑ چکی ہے،سنگیت ایک نوحہ بن کر سامنے آیا ہے، انگلیاں ہارمونیم کے میٹھے سروں کو، شہنائی استاد اللہ نواز کے مٹھاس بھرے لبوں کو اور سارنگی ڈھولک کی تھاپ کو ترس رہی ہے۔بانسری کے سچے سر کسی پاتال میں گم ہو چکے ہیں تو ایسے حالات میں امجد نواز کارلو جیسے سنگیت کار جن حالات میں جی رہے ہوں گے،ان کی نہ صرف حوصلہ افزائی کرنی چاہیے بلکہ ان کی ہمت و جرأت کو سلام کرنا چاہیے۔آخر میں ہم سب کی فرمائش پر امجد نے اپنے نئے گانے کی چند لائنیں سنائیں۔''اللہ تیڈا بھلا کرے'' کے بولوں کے ساتھ اس کے لب دھیرے دھیرے گنگنانے لگے۔اس نے مشاق انگلیوں کی پوروں اور ہتھیلی کی تھاپ سے گیت کی ٹائمنگ کو کچھ ایسے پروفیشنل انداز میں ردھم کے ساتھ ملایا کہ کسی بھی موقع پر ہارمونیم،ڈھولک اور بانسری کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔وہ ساز و سازندوں کے بغیر بہت محویت سے گا رہے تھے،ہم سب بڑی دلچسپی،اشتیاق اور تجسس سے اسے سن رہے تھے۔اللہ

تیڈا بھلا کرے جیسے بولوں کے ساتھ سنگیت کی جل ترنگ چھوٹے سے احاطے میں گونجنے لگی۔گانے کے میٹھے بول اور وائلن کے سروں جیسی میٹھے درد میں ڈوبی آواز جب گلے سے نکلتی تو ایسے لگتا جیسے کوئی خالی گلاس میز پر دھرے کانچ کے کسی نفیس برتن سے ٹکرا کر فضا میں جلترنگ چھوڑ گیا ہو۔امجد نواز کارلو کے ساتھ گل زیب بھی گنگنانے لگے اور چھوٹا سا کمرہ مترنم آوازوں کی بازگشت کی لپیٹ میں آ گیا۔ایسی پرمست فضا میں ہلکی پھلکی مسکراہٹ کے ساتھ چاروں طرف خوشیوں کے فوارے پھوٹ پڑے۔غزل کب ختم ہوئی اس کا احساس کسی کو نہیں ہو پایا تھا۔امجد نواز کارلو نے ہم سب کو ٹرانس میں لا کر بےخود کرتے ہوئے واقعی میلہ لوٹ لیا تھا۔ہر ایک کی زبان پر والہانہ داد اور ستائش تھی۔دل کے آسمان پر چھائے مونجھ کے بادل کب کے چھٹ چکے تھے اور شام اپنی تمام تر جلوہ آرائیوں اور رعنائیوں سمیت زمین پر اترتی محسوس ہوئی تھی۔یہ ایک یادگار سوشل ایوننگ کا اختتام تھا۔

....

ھِک بندہ سونہڑے دِل والا

کسی فلسفی کا قول ہے کہ ہر اچھا شاعر ایک بار نہیں کئی بار جنم لیتا ہے اور کسی شاعر کا جنم لینا گویا اس کی ذات کی خود تردیدی کا عمل ہوتا ہے اور خود تنسیخی کا یہ عمل اُسے بار بار پیدا کر کے اذیت ناک مرحلے سے دوچار کرتا ہے۔ اپنی ذات کی نفی کرنے والے ابرار عقیل بھی کچھ ایسے ہی شاعر ہیں۔ رزقِ حلال کیلئے دن بھر کی تگ ودو، گھریلو ذمہ داریاں، بوڑھے باپ کے کمزور پڑتے کاندھوں کی مالش، محلے بھر سے علیک سلیک اور اُن کے دکھ درد میں شرکت، ادبی سرگرمیاں، شعر وشاعری اور سب سے بڑھ کر خالق حقیقی کے رنگ برنگے تخلیق کردہ پرندوں کا عاشق ۔فضا میں پھریریاں مارتی چوں چوں کرتی معصوم چڑیوں ٗخوبصورت لالیوں اور غٹر غوں کرتے ریشمی کبوتروں اور فاختاؤں سے گہرا یارانہ ۔ہم بد بخت ، نا شکرے، دنیا دار کمینے کہ رزق کو کچرے اور تعفن زدہ اَرُوڑی پر پھینک آتے ہیں، ہم سے اچھا وہ شخص کہ جو راستے میں پڑی روٹی کے ٹکڑوں کو چن چن کر اٹھاتا ہے، جمع کرتا جاتا ہے اور پھر دھوپ کی تمازت پیچھے پلٹتے ہی مکر وفریب میں گھرے، منہ پر پلاسٹک کی نقلی مسکراہٹیں سجائے، ملمع چڑھے نفس پرست دنیا داروں سے الگ تھلگ سا ہو کر کوٹلی امام حسین کی راہ لیتا ہے۔ کیا عجب آنکھوں دیکھا واقعہ ہے کہ درختوں کی ٹہنیوں میں اپنے پر سکوڑے، آنکھ کے تل میں اس کی تصویر لیے، خاموشی سے اس کے انتظار میں بیٹھے پیار کے پرندے

جب اُس کی آمد کی خبر پاتے ہیں تو عجب خوشی کا اظہار شروع کر دیا کرتے ہیں۔ پیار کے پرندے تب تک اپنی واپسی کا سفر شروع نہیں کرتے جب تک اُنہیں دیکھ نہ لیں۔ اللہ کی ننھی مخلوق کیلئے کچھ لمحے نکال کر اپنے ہاتھوں سے روٹی کے ٹکڑے بھور بھور کر کھلانے والا، اُن کے سامنے دانہ ڈال کر رزق کو شیئر کر کے نیکیاں کمانے والا خوش بخت، اندر سے کیئرنگ اور اُجلا انسان ابرار عقیل اپنی ذات میں محض ایک انجمن ہی نہیں، کئی انجمنیں سمیٹے ہوئے ہے۔

ابرار سئیں کی شخصیت گوناں گوں صفات کی حامل ہے اور ان کی ذات اپنے اندر کئی تہیں، کئی پرتیں چھپائے ہوئے ہے۔ ہر تہہ کے نیچے ایک نئی شخصیت اور ہر پرت میں سمٹ کر بیٹھا ایک پُر وقار انسان۔ میں جب بھی اُن کے بارے میں سوچنے بیٹھتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں کہ شب و روز کے معینہ اوقات میں ایک اکیلا، تن تنہا شخص اتنا سب کچھ کیسے کر گزرتا ہے؟ سئیں ابرار عقیل کے بارے میں طاہر شیرازی نے کیا خوب کہا ہے۔

سُکھ سیتاں والا ڈِینھ اُبھرے ☆ جیہڑا برکت ٹور گھِن آیا ہے
اَج وَت ہِک بھاگ بھرا ویلا ☆ کُجھ تِتر، مور گھِن آیا ہے
ھِک بندہ سونہڑے دِل والا ☆ جیہڑا بھورے بھور گھِن آیا ہے

پتھر دلوں کو موم کر دینے والی من موہنی دھرتی کا سوہنا سپوت ابرار عقیل ڈیرہ اسماعیل خان کے محلّہ پونگراں والا، گلی غلمی والی کے ایک کچے گھر میں غریب مزدور عبدالرحیم کے ہاں 1960 میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے وقتوں کی مشہور درسگاہ پرائمری سکول نمبر 3 میں ماسٹر شیر زمان جیسی لائق و فائق علمی ہستی کے زیرِ سایہ حاصل کی۔ میٹرک کا امتحان گورنمنٹ اسلامیہ ہائی سکول نمبر 2 سے پاس کیا۔ جب معاشی تنگدستی آڑے آئی تو تعلیمی سلسلے کو منقطع کیا اور کراچی چلے گئے۔ وہاں پر اکاؤنٹ کے شعبے سے وابستہ ہوئے، ابھی کچھ عرصہ ہی گزرا تھا کہ دھرتی ماں کی محبت اور پیاروں کی کشش انہیں واپس ڈیرہ کھینچ لائی۔ ڈیرہ میں اپنی مدد آپ کے تحت پرائیویٹ ایف اے کا امتحان پاس کیا، کچھ مدت تک ڈیرہ ڈیویلپمنٹ اتھارٹی میں بطور اکاؤنٹنٹ وقت گزارا، جلد ہی پبلک ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ میں کنٹریکٹ پر تعیناتی ہوئی، یوں

زندگی دھیرے دھیرے ٹریک پر آنے لگی۔اُنہی دنوں پبلک ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ میں ڈیرہ ڈویژن کیلئے چودہ پکی آسامیوں کا اعلان ہوا مگر بدقسمتی سے اُس وقت کے پشتون ہیلتھ منسٹر منیر شاہ نے ڈیرہ ڈویژن کی خالی آسامیوں پر ڈیرے وال ملازمین کو پکا کرنے کی بجائے ڈیرہ والوں کی حق تلفی سمیت اخلاقیات اور میرٹ کی دھجیاں اڑاتے ہوئے ساری آسامیوں پر من پسند پشتون بھرتی کروائے۔ بدقسمت، یتیم اور لاوارث شہر ڈیرہ کے سارے سرکاری ادارے، چاہے محکمہ تعلیم ہو، تھانہ، کچہری، عدالتیں ہوں یا پھر صحتِ عامہ کے مراکز، ہمارا سب کچھ آزادی کے بعد سے پشتون مافیا کے کنٹرول میں چلا آ رہا ہے اور پچھلی چھ دہائیوں سے سرائیکی دھرتی کے باشندوں کے حقوق کو لتاڑ کر اور اُن کی شناخت کو مٹانے کی حتی الامکان کوششیں کی گئی ہیں، تاحال یہ سلسلہ جاری ہے، مگر ناانصافی کے اس طرزِ عمل کے باوجود سخت حیرانگی ہوتی ہے۔اُن غلام سوچوں کے حامل ڈیرے والوں پر کہ جو اپنے وسائل اپنے ہاتھوں میں لینے کی بجائے غیروں کے زیرِ تسلط رہنے میں خوش ہیں، مگر خوددار طبیعت کے مالک ابرار عقیل اس کیٹگری کے آدمی نہ تھے، انہوں نے بولڈ اسٹیپ لیتے ہوئے پشتون افسر کے غیر منصفانہ فیصلے پر احتجاجاً استعفیٰ دیا اور اللہ کے توکل سے گھر بیٹھ گئے۔، کچھ عرصہ بعد رزق کا در کھلا اور اگست 1990ء میں گومل یونیورسٹی کے الیکٹریکل سیکشن میں جاب آفر ہوئی۔روٹی رزق کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد اُن کی تخلیقی صلاحیتیں ابھر کر سامنے آنے لگیں۔

سئیں ابرار نے جس دور میں شاعری شروع کی اس دور میں ڈیرہ شہر میں کئی ایسے شعراء موجود تھے جو اپنے اسلوب کے لحاظ سے منفرد مقام کے حامل تھے۔سعید اختر سیال، مخمور قلندری، طاہر شیرازی، غلام عباس حیدری، ذین العابدین اور نسیم وغیرہ۔ابرار عقیل نے اپنے ہم عصروں کے ساتھ مل کر بزمِ فکر و فن کے نام سے ادبی تنظیم کی بنیاد رکھی اور اپنے دوستوں کے درمیان میں سے اپنے لیے ایک نئی راہ نکالی۔انہوں نے شاعری کی ہر صنف نظم، سلام، ہائیکو، غزل، منقبت وغیرہ پر طبع آزمائی کی، لیکن ساتھ ساتھ تصوف پر بھی ان کی گہری نظر رہی، اس کی وجہ ان کا معرفت سے گہرا لگاؤ تھا۔محبت اور اخلاص کے اس پیکرِ خاکی نے اردو شاعری بھی خوب کی۔اردو شاعری میں انہوں نے نئے پیکر تراشے اور نئے الفاظ تشکیل دیئے۔اُن کے قلم سے نکلا ہر لفظ جداگانہ وصف اور غیر معمولی سلیقے کا حامل نظر آتا ہے۔

عزم جب ہم نو اہوا میرا ☆ ہاتھ پرچم کشا ہوا میرا
کہہ رہاہے کہانیاں کتنی ☆ ایک آنسو گرا ہوا میرا

بلاشبہ ان کی اردو شاعری میں جمالیاتی سطح پر فکری اپروچ پاورفل دکھائی دیتی ہے لیکن اُنہیں سرائیکی شاعری میں جو کمال حاصل ہے وہ ان کا خاصا ہے۔ وہ ایک حساس سرائیکی شاعر کے روپ میں سامنے آئے ہیں۔نظموں،غزلوں اور قطعات پر مشتمل حال ہی میں ''مچ'' کے نام سے ان کا ایک شعری مجموعہ چھپ کر سامنے آیا ہے۔ انہوں نے اپنے احساسات وجذبات کولفظوں کی صورت ایسی زبان دی ہے کہ جو بااثر بھی ہے اور فنی لحاظ سے پختہ بھی۔ مچ کی شاعری پڑھنے والے ہر انسان کو متاثر کرتی ہیں۔ جلتے مچ پر جذبوں کی آنچ سے لکھی سیئں ابرار کی شاعری کو میں عہدِ جبر کا نوحہ کہوں گا۔

ویہڑے ساڈے ناں دا سُکھ ہے ☆ چار چُدھاروں دُکھ ہی دُکھ ہے
خُندک کانوں کان چا کیتا ☆ سب دا آپنا آپنا مُکھ ہے

وہ ایک باشعور دانشور کی طرح اپنے اردگرد کے حالات وواقعات پر گہری نظر رکھتے ہیں اور ایک حساس انسان کی طرح عصری مسائل پر کڑھتے ہیں، حالات کی ستم ظریفی پر صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں اور یوں ان کے اندر کا غبار شعروں میں ڈھل جاتا ہے۔

شہر اچ دُھوڑ تے دُھوئیں تھی گئے ☆ سب چہرے اَن سوہنیں تھی گئے
کلر کھادی وسوں دے وِچ ☆ ڈاڈھے نانگ وِٹھوئیں تھی گئے

جب ان کے شعور کو عرفان ملتا ہے تو اُن کی سوچ وفکر کا زاویہ، انداز اور احساسات بدل جاتے ہیں۔ اس حوالے سے ذاتی کیفیت اور مشاہدات کو بنیاد بنا کر وہ کیا خوب لکھتے ہیں۔

اَک دا کھیر نہ مٹھڑا تھیوے ☆ جتنا وی کوئی مِٹھا پاوے
یار عقیل اگوہیں رُت اچ ☆ پُھلاں وانگ نہ سجھ کُملاوے

جبر کے موسموں میں جب وہ اپنے شہر کے دِگرگوں حالات پر، انسانوں کی منافقت، منافرت اور جبر واستحصال پر نظر ڈالتے ہیں تو غم آلودہ آنکھوں سے پانی جھرنوں کی طرح بہنے لگتا ہے۔ مچ میں لکھی گئی

اُن کی بلاسٹ نامی نظم واقعی پڑھنے کے قابل ہے۔

یکھ جیئں لُٹ ہے
جندڑی مفتیں کُسکسدی پئی ہے
خلقت ساری ڈُسکدی پئی ہے
یکھ جیئں لُٹ ہے
پنڈے رت اچ پُسے پئے ہن
جیون کولوں رُسے پئے ہن
یکھ جیئں لُٹ ہے
نک تے نین سلامت کوئی
اِیں توں ودھ قیامت کوئی
یکھ جیئں لُٹ ہے
پنڈے دی ہر تار جدا ہے
لوکاں تے حریان خدا ہے!!!

مَچ کا سارا کلام ان کی اپنی زندگی کے کئی رُخ کھول کر ان کے جذباتی، فکری اور احساساتی پہلوؤں کا خوب احاطہ کرتا ہے۔ وہ نہ صرف اپنے اندر کی دنیا سے باخبر رہتے ہیں بلکہ باہر کی دنیا سے بھی منہ نہیں موڑتے بلکہ اپنے گردوپیش کے واقعات سے متاثر ہو کر جو کچھ دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں، ہو بہو بیان کر دیتے ہیں۔ خصوصاً ہمارے اندھے بہرے سماج میں کہ جہاں بیان واظہار کی آزادی نہیں، وہاں وہ اپنے اندر کی گھٹن کو کچھ اس طرح سے نکالتے ہیں۔

رُت اویڑی اے جئیں آئی ہے
ویڑھے وستی چُپ لگ گئی ہے

اس شعر میں ان کے اندر کی اضطرابی کیفیت کیسے کروٹیں لے رہی ہے۔ مشاہدات، تجربات اور

احساسات کی ندرت سے بھری ابرار عقیل کی شاعری عہدِ حاضر کے سارے شاعروں پر بھاری نظر آتی ہے۔ میں جب کبھی ابرار کی شاعری کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں تو میری آنکھوں کے سامنے کوٹلی امام حسین کے تن آور درخت، کسی نہ کسی درخت کے پیچھے ڈوبتا سورج، پھریری مار کر اُڑتے پرندوں کے پروں پر ڈوبتے سورج کی سنہری کرنیں اور کسی خاموش ٹہنی پر اپنے ریشمی پروں کو تہہ کئے بیٹھا محبت کا کوئی نہ کوئی پرندہ دکھائی دیتا ہے۔

.....

آخری صفحہ

جناب غلام عباس سیال کی کتاب ''گلی کملی کے دیس میں''، اَسی اور نوے کے دہائیوں سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ اُن کی نئی کاوش ہے۔ کتاب کا مسودہ پڑھ کر عباس سیال کے طرزِ تحریر، چاشنی اور زورِ بیاں کو داد دیئے بغیر میں رہ نہیں سکتا۔ ان کا طرزِ نگارش بالکل ایک کہانی کے انداز سا ہے، لیکن یہ ابواب وار سچی کہانیاں ہیں جو اُن کے لاشعور میں کہیں دفن تھیں اور شعور میں پک کر کتابی شکل اختیار کر گئی ہیں۔ وہ بالکل انتظار حسین کی طرح ناسٹل جیک ہیں اور اپنے شہر ڈیرہ اسماعیل خان کی یادیں اُنہیں طرزِ تحریر پر اکساتی ہیں۔ یہ کہانیاں پڑھ کر بعض اوقات مجھے اسد محمد خان کے افسانے یاد آتے ہیں جو انہوں نے لکھے ہیں اور ان کی کتابوں میں اور ''کراچی کی کہانی'' میں بعنوان ''طوفان کے مرکز میں'' شامل ہیں۔ یہ کراچی کے صدر بازار اور اردگرد کے علاقے سے متعلق ہیں۔ اسی طرح سوبھوگیان چندانی ''کراچی کی یاداشتیں''، پیر علی محمد راشدی ''وہ دن وہ لوگ'' بھی کراچی کے شہر اور ثقافت سے رچی بسی کہانیاں ہیں، گوشت پوست زندہ انسانوں کی سچی کہانیاں۔

کہانیوں میں عباس سیال نے جو سرائیکی مکالمے ڈائریکٹ فارم میں لکھے ہیں اور جو مٹھاس اس کی ادائیگی سرائیکی میں ہے مکالماتی انداز میں وہ قاری کو اس میٹھی زبان کے چٹخارے کا ذائقہ بھی یاد دلاتی ہیں۔ اس کتاب میں لوگوں کے Pen Pictures بھی ہیں جسے اردو میں خاکے کہتے ہیں یعنی وہ خاکہ نگاری کے فن سے اور اس کو زیبِ قرطاس کرنے سے بھی آشنا ہیں۔ میری دعائیں ہمیشہ اُن کے ساتھ رہیں گی۔

راشد کنڈی

کراچی

کتابیات

1۔سرائیکی وسیب۔ظہور احمد دھریجہ

2۔وِساکھ،سعید اختر سیال

3۔ماسوا،طاہر شیرازی

4۔یہ داغ داغ اُجالا۔سید ارشاد حسین

5۔اپنا ڈیرہ ڈاٹ کام (ویب سائٹ)

6**. The Islamic Architectural Heritage of Pakistan**

Chapter 6 ,Pre-Mughal Funery Memorial Architecture (Seraiki Style)

By Sheikh Khursheed Hassan.

7. **The District of Dera Ismail Khan**

Trans-Indus(1871) By T.W.H. Tolbort.

8. **A year on the Punjab frontier**

in 1848-1868, By Sir Herbert Benjamin Edwardes.

اُلک پبلی کیشنز کی مطبوعات

ادائے جمال	کاشف رحمٰن کاشف	30روپے
وساکھ (ایوارڈیافتہ)	سعید اختر سیال	80روپے
لہریں لیتی پیاس (ایوارڈیافتہ)	شہاب صفدر	120روپے
نمکیات (مزاحیہ)	غفار بابر	120روپے
چاند چنبیلی	غفار بابر	200روپے
ٹھیڑیاں (سرائیکی)	مظہر علی تابش	40روپے
خزاں دی جھنڑک (ایوارڈیافتہ)	مخمور قلندری	40روپے
انحراف (ایوارڈیافتہ)	طاہر شیرازی	100روپے
پھل کنڈے (سرائیکی)	غفار بابر	150روپے
پارس	زیبا محسود	300روپے
پاکستانی معاشرہ	ڈاکٹر شاہد مسعود خٹک	180روپے
خواب لہلہانے لگے	خالد مصطفیٰ	120روپے
ماسوا	طاہر شیرازی	150روپے
تلاطم	بہرام ساحل	80روپے
خوشبو کا سفر (سفرنامہ)	غلام عباس سیال	100روپے
مچ (سرائیکی)	ابرار عقیل	150روپے
تجھ بن ذات ادھوری ہے	سید کامی شاہ	200روپے
تیڈے کم آسوں (سرائیکی)	عصمت کومل	150روپے
جاتراں (ایوارڈیافتہ)	طاہر شیرازی	300روپے
البتہ (ایوارڈیافتہ)	عبداللہ یزدانی	250روپے
The Voices	صادق اللہ خان	600روپے
بیچے تو بک جاؤں	سعید احمد اختر	250روپے
زندگی چہرہ مانگتی ہے	منیر احمد فردوس	200روپے
لُکار (سرائیکی)	محمد ظہیر احمد	250روپے
گلی کملی کے دیس میں	عباس سیال	300روپے
سمٹی سمٹی دھوپ	کاشف رحمٰن کاشف	زیرِ ترتیب